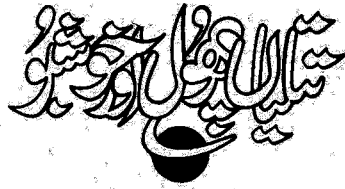


تیلیانِ محوِ الخوتبو

راحت جبینی





راحت جین

خواتین ڈائجسٹ

37 - اردو بازار، کراچی

2010ء
خواتین ڈائجسٹ
پرنٹ لائن

باراول
ناشرین
پریس

سول ایجنٹ
مکتبہ عمران ڈائجسٹ
37 اردو بازار کراچی

انتساب

شوکت منزل کے

اس آنگن کے نام

جس میں پہلے سکھ چین کے بیڑ تے، ہم چھ بہنوں کا بچپن کھیلا
خواب بننے کی عمر آئی تو اپنے اپنے حصے کا باجر اور چوچ بھر پائی لے
سہرہ والدین کی دعاؤں کی چھایا اور ہاتھ میں ان کے فیصلوں کا عصا تھا مے عزت و آبرو کے ساتھ
اپنی اپنی منزلوں کی اور چل دیے۔

راحت جبین

تتلیاں، پھول اور خوشبو

صاف ستھرے، تازہ لپے لپائے وسیع و عریض صحن میں دھوپ تیزی سے پھیلی۔ اگرچہ ابھی صبح کا ہی وقت تھا۔ مگر سورج سر پر آگھڑا ہوا۔

مسرت نما کر نکلی اور لمبے بالوں کو تولیے میں لپیٹے کمرے میں گھس گئی۔ ساتھ والے کمرے کا دروازہ کھلا اور جنت بی بی باہر نکلیں۔ دلیپتی، دھان پان سا وجود، صاف رنگت، ہر حرکت میں تیزی و پھرتیلا پن نمایاں تھا۔ انہوں نے دھوپ میں بڑی چارپائی گھسیٹ کر دیوار کے ساتھ کی۔ اس پر پرانی دھلی ہوئی چادر بچھائی، پھر کمرے کی طرف منہ کر کے آواز دی۔

”ستی اسی۔ ستی۔ ذرا مجھے۔۔۔ اور رات تو پکڑا دے۔“

انہوں نے کونے میں پڑا ساگ کا گتھڑ کھول کر چارپائی پر پھیلایا۔ بہت آوازیں دینے پر بھی مسرت شس سے منہ ہوئی تو ان کو تاؤ آگیا۔

”لگی ہوگی سولہ سنگھار کرنے۔ ماں تو کہو اس کرتی ہے۔“ وہ غصے سے بڑبڑاتی انھیں اور خود ہی کچن سے مطلوبہ اشیاء لے آئیں۔

”چاند سا مکھڑا۔ اترا ہے دل میں۔۔۔“

گنگنائے ہوئے مسرت نے آخری بار آئینے میں اپنا جائزہ لیا اور باہر نکل آئی۔

”کیا بات ہے اماں۔ آواز دے رہی تھیں۔“

”نہیں میں تو بھونک رہی تھی۔“

”ہیں! وہ ٹھکی۔ اماں! خود کو کوس رہی ہو!“

”جس کی تیرے جیسی اولاد ہو۔ وہ خود ہی کو کوسے گی۔ ایک سکہ وہ بھی کھوٹا۔“ اماں غصے سے ساگ کاٹنے لگیں۔

”کوئی اپنی اکلوتی بیٹی کو ایسے بھی کہتا ہے۔“ وہ سوری۔

”کب سے آوازیں دے رہی ہوں۔ ساگ کاٹنے کی توفیق نہیں۔ کم از کم سامان ہی پکڑا دے۔ پر کہاں۔ ماں تو نوکر لگی ہے۔ ساگ کاٹ کر بھی لائے کائے چڑھائے اور تم جیسی نکمی اولاد کو ٹھسائے بھی۔“ جنت بی بی جلی بھی بیٹھی تھیں۔

”سوری اماں۔“ اس نے عقب سے دونوں بازو جنت بی بی کے گلے میں ڈالے۔

”نفع دوسرے ہر وقت جو ب۔ بن کر لٹ جاتی ہے۔ بے شرم۔“ جنت بی بی نے اس کے بازو پرے کیے۔ ”ماں سے لاڈ کرنے میں کیسی شرم۔ جس دن سے میں بڑی ہوئی ہوں۔ تم نے مجھے کبھی قریب نہیں بیٹھنے دیا۔ کبھی بچپن میں ہی گود میں لیا ہو تو لیا ہو۔“ اسے اپنا دکھ یاد آیا۔

”اب گود میں لے کر بیٹھ جاؤں گھوڑی کو۔“ جنت بی بی پھاڑ کھانے کو دوڑیں۔ ”تیرے جتنی سارا سارا گھر سنبھال کر بیٹھی ہیں۔ اور تو۔۔۔ تیرے کروت تو سارے گاؤں کو پتا ہیں۔ کریمیں منہ پر مل لیں اور شیشے میں تھوہرا دکھ لیا۔ پتا نہیں۔ ان حرکتوں کے ساتھ کون تیرا ہاتھ مانگنے آئے گا۔ کوئی آجائے، تجھے تو یہ بھی مت نہیں کہ اس سے چائے پانی کا ہی پوچھ لے۔ کل تیری ماسی ڈوڈ گھنٹہ (ڈیڑھ گھنٹہ) بیٹھی رہی۔ آخر میں نے ہی اٹھ کر لسی پانی دیا۔ تو اس مستنڈی دیبا کے پاس بیٹھی نئی کریم منہ پر لگانے کا طریقہ سیکھتی رہی۔“

”تو ماسی کون سا دور سے آئی تھی۔ بیس دو قدم کے فاصلے پر تو گھر ہے۔ صبح شام چکر لگالیتی ہے۔“ اس نے ڈھٹائی سے کہا۔

”دور فٹے منہ! تیرے گھر تو جو بھی آئے گا۔۔۔ بھوکا ہی اٹھے گا۔“

”ہاں تو اپنے گھر سے کھا کر آیا کرے۔ ہم نے کوئی ٹھیکہ لے رکھا ہے۔ اتنی مہنگی چینی پتی۔۔۔ خوا مخواہ روز، روز آئے والوں پر ضائع کریں۔“

”چلی جا یہاں سے۔۔۔ ورنہ اسی ساگ کے ساتھ چیر دوں گی۔“ اماں کے خوف ناک تیوروں نے اسے کھینکے پر مجبور کر دیا۔

”ایک تو اس ساگ نے پچھا نہیں چھوڑنا۔ گر میاں شروع ہو گئیں۔ یہ نہ ختم ہوا۔“

”آخری وار کی کا ہے۔ کیا پکا نا ہے تجھے جو موڑاٹھ رہے ہیں۔ اوئی اماں۔“

جنت بی بی کی جیج اتنی ہولناک تھی کہ مسرت ہول کر پٹی۔ پہلا خیال ہی آیا کہ اماں کا ہاتھ کٹ گیا۔

”کیا ہوا اماں۔ ہاتھ کٹ گیا؟ مجھے ڈانٹنے میں تو نے دھیان ہی نہ دیا۔ اب لاگوئی دوائی لگا دوں۔ کیا ہوا؟“ اس کی زبان کو بریک اماں کی باہر کو ابلی ہوئی آنکھوں نے لگائی۔ اماں کی یہ حالت اسی وقت ہوتی تھی۔ جب مسرت کی شامت آتی ہو۔

”کم بخت! یہ کیا پہنا ہے۔“ جست بلی بی کی نگاہ اس کے سراپے پر تھی۔

”افوہ۔“ مسرت ہنسا کر رہ گئی۔ ”میں سبھی قیامت آگئی۔“

”قیامت کی کچھ لگتی۔ تجھے شرم نہ آئی۔ بے حیا۔ یہ کیا سلوا کر پہن لیا ہے۔ ٹانگیں کاٹ کر رکھ دوں گی۔ شتر مرغ لگ رہی ہے۔“

اماں کا بس نہ چلتا تھا کہ اسے کچا جبا جائیں۔ ابھی چند دن قبل اسے لان کے چار سوٹ لے کر دیے تھے۔ شادوور زن کو بلا کر اس نے اپنی مرضی کے ڈیزائن بتائے۔ اماں نے غور نہ کیا کہ پہلے بھی وہ اپنی مرضی کے کپڑے سلواتی تھی۔ آج صبح ہی شادو کپڑے دے کر سلائی لے گئی۔ مسرت نے ان ہی میں سے اک جو ڈانکال کر پہنا تھا۔ آقداوٹ چوڑی دارپا سجامہ، سرخ مناسب فنگ والی قمیص، اس کا سانچے میں ڈھلا وجود غضب ڈھا رہا تھا۔ آدمی آستینوں میں بھرے بھرے سڈول گورے بازو بے حد نمایاں تھے۔ بالوں کو شیمپو کیے وہ آنگن میں چل پھر کر اپنا جائزہ لینے میں مصروف تھی۔ اور اماں کا بس نہ چلتا تھا کہ ساگ کی جگہ اسی کو کتر کر رکھ دیں۔

”کیوں اماں! اتنے اچھے تو لگ رہے ہیں یہ کپڑے سچ بچتے۔ میں خوبصورت نہیں لگ رہی۔ بالکل شری کڑی۔“ اس نے اپنا سرخ انچل لہرایا۔

اماں اسے نظر بھر کر دیکھ لیتی تو ضرور ماشاء اللہ، چشم دو کہتیں۔ مگر اماں کو اتنی فرصت کہاں۔ ان کا جی چاہتا تھا جو تا تھا۔ یہیں صحن میں اس کی رنج کر مرمت کریں۔ بھلے یہ تماشا ہمسائے ملاحظہ کریں۔ ”مسرت بانو! تو شری کڑی نہیں۔ اس پنڈ کی دھی ہے، جہاں کنواریاں سرخ قمیص پہن کر باپ، بھائی کے سامنے جانے سے بھی گھبراتی ہیں۔“

”کیوں اماں! ہمیں فیشن کرنے کا کوئی حق نہیں۔“ وہ تنک کر بولی۔

”میں بتاتی ہوں، تجھے تیرے حق حقوق۔ کیسی بے غیرت ہو گئی۔ یہ پہن کر باپ کے سامنے جائے گی، گویا بانسری پر غلاف چڑھایا ہو۔ پوری کی پوری ٹانگ دیکھ لو۔ سارا قصور اس شیطان کے ڈبے کا ہے۔ جس دن سے گھر میں یہ ٹی وی آیا۔ تیری ہوا ہی بدلی ہے۔ دیدوں کا پانی مر گیا ہے۔ سارا دن چٹی رہتی تھی۔ کوئی اثر تو ہوتا ہی تھا۔ یہی بے حیائی سکھاتا ہے نا۔“

”اس میں بے حیائی کی کیا بات ہے؟“ وہ تنک کر بولی۔

”آج تجھے میں بتاتی ہوں۔“ اماں نے سچ بچ جوتی اٹھالی۔ تو وہ غصے میں پاؤں بٹختی اندر بھاگ گئی۔ اماں ساگ کترتی بہت دیر تک بیڑ پاتی رہیں۔ سب سے زیادہ غصہ انہیں ٹی وی پر تھا۔ جس نے ان کی بھولی بھالی مسرت بانو کو سرتا بدل کر رکھ دیا تھا۔

”خالہ! یہ آپ ہواؤں سے لڑ رہی ہیں۔“
 انہیں فاطمہ کے آنے کی خبر ہی نہ ہوئی۔ گھور کر اسے دیکھا اور زیر لب بڑبڑائیں۔
 ”لو! گئی ایک اور۔ ان دونوں نے مل کر ہی مسرت کا ستیاناس کیا ہے۔ ورنہ وہ کہاں ایسی تھی۔ ایسی تو
 خیر یہ بھی نہ تھی۔ پر جب سے شہر کے کالج لگئی ہے۔ بدلی بدلی سی لگتی ہے۔“

”خالہ!“ فاطمہ کی سمجھ میں نہ آیا۔ وہ منہ ہی منہ میں کیا بڑبڑا رہی ہیں۔

”میں بولی (ہسری) نہیں ہوں۔“

”آپ کی طبیعت تو ٹھیک ہے؟“

”نامیری طبیعت کو کیا ہوتا ہے؟“ اماں نے تنک کر کہا اور زور، زور سے ساگ چیرنے لگیں۔

”مسرت کہاں ہے؟“ خالہ کا موڈ خراب تھا۔ فاطمہ نے یہاں سے کھسک جانا مناسب سمجھا۔

”اند مر رہی پڑی ہے۔“

(گویا غصہ مسرت کی بلی پر ہے) فاطمہ نے اندازہ لگایا۔ اور اندر کی طرف قدم بڑھا دیے۔

”سن فاطمہ! اس سے کہہ دینا۔ وہ منحوس پاسبانہ اتار کر میرے سامنے آئے ورنہ لنگڑا کروں گی۔“

وہ کچھ نہ سمجھتے ہوئے اندر چلی آئی۔ جہاں مسرت پتنگ پر اوندھی پڑی تھی۔

”کیا ہوا مسرت بلی بی؟“ فاطمہ نے اسے دونوں کندھوں سے ہلایا۔

”اے فاطمہ۔“ وہ تیزی سے اٹھ کر اس سے لپٹ گئی۔ ”تم کب آئیں؟“

”کل شام۔“

”مجھ سے ملنے اب آئی ہو؟“

فاطمہ کو دیکھ کر مسرت کا مزاج خوشگوار ہو گیا۔ وہ اس کی ہیسٹ فرینڈ تھی۔ میٹرک دونوں نے اکٹھے کیا۔

پھر فاطمہ نے کالج میں ایڈمیشن لے لیا تو شہر ہاسٹل چلی گئی۔ جبکہ مسرت کو مزید پڑھنے کی اجازت ہی نہ ملی۔

”خالہ کا مزاج کیوں برہم ہے؟“

”خاوتا؟“

”ہو نہ بری بات۔“ فاطمہ نے اس کے قریب بیٹھتے ہوئے سرزنش کی۔

”یہ۔“ اس نے اپنی ٹانگ سامنے کی۔ ”یہ چوڑی دار پاسبانہ سلوا لیا۔ بس اتنی سی بات پر سو سو باتیں

سنائی ہیں۔“

”ہوں۔ نیا سوٹ۔“

”بھی پہنا تھا۔“ مسرت نے افسردگی سے کہا۔

”خوب صورت ہے اور تم پر بچ بھی رہا ہے۔“ فاطمہ نے ناقدانہ نظروں سے اس کا جائزہ لیا۔ ”لیکن

مسرت۔! یہ تو امی نے مجھے بھی کبھی نہیں پہننے دیا۔“

”لیکن میں تو پہنوں گی۔ ٹھیک ہے۔ جس دن اب گھر پر نہیں ہوں گے اس دن پہن لیا کروں گی۔“

”اور اماں! ان کی کوئی ویلیو ہی نہیں۔“ فاطمہ نے کہا۔
 ”اماں کو تو عادت ہے۔ ہر وقت گوڑے گوڑے غصے میں ڈوبی رہتی ہے۔“ مسرت نے لاپرواہی سے کہا۔
 ”بہت بری بات ہے۔ ان کا احترام تم پر واجب ہے۔“
 ”نصیبِ حق ہے چھوڑو۔ مجھے شہر کی باتیں بتاؤ۔“
 ”واہ! نہ شہرت نہ پانی۔ مہمان داری بھی بھول گئیں۔“ فاطمہ نے سرزنش کی۔
 ”بیٹھو! ابھی لاتی ہوں۔“ وہ جلدی سے کھڑی ہو گئی۔
 ”ابھی نہیں۔ کل آنا پھر سناؤں گی۔“

”یہ کیا بات ہوئی۔؟“ مسرت نے احتجاجاً کہا۔
 ”ابھی گھر میں کام ہے مسرت! ابی اکیلی لگی ہوں گی۔ میں تو صرف تم سے ملنے آئی تھی۔ باتیں ساری کل ہوں گی۔“ وہ نرمی سے سمجھا کر چلی گئی۔
 مسرت نے کپڑے نہیں بدلے، بلکہ ڈھٹائی سے پن کر پھرتی اور اماں کا کلیجہ جلاتی رہی مگر شام کو جب زیر کی نظر پڑی اور اس نے ہا کر کے آدھے گاؤں کے بچے اکٹھے کر لیے۔
 ”اوئے۔ اوئے دیکھ۔ سستی نے کیا پایا۔“
 بچوں نے جو اس کے ساتھ مل کر نعرے بازی کی تو وہ کپڑے بدلنے بھاگی۔



آم کا درخت بے حد گھنا تھا، شدید آندھی میں بھٹکتے بھٹکتے یوں سجدے میں پڑا کہ پانی کے نالے پر پل بن گیا۔ مگر اس شدید جھکاؤ کے باوجود درخت نے اپنی جڑیں نہیں چھوڑیں۔ ہر ابھرا تھا۔ موسم کی مناسبت سے پھل بھی خوب لگتا۔ کچی پکی کیریاں گرتیں۔ تو پانی میں بہت دور تک جاتیں پانی میں کپڑے دھوتی عورتیں، ذکیاں لگاتے پھپھا چھپ کھیلنے بچے یہ کیریاں پکڑتے اور کھاتے ہوئے ایک دوسرے کے ساتھ لڑتے۔

وہ دونوں اسی درخت کے ٹہنے پر بیٹھی تھیں۔ دونوں کے پاؤں پانی میں تھے کھیتوں میں تیز دھوپ لشکتی تھی۔ مگر اس جگہ درخت کی کھٹی شاخوں نے ایک دوسرے کے گلے ملتے ہوئے پرسکون مٹھندی اور نیم تاریک سی گہا بنادی تھی۔
 یہ دونوں کافیورٹ پکنک اسپاٹ تھا۔

فاطمہ جب بھی گاؤں آتی۔ دونوں پکنک یہیں محتاقی تھیں۔ پکنک کے سامان میں فقط نمک مرچ کی پڑیا اور ایک عدد چھری ہوتی باقی سب یہیں سے دستیاب ہو جاتا، اگرچہ سالہ زیریا کل بہ کرم ہوتا۔ بلا کا تیز اور ڈپین زیر فاطمہ کا چھوٹا بھائی تھا۔ ایک کھیت سے خروڑے، دوسرے سے کھیرے۔ کیریاں تو ذاتی ملکیت تھیں ہی۔ اگرچہ وہ کچھ زیادہ قابل اعتبار رازدان نہ تھا کہ ذرا غصے میں ہوتا تو چھوٹی سے چھوٹی بات گھروالوں کے گوش گزار کر دیتا، مگر اس کے ہنا گزرا ہی نہ تھا۔

”ٹو آگیا۔“ وہ دونوں بازوؤں میں تین خربوزے سنبھالے بگٹ بھاگ چلا آ رہا تھا۔ اس کے پیچھے بابے لال دین کو لاکھی سنبھالے اور اوئے۔ اوئے کی آوازیں نکالتے سن کر مسرت ماتھے پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔

”زوبی! تو نے کبھی کوئی کام ڈھنگ کا نہ کیا۔ تین خربوزے توڑنے میں بابے کو ساتھ لگا لایا۔ اب وہ گوڈے۔ گوڈے بے عزتی کرے گا۔“

”خواتواہ کرے گا۔ خود توڑنے جاؤ تو پتا چلے خود کو تو بس ٹھونسنا آتا ہے۔“

اس نے تڑپ کر کہا۔ اور خربوزے نالے میں پھینک دیے۔ وہ پانی میں ڈوبے، پھر ابھرے اور گھٹی گھاس میں انک گئے۔

تب ہی بابا لال دین بھی پہنچ گیا۔

پھولی ہوئی سانس، چہرہ سرخ، گھٹی سرمی ڈاڑھی میں انکے پسینے کے قطرے۔

”مسلم باباجی۔“ دونوں نے باجماعت سلام کیا۔ بابا نے لاکھی زور سے زمین پر مار کر جواب دیا۔

”کد رہے ہو شیطان۔“ شیطان اچک کر چڑھا اور درخت کی چوٹی پر جا پھنچا۔

”باباجی! وہ تو صرف ہمارے کئے پر۔“ قاطمہ نے کچھ کنا چاہا۔

”ٹھیک ہے تیری۔ ٹھیک ہے۔“ بابا نے جھک کر ٹھنڈے پانی کا چلو بھرا اور چھپاک سے منہ پر مار لیا۔

پھر سیدھا ہوا۔

”پر یہ آج کی بات تھوڑی ہے۔ کھانے کو بھلے توڑے۔ پر یہ تو توڑ توڑ کر ڈھیر لگا کر وہیں چھوڑ جاتا ہے۔“

آدھا کھیت اس باندہ نے ویران کر دیا ہے۔

”باندہ کس کو کہا ہے۔“ وہ درخت پر تڑپ اٹھا۔

”جو درخت پر چڑھا ہے نیچے آؤ رزوا حساب دے۔ جہانہ پڑ گیا ہے۔ اک اک پائی تیرے باپ سے

وصولوں گا۔“ بابا نے چہواٹھا کر اسے ڈھونڈنے کی کوشش کی۔

”بابا! اتنے روپے کیا کرنے ہیں۔ قبر میں تمہارے پاؤں ہیں۔“

چھ سالہ زبیر کے منہ سے یہ جملہ سن کر قاطمہ کا منہ کھل گیا۔

”ہاں۔ زردے کی بوکیں چڑھاؤں گا۔“

”زبیر۔“ قاطمہ نے قنبیہی انداز میں پکارا۔

”جی بابا۔ تمہارے قل شان وار کراؤں گا۔“

”زبیر! میں تمہیں مار بیٹھوں گی۔“ قاطمہ نے دھمکی دی مگر اس کی سنتا کون؟ گاؤں میں بچوں اور

بوڑھوں کی نوک جھوک عام سی روئین تھی۔ بلکہ اس سے حظ اٹھایا جاتا۔ بابا لال دین بھی چند منٹ کی

جملے بازی کے بعد دھمکیاں دیتا چلا گیا۔ مسرت نے خربوزہ اٹھا کر کاٹنا شروع کر دیا۔

زبیر اپنا حصہ لے کر دوبارہ اوپر غائب ہو گیا۔

”تم میرے لیے رسالے نہیں لائیں؟“ مسرت نے پوچھا۔

”لڑائی ہوں۔۔۔ لیکن یاد ہے پچھلی دفعہ خالہ نے میری کیسی پذیرائی کی تھی۔“
 ”میں شام کو اگر خود ہی لے جاؤں گی۔“

”تم نے سوٹ کا کیا کیا۔“ قاطمہ نے پوچھا۔
 ”کرنا کیا تھا منبھال کر رکھ لیا ہے۔“ وہ افسردگی سے گویا ہوئی۔
 ”دوپٹے کے ساتھ بیچ کر کے شلوار کا کپڑا لے لینا۔“ قاطمہ نے مشورہ دیا۔
 ”اگنہ لگا دوں اس سوٹ کو۔“ اس کا دل ہی ٹوٹ گیا تھا۔

”قاطمہ۔۔۔ اس نے تھوڑی دیر کے بعد پکارا۔“ شہر ویسے ہی ہوتے ہیں جیسے ڈراموں اور رسالوں میں۔۔۔“

”کم و بیش۔۔۔“ قاطمہ نے جھک کر دوسرا خروڑہ اٹھالیا۔

”حق ہا۔۔۔ ہماری بھی کوئی زندگی ہے۔“

”کیوں ہماری زندگی کو کیا ہوا؟“ قاطمہ نے اس کے ہاتھ سے چھری ملی۔

”شرکی لڑکیوں کی کتنی موج ہے۔ اپنی پسند سے رہتی ہیں۔ پسند کا پستی پسند کا کھاتی ہیں ہمارے ہاں کیا سہا پندیاں ہی پابندیاں۔۔۔“

”خیر اب ایسی بھی کوئی بات نہیں۔ ہر جگہ کی اپنی ویلیوز ہوتی ہیں۔ اب شرکی لڑکیاں ہماری طرح ٹھنڈے پانی میں یاؤں لٹکا کر کھیتوں سے خروڑے چرا کر تو نہیں کھا سکتیں۔“ قاطمہ ہر چیز کا مثبت پہلو دیکھنے کی عادی تھی۔ شاید اس لیے کہ اسے ساری معقول اور فطری آزادیاں حاصل تھیں۔

”یو ایس بس، سمن کپڑے پہن کر باپ کے سامنے مت جاؤ۔ چوڑی داپا سجامہ پہننا جرم ہے۔ کنواری لڑکی چوڑیاں پہن لے تو قیامت ٹی وی دیکھو تو فتوے جاری میں تو گوڈے گوڈے آگیاں گئی ہوں۔“
 مسرت اپنے دکھڑے رونے کے ساتھ ساتھ آدھا خروڑہ کھا گئی۔

”رہنا تو ادھر ہی ہے بی بی۔“

”خاک۔“

”مطلب۔“ اس کے پاؤں سے کیری آ نکرائی۔

”تم گاؤں میں شادی کروالو گی؟“ مسرت نے اچانک ہی سوال کیا تھا۔

”اس۔۔۔ شادی کہاں سے آگئی؟“ اس نے کیری واپس چھوڑ دی۔ اور سیدھی ہو کر حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”بیٹاؤ نا۔۔۔“

”مجھے کیا معلوم اللہ تعالیٰ نے میرا نصیب کہاں لکھا ہے۔ گاؤں میں ہوا تو گاؤں میں کروالیں گے۔“ اس نے اطمینان سے جواب دیا۔

”میں نے نہیں کروائی۔ میں تو شادی شہر میں ہی کرواؤں گی گاؤں کے کھینٹوں سے جان چھوٹے گی۔“

”ایں۔ تو تمہارے لیے شہر سے رشتہ کہاں سے آئے گا؟“ قاطمہ حیران ہوئی۔
 ”جہاں سے مرضی آئے پر شادی میں نے شہر میں ہی کو دانی ہے۔“ وہ مصمم ارادہ سے بولی۔
 ”وہ تو ٹھیک ہے پر تمہیں کیا لگتا ہے۔ شہر جا کر تمہیں خربوزے کھانے کو نہیں ملیں گے۔“ قاطمہ نے
 بل کر کہا کہ وہ سارا خربوزہ اکیلے ہی کھا گئی تھی۔
 ”بابالال دین کے کھیت کے تو نہیں ہوں گے۔“ مسرت ڈھٹائی سے بولی۔
 ”چھا اگر۔۔۔“

”دھڑام سے کوئی چیز پانی میں کودی پانی یوں اچھلا کہ وہ دونوں شرابور ہو گئیں۔ مسرت کے ہاتھ سے
 خربوزہ چھوٹا قاطمہ کی چیخ نکلی۔
 پانی میں پڑا نہیر، کابکا ادھر ادھر دیکھ رہا تھا۔ وہ شاید درخت پر ہی سو گیا تھا۔



وہ بڑے انہماک سے ڈرامہ دیکھنے میں مصروف تھی۔
 ڈرامے کی ہیروئن دونوں کلائیوں میں بھر بھر سوٹ کے ہم رنگ چوڑیاں پہنتی۔ مسرت کلس کر رہ
 جاتی۔

”حق۔۔۔ ہا۔۔۔ کیا مونج ہے شہر کی کڑیوں کی۔“
 ”مسرت۔۔۔ مسرت بانو۔۔۔“ اماں کی کڑک دار آواز بھی سنائی نہ دی۔
 رات کوئی وی بیٹھک میں ہوتا بابا اور دادا کی محفل دیر تک چلتی۔ مسرت ڈرامہ صبح کو نہ کھا کرتی۔ جب
 وہ ری ٹیلی کاسٹ ہوتا۔ جتنی دیر وہ ڈرامہ دیکھتی اماں کو رہ کر کوئی نہ کوئی کام یاد آتا رہتا وہ بھی ایک
 ڈھیٹ تھی۔ مجال ہے کہ ڈرامہ ختم ہونے سے قبل وہاں سے اٹھ جائے۔ جس پر اماں کا پارہ اور چڑھتا۔
 ”وہ صبح اس بھینس کو کھاتا مرغیاں کھول اب بھوک پیاسی دھوپ میں مری پڑی ہیں۔ اگر میں نہ دیکھتی
 تو۔۔۔ میں کہتی ہوں۔ اس ٹی وی کو اپنے ساتھ قبر میں رکھوالے۔ وہاں گزارہ کیسے ہو گا۔ ساں جتنی مرضی
 بکو اس کرتی رہے۔ بیگم صاحبہ نے اٹھ کر باہر نہیں آنا۔ باپ سے کہنا۔۔۔ جینز میں اور کچھ دے چاہے نہ
 دے۔ نوکرانی اور ٹی وی ضرور دے دے۔“

مسرت بانو تن فن کرتی کمرے سے برآمد ہوئی۔
 ”اماں! کیا ہے سارا کام تو کر چکی۔ تم تو ایک ڈرامہ بھی نہیں دیکھنے دیتیں۔ ایسی ہوتی ہیں مائیں۔!“
 ”نہیں سنی وی سے نکال لے جو ماں تجھے پسند ہے۔“ مرغیوں کا ڈربہ صاف کرتی اماں نے تملکا کر
 جواب دیا۔ گرمی سے بوکھلائی مرغیاں پورے صحن میں پھیلی کٹکتا رہی تھیں۔

”اماں! میرے بھی کچھ خواب، کچھ خواہشیں ہیں۔ میرا بھی دل کرتا ہے کہ میں اپنی مرضی سے۔“
 نجانے کون سے ڈرامے کے ڈانیا لگ تھے جو وہ بولنے جاری تھی۔ اماں کو تو آگ سی لگ گئی۔ وہ تورا
 کر پٹیش، ٹھٹکیں، پھران کے منہ سے چیخ تما آواز نکلی۔

”اللہ کی مارتجھ پر منحوس یہ چڑیلوں کی طرح بال کیوں کھولے ہیں۔“
 ”توبہ اماں! تم تو ہلا دیتی ہو۔ بال ہی کھولے ہیں۔ کوئی تمہاری بھوری بھینس تو نہیں کھول دی۔“
 ”اوائے اوائے دیکھو باجی مسرت نے چڑیلوں کی طرح بال کھولے ہیں۔“
 زبیر جو اس وقت ڈرامہ دیکھنے آیا تھا۔ اماں کا جملہ سن چکا تھا۔
 ”تھہر جا تو۔ تیرے گوڈے گئے ابھی تو ڈتی ہوں۔“ مسرت اسی پر الٹ پڑی۔
 وہ بھاگ کر دروازے میں جا رکا۔

”ہیروئن بنتی ہے اپنے آپ میں۔ ستاؤں اماں کو۔ تم اور باجی فاطمہ کیا باتیں کرتی ہو؟“
 مسرت نے پاؤں سے جوتی اتار کر اسے کھینچ ماری۔ وہ دروازے سے نکل کر نیچے گر گئی کہ وہ تو دروازہ عبور کر ہی چکا تھا۔ وہ پلٹی تو اماں ابھی تک غیظ و غضب کے عالم میں اسے گھور رہی تھیں۔
 مسرت نے شرافت سے اپنے بال سمیٹے، دل ہی دل میں آہ بھری۔
 ”ہائے شہریاں کنیاں۔“



دھلے دھلائے چمھاتے برتنوں پر اس نے باریک جالی ڈالی گھڑوں میں تازہ پانی بھرا۔ آٹا گوندھ کر رکھا کہ دس بجے کے قریب تندور پر روٹی ڈالنی تھی۔ سب کاموں سے مطمئن ہو کر اس نے نما کر فیوزی سوٹ پہنا جس کی آستینیں بھی پوری تھیں اور شلوار بھی مناسب اماں کے آنے تک وہ خوب اپنا جائزہ لے کر بالوں میں جی بھر کر کنگھی کر چکی تھی۔

باہر جنت بی بی کی آواز آئی تو وہ تیزی سے باہر نکلی۔ وہ تندور کے پاس بائیں رکھ رہی تھیں۔
 ”اماں! میں روٹی لگاؤں؟“ مسرت نے شرافت سے پوچھا۔

”میں لگاتی ہوں۔ تو بائیں پکڑا۔“ انہوں نے کہا تو مسرت نے شکر کیا کہ تندور پر روٹی لگانے سے اس کی جان جاتی تھی۔ جنت بی بی تندور گرم کرنے لگیں۔ وہ پاس کھڑی انہیں لکڑیاں تھما رہی تھی جب دروازے سے کسی کی آواز آئی۔
 ”مساجد علی!“

”کون ہے؟“ جنت بی بی نے وہیں سے آواز لگائی۔

”اماں! چاچا بشیر ہے۔“ مسرت نے آہستگی سے بتایا۔

”یہ لہوڑا کدھر سے آگیا۔“ جنت بی بی بد بدائیں۔ بشیر مساجد علی کا چاچا تھا۔ انتہائی لہجہ انسان۔ جس جگہ ڈیرا ڈال لیتا، وہاں سے ہلنے کا نام نہیں لیتا تھا۔ اس کے اپنے ہو بیٹے اس کی اس عادت سے نالاں تھے کہ اس طرح ان کی خدمت گزاری پر حرف آتا تھا کہ شاید وہ لوگ خیال نہیں رکھتے تھے اس لیے گھر سے بھاگ آتا ہے حالانکہ اسے صرف مہمان نوازی کا چسکا تھا۔

”ننگ آچا چا۔“ جنت بی بی کے انداز میں بے زاری تھی۔ چاچا لاٹھی ٹیکتا۔ تمہ سنھالتا اندر چلا آیا۔
”کی حال اے کئیے؟“

”شکر ہے چاچا۔ ساجد علی تو گھر پر نہیں ہے۔“ ماں اسے رخاٹے کے پکڑوں میں تھیں۔
”چھ ماںیں دوبارہ آجاؤں گا۔“

”نہیں،“ نہیں چاچا! ابا آتے ہی ہوں گے۔“ مسرت نے بھاگ کر چارپائی بچھائی۔ تکیہ نکال کر رکھا۔
”شریت بنا کر لے آئی۔ جنت بی بی جرزبوتی رہیں۔ بڑھا ایک بار بیٹھ گیا تو سمجھو، ہفتے بھر کے لیے یہیں جم گیا۔ ادھر مسرت تھی کہ ماں کے اگلے پچھلے شکوے دور کرنے کے لیے بابا کے آگے پیچھے پھر رہی تھی۔ وہ
شریت بی کر اٹھنے لگا تو پھر سے پکڑ کر بٹھالیا۔

”چاچا! ماں بیسی روٹی لگا رہی ہے۔ کھا کر جانا۔“

”تندور والی بیسی روٹی اور نمائڑ کی چٹنی۔“ بابا کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اب کے اس نے لاٹھی ایک
طرف رکھی اور تمہ سمیٹ کر چارپائی پر چوڑی مار کر بیٹھ گیا۔

”میں ابھی نمائڑ کی چٹنی بنا کر لاتی ہوں۔“ وہ جلدی سے باورچی خانہ میں گھس گئی۔

”اور میں تیری چٹنی بناؤں گی شام ویلے۔“ جنت بی بی نے دانت پیس پیس کر کہا۔ انہیں ساجد علی سے
بھی ڈر لگ رہا تھا۔ جو تمام تر مروت کے باوجود اس بابے کو زیادہ دیر گھر میں برداشت نہ کرتا تھا جس نے
ساری جوانی بد اعتدالیوں میں گزاری اور بڑھاپے میں بھی خوار ہو رہا تھا۔ جس کو بخش لطفے گاؤں کے نوجوان
لڑکے مزے لے لے کر سنتے باہر ماں کلس رہی تھیں۔ اندر وہ بڑی محنت سے نمائڑ اور ہری مرچوں کی
چٹنی بنا رہی تھی پھر پورے روٹو کول کے ساتھ بابے کو کھانا بھی کھلایا گیا۔ ایک دوبارہ سوچا بھی۔
”پتا نہیں ماں! اتنا کیوں گھور رہی ہے۔ شاید مسمان نوازی میں کمی رہ گئی۔“ سو بابے کو چائے بھی بنا کر

پلا دی۔

”تو اللہ بھلا کرے کہ بابے کا لڑکا ڈھونڈتا ہوا آگیا کہ فونگی ہو گئی ہے بابے کو لے کر پورے والا جانا
ہے۔ بابے کے جاتے ہی ماں نے روٹی سینکنے والا چٹنا اٹھالیا۔ وہ پورے صحن میں بریک ڈانس کرتی اپنا
قصور بھی نہ پوچھ سکی۔

□ □ □ □

مغرب سے ذرا پہلے جب نیلے آسمان پر پرندوں کی واپسی کا سفر شروع ہو چکا تھا۔ جنت بی بی اپنے معمول
کے کام سینٹے میں مصروف تھیں۔ جب نہ نبہا تھ میں پلیٹ پکڑے چلی آئیں۔ جو کوشھے کے بنے سفید
رومال سے ڈھکی ہوئی تھی۔

”آؤ۔“ بابا۔“ جنت نے ہاتھ میں پکڑا بالن ایک طرف پھینک دیا۔

”کھیر بنائی تھی۔ میں نے کہا۔ ستی کے لیے لے جاؤں۔ شوق سے کھاتی ہے۔“ نہ نب کے لمبے میں

اکھوتی بھاٹی کے لیے پیار ہی پیار تھا۔ دونوں صحن میں پچھی چارپائی پر بیٹھ گئیں۔ جنت نے ان کے ہاتھ سے پلیٹ ختم کی تھی۔

”ہاں! اس کے نخرے اٹھا اٹھا کر اور لگاؤ۔“ جنت بیٹی کی حرکتوں سے بے زار تھیں۔
 ”جگدی کہاں ہے۔ ایسی تو سعادت مندوھی ہے۔ خواجوا نہ اس کے خلاف بولا کہ ہے کہاں؟“
 ”بالکل مایہ اذرا پوچھو نا ماں سے۔ کیوں ہر وقت میرے پیچھے بڑی رہتی ہے۔ میں جتنا اس کی باتوں پر عمل کرتی ہوں۔ یہ اتنا ہی مجھے ڈانٹتی رہتی ہے۔“ مسرت تیزی سے باہر نکلی۔ اس تیزی میں سلام کرنا بھی بھول گئی۔

”ہاں! ہاں تو۔ تم میری ہر بات پر عمل کرتی ہے۔ ایسی میری کہنے کا رہے ناں۔“ ماں نے چمک کر کہا۔
 ”ماں! انصاف کو۔ اماں کتنی تھی میں مہمان داری نہیں کر سکتی کل جب۔“

”ہاں اور اسے مہمان داری کے لیے ملا وہ بڑا عاید معاش۔ جسے کوئی گھر گھسانا پسند نہ کرے۔ بیٹی روٹی کھلا رہی ہے۔ چائے بنا رہی ہے۔ نمائشوں کی چٹنی گھوٹ رہی ہے۔ کبھی پاپ کے لیے تو نہ گھوٹی۔“ جنت نے چمک کر اس کی بات کاٹی اور نقل اتار کر قصہ سنایا۔ مسرت روپا سی ہو گئی۔ جب کہ نہ منب ہنس نہ رہنے دے۔ جنت! بڑی مصومہ رہی ہے۔“

”تیری ہی سر پر تھائی ہوئی ہے۔ کل کو اگلے گھر جائے گی تو۔“ وہ کچھ کہتے کہتے رک گئیں۔
 ”تی لے تیرے لیے کھیر لائی ہوں۔ چل اندر جا کے کھا لے۔“ نہ منب نے اسے ٹالا۔ وہ پلیٹ پکڑ کر اندر چلی گئی۔ تب نہ منب نے سنجیدگی سے کہا۔

”ہر کسی کے سامنے بیٹی کی بد خوئی نہ کیا کہ۔ لوگ کہتے ہیں جب ماں کہہ رہی ہے تو بیٹی میں یہ سارے عیب ہوں گے۔ لوگ تو اپنی پھوڑ دھکی کو بھی سجاک (سیلقہ شعار) بنا کر بتاتے ہیں کہ رشتے اچھے آئیں اور تو جہاں بیٹھی ہو وہیں شروع ہو جاتی ہے۔“

”اسی کے لیے پریشان ہوتی ہوں۔ گھر داری کا ذرا شوق نہیں۔ بس فیشن اور ٹی وی سار ابا کا ڈاس ڈبے کا ہے۔ اسی نے متا ر دی ہے۔“ وہ فکر مندی سے گویا ہوئیں۔

”سارے کام جانتی ہے۔ سر پر پڑے گی تو ذمہ داری بھی آجائے گی۔ مت فکر کر۔“ نہ منب نے لا پرواہی سے کہا۔

”تو نے بھی بیٹیاں بیاباں ہیں آپا! کبھی کبھی سر پر بڑی ماڑی پڑتی ہے۔ اس کے نصیب سے ڈرتی ہوں۔ پتا نہیں کیسے لوگوں کے ساتھ نصیباً جڑے۔ اگلے تو اچھے اچھوں کو پاگل بنا دیتے ہیں۔ فریدہ کا حال نہیں دیکھا تیری کیسی عقلوں والی دھمی تھی۔“

جنت کے آہ بھر کر کہنے سے نہ منب کے چہرے پر یاس کے سائے بکھر گئے۔ ان کی سب سے بڑی بیٹی سرال میں کیسے تنگی کے دن کاٹ رہی تھی۔

”اللہ وارث ہے۔“ انہوں نے سر جھٹک کر خود کو تلخ سوچوں سے آزاد کیا۔

”اسی لیے تو دعا کرتی ہوں اللہ میری بیٹی کے نصیب کہیں اچھے لوگوں میں کھول دے۔“

یہ کہتے ہوئے جنت نے چور نظروں سے بڑی بہن کو دیکھا۔ خیالوں میں اپنا بھانجا شفیق آگیا۔ کیسی عجیب بات تھی۔ اس ماں جانی سے دل کی ساری باتیں کہہ لیتی تھیں۔ یہ ایک خواہش بیان کرتے ہوئے زبان پر تالے پڑ جاتے تھے کیسے اپنے منہ سے کہہ دیتیں کہ وہ اپنی بیٹی دینا چاہتی ہیں۔ نہ نہ بھی چپ سی ہو گئیں۔

”اللہ بھلا کرے گا۔ اب چلتی ہوں۔ ابھی روٹی بھی ڈالنی ہے۔“

”کب تک ہڈیاں گھسائے گی۔ اب نوں لے آئے۔“ جنت نے ہلکے پھلکے لہجے میں اک سر سری سی کوشش کی۔

”جب نوں آئے گی۔ تب دیکھا جائے گا۔“ وہ ایک بار پھر ٹال گئیں۔

جنت ہلکی سی سانس بھر کر رہ گئیں۔



انج میلہ دیکھنی آئیاں کڑیاں لور دیاں۔

وہ ہولے ہولے گنگتاتے ہوئے اباجی کے کپڑے دھو رہی تھی۔ یہ ساجد علی کے کام والے کپڑے تھے جو وہ کھیتوں میں کام کرتے ہوئے پہنتے تھے۔ اس لیے خوب ہی میلے تھے۔ وہ برش سے رگڑ رگڑ کر کف کالر اور پائینچے دھو رہی تھی۔ ساتھ ساتھ لبوں پر نت نئے گہٹ چھل رہے تھے۔ جنت کئی بار اسے گھور چکی تھیں۔ مگر ٹوکاپوں نہیں کہ وہ گانوں کے ساتھ ساتھ کام میں مگن تھی۔ تب ہی باہر سے کسی نے اونچی آواز میں پکارا۔

”خالہ!“

بسم اللہ۔ بسم اللہ۔ میرا بھانجا آیا۔ لنگ آپتہ۔ ”جنت تڑپ اٹھیں۔ وہ اندر آیا تو مسرت نے لا پرواہی سے اوڑھا دوپٹہ اچھی طرح پھیلا لیا۔ ورنہ جنت نے اس کے ٹوٹے کر دینے تھے۔ شفیق اندر آکر خالہ سے ملنے لگا۔ سانولی رنگت، درمیانی قامت، بڑی اور بے حد روشن آنکھیں مہلکتے سے نئے بال مٹائن کا کریم کلر کا کلف لگا کر تاشلوار، ہاتھ میں سیاہ گلاسز اور بایئیک کی چابی۔

”آج خالہ کی یاد کیسے آگئی؟ مسرت ایسا گ کر چارپائی بچھا۔ لمبی ٹھنڈی کہ تیرا بھائی نصیبوں کے ساتھ خالہ کے گھر کا چکر لگاتا ہے۔“

”خالہ! جلدی ہے۔ تروڑ لے کر سا ہوال پہنچنا ہے۔ بس کھڑے کھڑے حال پوچھنے چلا آیا۔“

اس نے اک سر سری نگاہ اٹھتی ہوئی مسرت پر ڈالی۔ یہ نہ کہہ سکتا تھا کہ اماں نے کل اس سے بات کی تھی۔ تو اس نے الجھ کر جواب دیا۔

”میں نے تو کبھی سنی کے بارے میں ایسا کچھ نہیں سوچا۔“

”نہیں سوچا تو اب سوچ لے۔ باہر کہاں ڈھونڈتی پھریں گی۔ جب گھر میں اتنی خوب صورت لڑکی موجود ہے۔ باہر والی بچانے مجھے سہارے نہ سہارے۔ تو جا آج خالہ کے گھر سستی کو ایک بار اس نظر سے دیکھ تو سہی۔“ زہنب اکھوتے بیٹے کی مرضی کے خلاف کچھ بھی نہیں کرنا چاہتی تھیں۔ خواہ مسرت ان کی بسن کی بیٹی تھی اور انہیں پسند بھی بہت تھی۔ بس وہ ماں کی خواہش میں چلا آیا۔

مسرت نے چار پائی بچھائی تو وہ بیٹھ گیا۔
”بوتل نکال فرج سے۔ اگر تو نے نہیں پی۔“ جنت کا اشارہ لیٹرک کی طرف تھا۔
مسرت تمل گئی۔

”اماں بھی ہر کسی کے سامنے بے عزت کرتی ہے۔“
”نہیں ملی بیویں گا۔“ شفیق کی نگاہیں ایک بار پھر مسرت کے آس پاس بھٹکیں۔ وہ ذرا سی جھکی چاٹنی سے لسی نکال رہی تھی۔ لسی نکالنے برف توڑنے پانی ملانے تک اسے عجیب سا احساس ہوا۔ اٹھتے بیٹھتے کھڑے ہوتے اس نے اپنا دوپٹا کئی بار ٹھیک کیا۔ اس نے بے اختیار پلٹ کر دیکھا وہ اسی کو دیکھ رہا تھا۔ مسرت کے دیکھنے پر مسکرایا۔

مسرت سٹپٹ گئی۔ لسی کا جگ لے کر ذرا سا فاصلہ پانا مشکل ہو گیا۔
”کیا ہو گیا بھائی شفیق کو۔ پہلے تو ایسے نہ دیکھتا تھا۔“
ٹھیک ہے کہ کم آتا تھا۔ زیادہ تر اماں کے ساتھ سلام دعا کر کے چلا جاتا۔ مگر آج۔۔۔ آج تو لگتا تھا۔ اس کی نگاہیں مسرت کے ساتھ ہی چپک گئی ہیں۔ محال ہے جو ذرا بھی نظروں کا زاویہ بدلا ہو۔ اس نے جلدی سے جگ گلاس پاس رکھا تو پلٹنے سے پہلے ہی شفیق نے آہستگی سے پوچھا۔
”کیسی ہو۔۔۔؟“

”ٹھہ۔ ٹھیک ہوں۔“ مختصر جواب دے کر وہ تیزی سے اندر ہوئی۔
”لو۔ پہلے تو کبھی میرا حال نہیں پوچھا۔“ ہتھیلیوں سے پسینہ صاف کرتے ہوئے مسرت نے کئی بار سوچا۔ پھر وہ باہر نہیں نکلی۔ شفیق کچھ دیر بیٹھا۔ پھر چلا گیا وہ بہت دیر تک اک انجانے سے احساس میں گھری رہی۔



اس نے جلدی جلدی کپڑے بدلے بال بنائے۔ دوپٹہ اوڑھتی باہر نکل آئی۔ جہاں ابھی ابھی اماں کے پاس ماسی زہنب آکر بیٹھی تھیں۔

”اماں! میں ذرا دبا کے ہاں ہو آؤں۔“

”کیوں؟“ سوال حسب توقع تھا۔

”یونہی۔ تھوڑی دیر میں آجاتی ہوں۔ کام تو سارا ختم ہو گیا۔“ مسرت موقع سے فائدہ اٹھانا چاہ رہی

تھی۔ اماں اور ماسی نے تقریباً گھنٹہ بھر باتیں کرنا تھیں۔ وہ سہیلی سے مل آتی۔ اس نے مدد طلب نگاہوں سے ماسی کو دیکھا۔

”بہانے دو۔ کمر پر سارا دن کیا کرے۔ اکواک سہیلی تھی فاطمہ وہ چلی گئی۔ لڑکیوں کی آپس کی باتیں ہوتی ہیں۔“ زینب نے فوراً ساتھ دیا۔ دراصل وہ مسرت کو وہاں سے ٹالنا چاہتی تھیں۔

”ایلی۔؟“ اماں متذبذب تھیں۔

”یہ سامنے تو گھر ہے۔ جا چکی۔“ زینب کے کہنے کی دیر تھی۔ وہ بگٹ بھاگ لی۔ دیا کے گھری۔ ڈی پر وہ بھی کھار فلم دیکھ لیتی تھی۔ وہ بھی اماں سے چوری چوری۔ یہ سلسلہ بھی نیا نیا شروع ہوا تھا۔ ورنہ پہلے تو اس کی دیا سے ذرا نہ بنتی تھی۔ اب بھی تین گھنٹے کی فلم ڈیزھ گھنٹے میں دیکھ کر واپس آئی تو ماسی جا چکی تھی۔ اماں چارپائی پر بیٹھی کسی سوچ میں گم تھیں۔

”ماسی چلی گئی؟“

”تو کیا تمہارے انتظار میں بیٹھی رہتی۔“ اماں کے الفاظ طنزیہ مگر لہجہ مسکراتا ہوا تھا۔

”خیر ہو۔ آج ماسی اماں کو کون سی گیدڑ سگلی سنگھا گئی ہے۔“

وہ کچھ حیران سی اندر کی طرف بڑھی۔ تب ہی اماں نے پکار لیا۔

”جی اماں۔“ وہ مڑی۔

”اُدھر پاس تو آ۔“

وہ کچھ متعجب سی پاس آئی۔ اماں نے بیٹھنے کا اشارہ کیا۔ وہ بیٹھ گئی۔ اماں کا رویہ ناقابل فہم سا تھا۔ وہ کچھ لمحے اسے دیکھتی رہیں پھر پیشانی چوم لی۔

”میں جانتی تھی تو بڑی بخت آور ہے۔“

”خیر ہے اماں۔ آج مجھ پر اتنے لاڈ۔“

”جائیل لا کر میرے سر میں لگا۔“ انہوں نے کہا تو وہ ابھتی ہوئی تیل کی بوتل اٹھالائی۔ اچھی طرح مالش کر کے سنگھسی کی۔ خیال تو وہ اماں کا رکھتی ہی تھی۔ بس کبھی کبھار اس کے اور اماں کے نظریات آپس میں ٹکراتے۔

”پتا ہے آج تمہاری ماسی کیوں آئی تھی؟“ اماں کی آنکھیں بند ہونے لگیں تب انہوں نے چپکے سے پوچھا۔

”ماسی تو روز ہی آتی ہے۔ آج کسی خاص مقصد سے آئی تھی؟“

”ہاں تیرے اور شفیق کے رشتے کی بات کرنے۔“

”کیا کہتی ہو اماں۔۔۔“ مسرت کے حلق میں کچھ پھنس گیا۔ ”یہ کس نے کہا ہے؟“

”کہنا کس نے ہے؟ تیری ماسی نے مجھ سے خود کہا ہے کہ مسرت کی فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔ وہ تو میری ہے۔“ اماں بے حد خوش نظر آرہی تھیں۔ پھر سرگوشی میں گویا ہوئیں۔

”خود شفیق کی بھی خواہش ہے۔“ (اچھا تو کل اسی لیے مجھے تار رہا تھا)
 ”کس سوچ میں گم ہو۔“ اماں سمجھیں وہ شرمائی ہے۔ جبکہ مسرت گم صم سی تھی۔ یہ بہت اچانک تھا۔
 ”تمہاری ماسی بہت خوش تھی۔ کہنے لگی۔ میری تو دلی خواہش پوری ہوئی ہے۔ بعد میں طریقے سے
 رشتہ ڈالنے آئے گی۔“

”خواہ مجواہ ہی۔“ وہ تنک کرولی۔ ”میں نے اس سے شادی نہیں کرنی۔“

”دماغ ٹھیک ہے تیرا۔“ جنت تو بھڑک اٹھیں۔

”بس اماں میں نے کہہ دیا۔“

”تو پھر کس سے کرنی ہے؟“

”اماں! تو اچھی طرح جانتی ہے۔“ وہ بے بسی سے گویا ہوئی۔

”نہیں میں نہیں جانتی۔“ وہ نجانے کس سوچ میں ڈوبیں۔

”اماں! مجھے گاؤں میں شادی نہیں کروانی۔“

”کیوں۔؟“

”کیونکہ مجھے گاؤں میں نہیں رہنا۔ میں نے اپنی آدھی زندگی اپنی ہر خواہش کو دبا کر گزار دی۔ یہ پہننا، یہ
 نہیں پہننا، پال ایسے نہیں بنانے، اس کے سامنے نہیں پہننا۔ اس سے بات نہیں کرنی۔ میں ایسے نہیں
 رہ سکتی۔ میرا بھی دل کرتا ہے۔ میں فیشن کروں۔ اچھے اچھے ڈیزائنوں کے کپڑے پہنوں۔ یہاں دوسرے
 دن کپڑے بدلو تو کوئی نہ کوئی پوچھ لیتا ہے۔“ غیر بہ مسرت ہر روز جوڑا بدلتی ہے۔ ”وہ بولنے پر آئی تو بولتی
 چلی گئی۔“

”مسرت! تجھے یہاں کوئی خوشی نہیں ملی؟“

اماں کو دکھ ہوا۔ وہ بہت لاڈلی تھی۔ انہوں نے جائز حدود کے اندر اس کی ہر خواہش پوری کی تھی۔ اچھے
 سے اچھا کھانا اچھے سے اچھا کپڑا، لیکن شاید کوئی کمی رہ گئی تھی۔ یا اس کی خواہشات بڑھ گئی تھیں۔
 ”کیا کمی ہے شفیق میں؟“

”کوئی بھی نہیں۔ بس میں نے گاؤں میں نہیں رہنا۔“

”ستی۔! وقت گزرنے کے ساتھ ساتھ بہت سی چیزیں بدل جاتی ہیں۔ آج جو باندیاں تجھ پر لگی ہیں۔
 کل نہیں ہوں گی۔ شوہر کی اجازت سے جو مرضی کرنا۔ شفیق عام مردوں جیسا نہیں ہے۔ پڑھا لکھا
 ہے۔ مجھے یقین ہے تجھے خوش رکھے گا۔“

”وہ یہاں کا ماحول تو نہیں بدل سکتا۔“

”نبیای عورت کو بڑی مراعات حاصل ہوتی ہیں۔ کنواری لڑکی کی حیا کچھ اور تقاضا کرتی ہے۔ شادی کے
 بعد تیری بہت سی خواہشیں پوری ہو جائیں گی۔“ خلاف معمول اماں کو غصہ نہیں آ رہا تھا۔ وہ اسے نرمی
 سے سمجھانا چاہتی تھیں۔ اور یہ نرمی مسرت کو مزید حوصلہ دے رہی تھی۔

”مجھے نہیں پتا۔ میں نے شادی شہر میں کروائی ہے۔“ وہ دھٹائی سے گویا ہوئی۔
 ”شہر سے تیرے لیے رشتہ کہاں سے آئے گا۔“ جنت چڑ گئیں۔ زالی ہی منطق تھی۔
 ”کہیں سے بھی آئے۔“ مسرت بھر نہنکی۔

”شہر میں کیا وکھرے لوگ بستے ہیں۔ میرے تیرے جیسے ہی ہیں۔ ضد نہ کر اچھے رشتے یونہی نہیں ملتے۔ بیٹھی رہ جائے گی۔ بوڑھی ہو جائے گی۔“ جنت نے ڈرانا چاہا۔
 ”نیت ہو تو رستہ نکل ہی آتا ہے۔ اماں! تو نیت تو کر۔ شہر میں بے جی ہیں۔ تایا اور چاچا۔ اتنے سارے لوگ ہیں! ایک رشتہ بھی نہ ملے گا۔“ وہ منتوں پر اتر آئی۔ اور جنت کی نرمی میں تک تھی۔ جھٹک کر پیچھے ہٹایا۔

”بے شرم! بے حیا! تیری زبان کھینچ لوں گی۔ لو۔ کوئی نے تو کیا کہے۔ کنواری منہ سے برا لگتی ہے۔“ جنت برسیں تو خوب برسیں۔ مسرت سر جھکا کر سنتی رہی۔
 ”کہیں دیکھا یا سنا ہے کہ لڑکی یوں منہ پھاڑ کر شادی بیاہ کی باتیں کرے۔ باپ نے تو وہیں کچھ کھا کر مر جائے۔ ہم بھی تو تھے۔ ماں پونے جس کھونٹے سے باندھا، بندھ گئے اور تیری ماسی کی لڑکیاں۔ کیسی بے زبان گائے جیسی۔ چپ چاپ۔“

”اماں! ہمیں گائے بھینس تو نہ سمجھ۔ اسی لیے تو۔“
 ”ستی! کان کھول کر میری اک بات سن لے۔ اب تیرے منہ سے اک لفظ نکلا تو زبان کھینچ لوں۔ نہ نب آئی تو میں نے ہاں کر دینی ہے۔“
 ”خواخواہاں کر دینی ہے۔“ وہ پاؤں پیچ کھڑی ہو گئی۔

”اپنے باپ کے سامنے کہنا۔“
 ”کہہ دوں گی۔“ وہ منہ ہی منہ میں برہنہ اندر بھاگ گئی۔ جنت غصے سے کافی دیر تک بولتی رہیں۔ تب ہی ہمسائی نے اوپر سے جھانکا۔

”خیر تو ہے جنتے۔ دیواروں سے لڑ رہی ہے۔“
 جنت نے ایک دم چپ سا دھلی۔ خواخواہ و سروں کو تماشا کیوں دکھاتیں۔
 ”کچھ نہیں۔ یہ سستی سے کہا تھا کہ مرغیوں کو دانہ پانی ڈال دے۔ بس بھول گئی۔ اتنا دن چڑھ آیا۔ بھوکی پیاسی ہیں۔“ اس نے جلدی سے بات بتائی۔
 ”بس یہ آج کل کی لڑکیاں ہوتی ہی نکمی ہیں۔ اب میری ساجدہ کو دیکھو۔“
 بات پلٹ جانے پر جنت نے شکر کا سانس لیا۔



پوری رفتار سے پگھلا چل رہا تھا۔ صحن میں کچھی رنگین چارپائیوں پر سفید کڑھائی والے تکیے رکھے

تھے۔ سرخ اینٹوں پر پانی کے چھڑکاؤ کی وجہ سے مٹی کی خوشبو پکتی ہوئی گندم کی سوندھی مٹک میں مدغم ہو رہی تھی۔ ان میں سے ایک چارپائی پر ساجد علی براجمان تھے۔ وہ اپنے چہرے مہرے سے مخنتی اور متحمل مزاج شخص دکھائی دیتے تھے۔

تپا ہوا تندور اور اس سے زیادہ تپتی انگارے چباتی جنتیلی۔

سرعت سے روٹیاں بناتے، لگاتے، مسلسل دل کی بھڑاس نکال رہی تھیں۔

”یہ سب تمہاری ڈھیل ہے ستی کے ابا۔ تمہارا لاڈ ہے۔ جواب سامنے آ رہا ہے۔ کہا بھی تھا، لڑکی ذات ہے۔ مت اتنا سر پر چڑھاؤ۔ پر میری سنتا کون ہے۔ میں پاگل سودا سن۔ بس یونہی بولتی رہتی ہوں۔ جہان کی لڑکیاں ہیں۔ میں نے کوئی انوکھی جنی ہے۔ باپ کا رعب ہو تو اس کی مجال ہے۔ یوں سامنے بول جائے۔ اور دکھاؤ گوڑے کے ساتھ لگا کر رنگ برنگے ڈرامے۔ تو بہ کوئی سنے تو کیا کہے۔“

”کوئی سننے نہ سنے، تم ضرور سناؤ گی۔“ ساجد علی مسکرائے۔ حالانکہ پلے اک لفظ نہ پڑا تھا کہ وہ اتنا بول کیوں رہی ہیں۔ دونوں کا گزراہ اسی لیے ہو گیا کہ وہ خود انتہائی متحمل مزاج اور روشن خیال انسان تھے۔ جنت کی عمر اس آنگن میں جھانڈ دیتے، روٹیاں لگاتے گزری تھی۔ باپ بیٹی کے لاڈ ان کی سمجھ میں نہ آتے۔

”نو کھے باپ ہو، لڑکیوں کے لاڈ کون اٹھاتا ہے۔“ وہ اکثر اعتراض کرتیں۔ ساجد علی سمجھانے بیٹھ

جاتے۔

”بھلی لوک، ذرا آس پاس نظر دوڑا۔ دنیا بدل رہی ہے۔ میرے تمہارے والا زمانہ کہاں؟ جب لڑکے، لڑکیوں میں فرق کیا جاتا تھا۔ اپنی فاطمہ کو دیکھ، کالج پینچ گئی۔ شوپڑ بھانے لگی ہے۔ کوئی سال جاتے نہیں کہ اپنے گاؤں کی لڑکیاں یونیورسٹی جائیں گی۔“

”تو تم بھی بھیج دو۔“ وہ چڑ جاتیں۔

ساجد علی سرد آہ بھر کر رہ جاتے۔ مسرت ان کی اکلوتی اولاد تھی، ذہین تھی، پڑھائی میں بھی اچھی تھی۔ ان کا ارادہ تھا کہ کم از کم اسے گریجویشن ضرور کرائیں گے۔ مگر ان دنوں مسرت کے دادا حیات تھے۔ میٹرک کے بعد جب کالج میں ایڈمیشن کی بات چلی تو انہوں نے اسے زندگی موت کا مسئلہ بنالیا۔ ”مجبوراً“ ساجد علی کو چپ ہونا پڑا۔ انہوں نے کتنا چاہا کہ مسرت پرائیویٹ ہی پڑھ لے، مگر اسے بھی ضد ہو گئی تھی کہ اگر کالج میں ایڈمیشن نہیں دلانا تو پڑھنا ہی نہیں ہے۔

”ہاں میں ہی دشمن ہوں۔ پر اب جو گل تمہاری دھی رانی کھلانے جا رہی ہے، اسے سن کر ہوش ٹھکانے آجائیں گے۔“ ساری روٹیاں یک گئی تھیں۔ وہ خالی پرات اور روٹیوں سے بھری چنگیر اٹھا کر آئیں اور وہیں قریب ہی بیڑھی کھینچ کر بیٹھ گئیں۔

”کیوں؟ اب کیا ہوا؟“ انہوں نے سکون سے سوال کیا۔ بیوی کی عادت تھی کہ معمولی بات کو بھی خاص بنا کر پیش کرتی۔

”نہ نب آپا آئی تھی۔ شفیق کے لیے مسرت کا ہاتھ مانگنے۔“
 ”یہ تو خوشی کی بات ہے۔“ ساجد علی کو بہر حال اس بات کی توقع نہ تھی کہ معاملے کا تعلق مسرت کے
 رشتے سے ہے۔
 ”تمہاری بیٹی کو یہ خوشی ہضم نہیں ہو رہی۔“
 ”کیا ہوا؟“

”اے اعتراض ہے اس رشتے پر۔“
 ”کیوں؟“ ”نہیں اگر تشویش ہوئی بھی تو اظہار نہیں کیا۔“
 ”تمہاری لاڈلی کہتی ہے گاؤں میں شادی نہیں کروانی۔“ جنت نے دھیرے دھیرے ساری بات بتائی۔
 بات کے اختتام تک ساجد علی کے لبوں پر مسکراہٹ دوڑ گئی۔
 ”ہنسومت، فکر کو ساجد علی! آخر شفیق میں برائی کیا ہے۔ چودہ جماعتیں پاس، ساری زمینوں کا اکلوتا
 وارث، زمینیں بھی وہ جو سونا، سی ہیں۔ بس یہی کمی کہ گاؤں میں رہتا ہے تو یہ کیا کمی ہے؟ گاؤں میں انسان
 نہیں رہتے ہم امریکہ سے آئے ہیں؟“ وہ خوب تپ کر بولیں۔
 سجاد علی ہنس دیے۔

”اور بس بس کر شہر دو۔ شفیق میں کیا کمی ہے؟“
 ”کوئی نہیں۔ مجھے وہ پسند ہے۔ بست تختی اور فرماں بردار لڑکا ہے، باپ کو چار پائی پر بٹھا کر سارا کام
 نبھال رکھا ہے۔“

ساجد علی کی بات نے جنت کو سارا دیا۔
 ”میری تو شروع سے ہی خواہش تھی، پھر بیٹی نظروں کے سامنے تو رہے گی۔“
 ”ہاں۔ ہاں اچھی بات ہے۔ بلکہ اس سے بڑھ کر مناسب رشتہ ملے گا بھی نہیں۔ یہ دو قدم کے فاصلے پر
 تو گھر ہے۔ بس تم پہلے ذرا مسرت کا ذہن تو ماننے دو۔“

”قیامت کو آواز نہ دو۔ دو بول پڑھوانے کی تیاری کرو۔ اینٹھ گئی تو کیا ہوگا۔“ انہوں نے بوکھلا کر کہا۔
 ”کچھ نہیں ہوگا۔ شوق کو جتنا دباؤ اتنا ہی بڑھتا ہے۔ اسے شردیکھنے کا شوق ہے۔ یہ شوق پورا کروں
 گا۔“ انہوں نے آرام سے کہا تو وہ حیرت سے ان کا منہ دیکھنے لگیں۔ پھر جھنجھلا کر بولیں۔
 ”اے شردیکھنے کا شوق نہیں۔ شہر میں بسنے کی ہڑک ہے۔“

”جو ملنا ہے نصیبوں کا ملنا۔ اتنی سی بات سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کا نصیب جہاں ہے وہیں جائے گی۔“
 جنت میاں کی بات سن کر چپ سی ہو گئیں۔

”مسرت۔ مسرت بیٹی! وہ جو دونوں کی بحث سن کر اندر کمرے میں گھسی بیٹھی تھی، جھجھکتے ہوئے
 باہر آئی۔“

”آج کھانا نہیں ملے گا؟“ باپ کے چہرے کی شفیق مسکراہٹ دیکھ کر اس کا حوصلہ بندھا تو جلدی جلدی کھانا نکالنے لگی۔

”آج سالن کیا ہے؟“

”بھئییاں ہیں اباجی! چاچے لال دین نے خروڑے بھی بھجوائے ہیں۔ میں نے کاٹ کر ٹھنڈے ہونے کو بھی رکھ دیے۔“ اس نے جلدی سے بتایا۔

”ٹھیک ہے۔ بعد میں کھائیں گے۔ اپنی ماں کو بھی روٹی کا پوچھ لے۔“

انہوں نے کن انکھیروں سے بیوی کو دیکھا۔ جو حمال تھیں وہیں ساکت نجائے کیا سوچنے لگی تھیں۔

”اماں! کھانا دوں؟“ مسرت نے جھجکتے ہوئے پوچھا۔

”جب دیکھا ہے تو کھا بھی خود ہی لوں گی۔“ وہ رکھائی سے بولیں۔

ساجد علی نے سنجیدگی سے بیٹی کو دیکھا۔

”گھر کے کاموں میں ماں کا ہاتھ نہیں بٹاتی ہو؟“

”کیوں نہیں۔ سالن بھی میں نے بنایا۔ آٹا گوندھا۔ ابھی دودھ ابالنا بستر بچھانے۔“

”ہاں! بس تندو پر روٹیاں نہیں لگتیں مہارانی سے۔“ جنت چڑ کر بولیں۔

”اماں! وہ بھی سیکھ لوں گی۔“ مسرت نے باپ کے سامنے چالپوسی دکھانا چاہی۔ ماں نے پرے دھکیل

دیا۔

”دفع ہو۔“

وہ جھجکی ہو کر اٹھ گئی۔ غصے اور ناراضی کے اظہار کے لیے کھانا ہی نہیں کھایا۔ ساجد علی خاموشی سے

کھانا کھاتے رہے۔ کھانا کھا کر باہر چوپال میں چلے گئے۔ جنت بی بی نے سالن سمیٹا۔ مسرت نے خاموشی سے بستر لگا دیے۔ ساجد علی کافی رات گئے لوٹے۔ آج وہ ان کے بستر کے پاس بیانی کی بوتل رکھنا بھی بھول گئی تھی۔

”مسرت بیٹی! وہ ان کی پہلی آواز پر ہی اٹھ گئی۔“

”پانی تو پلاؤ۔“ وہ کچھ شرمندہ سی ہو کر فریج سے پانی کی بوتل نکال لائی۔ آج سے پہلے باپ کو کبھی پانی مانگنا نہیں پڑا تھا۔ اس نے بہت چھوٹی سی عمر میں جب بوتل اٹھائی بھی نہ جاتی تھی۔ یہ ذمہ داری اپنے سر لے رکھی تھی۔

”بیٹھ جاؤ۔“ ساجد علی نے کہا تو وہ ان کی پائنٹی پر ٹک گئی۔ دل ہی دل میں تھوڑا گھبرائی۔ شاید اب باپ سرزنش کرے۔ جیسی ماں کے سامنے منہ ماری کر لیتی تھی۔ ویسی باپ کے سامنے تو کھل کر بات نہ ہو سکتی تھی۔

”مشر چلو گی؟“

”جی۔“ اک غیر متوقع بات پر اس نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔ وہ مبہم سا مسکرائے۔

”تمہاری ماں بتا رہی تھی، تمہیں شہر دیکھنے کا شوق ہے۔“

”جی۔ جی ابوجی!“ وہ حیرت سے نکل کر جوش سے بولی۔ ساتھ ہی چور نظروں سے ماں کی چارپائی کو دیکھا۔ وہ سو رہی تھیں۔ یا سوتی بن گئی تھیں۔ مسرت جان نہ سکی۔

”ہفتے کو میرے ساتھ چلنا۔ بے جی بھی تمہارے بارے میں پوچھ رہی تھیں کہ مسرت اب کتنی بڑی ہو گئی ہے۔ ان کی پوتیاں بھی تمہارے جتنی ہوں گی۔ کچھ دن رہ بھی لینا۔“

آخری جہلے سے مسرت پر شادی مرگ کی کیفیت طاری ہو گئی۔ وہ نہ صرف شہر جائے گی۔ بلکہ کچھ دن رہ بھی سکے گی۔ اس کا تو دیرینہ خواب پورا ہونے جا رہا تھا۔ اس کے نزدیک تو شہر والی کزنز کسی فیری لینڈ میں رہتی تھیں۔ بے جی ساجد علی کی تائی تھیں۔ تائی کی وفات تو عرصہ پہلے ہو گئی تھی۔ وہ اپنے دو بیٹوں اور ان کی فیملی کے ساتھ رہتی تھیں۔ ساجد علی کا اکثر آنا جانا ہوتا۔ جنت بھی موسمی سوغاتیں بھجواتی رہتی تھیں۔

”تو چلو گی۔“ اسے خاموش دیکھ کر ساجد علی نے دوبارہ پوچھا۔

”جی ابوجی۔ ضرور۔ تھینک یو۔“ مسرت نے نہال ہو کر ان کا بازو دبایا۔

”ساجد علی بے اختیار ہنس دیے تو جھل سی ہو گئی۔“

”لوڈراے میں تو تیرے بپا سے لپٹ لپٹ کر تھینک یو۔ تھینک یو کہتی ہے، میں نے کہا تو ابوجی کو ہنسی آگئی۔“ حالانکہ ساجد علی کو ہنسی اس کے تھینک یو کہنے پر نہیں بلکہ انداز پر آئی تھی۔

”جاؤ اب سو جاؤ۔“ انہوں نے آہستگی سے اس کا سر تھپتھپایا۔ تو وہ اڑتی ہوئی اپنی چارپائی پر چلی گئی۔ نیند کسے آتی تھی اسے تو صبح کا انتظار تھا، تاکہ یہ خوشخبری فاطمہ اور دیا کو سنا سکے۔

”ساجد علی۔“ اس کے جانے کے بعد جنت نے سر اٹھا کر شوہر کو نہ دیکھا۔

”تو فکر نہ کر جنت بی بی! ان شاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔“ وہ مطمئن لہجے میں کہہ کر دوبارہ لیٹ گئے۔ جبکہ جنت کی آنکھوں سے نیند اچاٹ ہو گئی تھی۔



صبح جہاں وہ اڑی پھر رہی تھی۔ وہیں جنت بی بی کا مزاج بے حد برہم تھا۔ مگر وہ چپ تھیں۔ ناشتہ سارا خود ہی بنایا۔ اسے کسی کام کے لیے آواز نہ دی۔ مسرت نے دھونے کے لیے برتن اکٹھے کیے تو انہوں نے خود ہی دھو ڈالے، بھاڑا اٹھائی تو ہاتھ سے چھین لی اور سارا صحن خود ہی صاف کر دیا۔ مگر منہ سے اک لفظ نہ نکالا۔

”یا اللہ! بول لیس تو دل کی بھڑاس ہی نکل جائے۔“ وہ کھسیانی سی ہو کر یونی اوہرا دھر پھر رہی تھی۔ مسرت کے ساتھ ساتھ وہ ساجد علی سے بھی ناراض تھیں۔ مگر وہ اطمینان سے ناشتہ کر کے کھیتوں پر چلے گئے۔ مسرت چپکے سے بکس سے وہ کپڑے نکال کر دیکھتی رہی، جو اس نے بڑے چاؤ سے سلوائے تھے مگر

اماں نے پہننے نہیں دیے۔ ان اشیاء کی لسٹ بنائی۔ جو ساتھ لے کر جانا تھیں۔ اسے مشورے کے لیے فاطمہ کے پاس جانا تھا۔ مگر اماں سے اجازت لیتے ہی ڈر لگ رہا تھا۔ جوئل کے پاس میلے کپڑے لے کر دھونے بیٹھ گئی تھیں۔ جنت نے کبھی داہنگ مشین نہیں لگائی تھی۔ جب بھی کپڑے دھونے ہوئے ہاتھ سے دھو تیں۔ اور یہ موقع اسی وقت آتا تھا۔ جب وہ سرت سے ناراض ہوتیں۔

”اماں! میں فاطمہ کی طرف چلی جاؤں؟“ اس نے ہمت کر کے پوچھ ہی ڈالا۔ اماں کی ناراضی سے زیادہ اسے اس بات کی فکر تھی کہ کہیں وہ اسے شہر جانے سے نہ روک دیں۔ اگرچہ ابوجی کا فیصلہ حرف آخر تھا۔ مگر اماں کسی بھی وقت کچھ بھی کروا سکتی تھیں۔ اس کا سرت کو یقین تھا۔ اماں خاموشی سے کپڑے سرف میں بھگوتی رہیں۔

”اماں! میں۔۔۔“ اس نے ہمت کر کے دوبارہ پوچھا۔

”میری طرف سے جہنم میں جا۔“ ان کی چپ ٹوٹی۔ ساتھ ہی کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔

”اماں! تم تو گوڈے گوڈے ناراض ہو۔“

”تو کیا تجھے ہار پھول پہناؤں۔“

”جھا اماں! ناراض نہ ہو۔ یہ کپڑے رکھ دو میں آکر دھو دوں گی۔“

اماں کو منانے کے لیے یہ وقت قطعی نامناسب تھا۔ مگر اس سے یہ غلطی ہو گئی۔ جواباً ”جنت بی بی نے اسے بے بھادگی سناں۔ وہ جو سوچ رہی تھی کہ اماں کے دل کی بھڑاس نکل جائے، بھڑاس کے ساتھ خود ہی روئے لگی۔

”اماں! شہر جانا میرا خواب ہے۔ تم سے میری اتنی سی خوشی برداشت نہیں ہوتی۔“

”ہاں نہیں ہوتی۔ اب جا کر کہیں۔ میری جان چھوڑ۔“ جنت بی بی نے دونوں ہاتھ جوڑ دیے۔ وہ کچھ لمحے سوچتی رہی۔ اس کے آنسوؤں کا اماں پر کوئی اثر نہ ہوا تھا۔ سو یہ جذباتی بلیک میلنگ ترک کر کے اس نے چہرہ صاف کیا۔ اور نوٹھے پن سے بولی۔

”ٹھیک ہے اماں! زندگی میں تو نے کبھی میری خوشی کا خیال نہیں کیا۔ میں کسی غیر کے گھر تو نہیں جاری۔ وہ میری دادی کا گھر ہے، سگی نہ سہی دور کی سہی۔ آخر ابوجی مجھے خود لے کر جا رہے ہیں۔ کون سا ہمیشہ کے لیے جاری ہوں۔ کچھ دن رک کر آجاؤں گی۔ اور اگر تم بھائی شفیق والی بات سے ناراض ہو تو۔“

”دیکھتی! میرا دماغ خراب نہ کر اور جا بھاں جانا ہے۔“ جنت بی بی نے ہاتھ روک کر بے حد اکتائے ہوئے لہجے میں کہا۔ تو وہ چپ ہو گئی۔ پھر تھوڑی دیر کے بعد ناراضی سے بولی۔

”فاطمہ کی طرف جا رہی ہوں۔“

اماں پیچھے کلستی رہیں۔

گلی میں زبیر اپنے دوستوں کے ساتھ کھیل رہا تھا۔

”مسرت باجی! گواچی گاں کی طرح کدھر جا رہی ہو؟“

”تمہارے گھر جا رہی ہوں۔“
 ”اچھا۔“ اس نے آستین سے اپنا منہ صاف کیا۔ پھر تو باجی فاطمہ تمہارے لیے بوتل بھی منگوائے گی۔
 اس نے کتنے سمیٹ کر جیب میں ڈالے اور ساتھ ہولیا۔ صحن میں نیم کا خوب پھیلا ہوا درخت تھا۔
 جس کے اوپر کوئے اور نیچے چارپائی پر فاطمہ کا بڑا بھائی بڑا اداس اداس لیٹا تھا۔
 ”السلام علیکم بھاجی!“

بھاجی نے سنا نہیں اپنے خیالوں میں گم رہا۔ فاطمہ کمرے میں بیٹھی پڑھ رہی تھی۔
 ”شکر ہے، تمہیں بھی خیال آیا۔“

”تم خیال آنے ہی نہیں دیتیں۔“ وہ مزے سے کہہ کر قریب بیٹھی۔
 ”مطلب۔“ فاطمہ نے اپنی کتابیں سمیٹیں۔ ”خیال سے پہلے خود جو موجود ہوتی ہو۔“
 ”بد تمیز۔“ فاطمہ نے کتاب اس کے کندھے پر دے ماری۔

”بابی! ٹھنڈی بوتل لے آؤں۔“ کل ہی گھر میں پیپسی کالیٹریک آیا تھا۔ جو کھلنا کسی سمان کی آمد پر تھا
 اور زیر کو، اسی مرحلے کا انتظار تھا۔

”یا اللہ۔“ فاطمہ نے سر پر ہاتھ مارا۔ ”یہ لڑکا کتنا ندیدہ ہے۔ یوں لگتا ہے جیسے پیپسی کبھی دیکھی ہی
 نہیں۔ حالانکہ صبح ہی لیٹریک نہ کھولنے کے لیے میں نے اسے دس روپے دیے تھے کہ ویسے ہی پی آؤ۔“
 ”وہ تو صبح ہی تھی۔ اب اکیلی اکیلی پیو گی۔“ وہ چمک کر بولا۔
 ”اچھا بابا، لے آؤ۔“ فاطمہ نے اجازت دی۔

”یہ بھائی عباس بڑے اداس بیٹھے ہیں۔“
 ”بھائی کی فیملی گواچ گئی ہے۔“ زیر نے جاتے جاتے بتایا تو وہ سوالیہ نظروں سے فاطمہ کو دیکھنے لگی۔ وہ
 مسکرا دی۔

”بھابھی میکے گئی ہیں۔“

اس کے بھائی، بھر جائی کی محبت خاصی مثالی تھی۔ حالانکہ شادی کے چار سال بعد بھی ان کے ہاں اولاد
 نہ ہوئی تھی۔ مسرت ہنستے ہوئے اس کی کتابیں دیکھنے لگی۔ کتنی خواہش تھی اسے فاطمہ کے ساتھ کالج میں
 داخلہ لینے کی، مگر۔

”کیا بات ہے، آج بہت خوش نظر آ رہی ہو۔“

”خوش۔ ابھی ابھی اماں کے ساتھ جنگ ہوئی ہے۔“ وہ اس کے پاس آلتی پالتی مار کر بیٹھ گئی۔

”جس میں جیت یقیناً تمہاری ہوئی ہو گی۔“

”تمہیں کیسے پتا چلا؟“ مسرت نے چونکنے کی اداکاری کی۔

”تمہارا چہرہ بتا رہا ہے کہ تم نے اپنی منوائی ہے۔“

”بڑی چہرہ شناس ہو۔“

”تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔“ فاطمہ ہنس دی۔
 ”سنو! میں شر جاری ہوں۔ اباجی نے مجھ سے خود کہا ہے۔ بلکہ میں کچھ دن وہاں رہوں گی بھی۔“ اس نے بے حد خوش سے فاطمہ کے ہاتھ تھامے۔
 ”واقعی۔ تایاجی کی طرف رہو گی۔“ فاطمہ کو واقعی بہت خوشی ہوئی تھی۔ کچھ دن کے لیے سہی مگر اس کی خواہش تو پوری ہو رہی تھی۔

”اور کہاں رہنا ہے۔ بی جی نے خود اصرار کر کے بلایا ہے۔“ اس نے مبالغہ آرائی کی۔
 ”پہلے تو کبھی خیال نہیں آیا۔“
 ”اب تو آگیا۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔
 ”دل لگ جائے گا؟“

”گوڈ سے۔ گوڈ سے۔“ شرمیں دل لگانے کے لیے تھوڑا کچھ ہے۔“
 فاطمہ اس کی جذباتیت پر مسکرا دی، پھر چھیڑنے لگی۔
 ”کہیں واقعی دل نہ لگا آتا۔“

”لگ جائے تو کیا حرج ہے۔“ مسرت فاطمہ کے معنی خیز انداز پر ہنس دی۔
 ”بتاؤں چا چاہی کو۔ ارادے خطرناک ہیں۔“

”اتنے بھی نہیں ہیں۔ اچھا میرے ساتھ گھر چلو۔ مجھے بتاؤ میں کیسے کپڑے لے کر جاؤں۔“
 ”بھئی جیسے مرضی لے جاؤ۔ وہاں کوئی پابندی توڑی ہے کہ بس ایسے کپڑے ہی پہننے ہیں۔“ اسے ابھی بہت سا رہنما تھا۔

”پھر بھی۔“ مسرت نے اصرار کیا۔
 ”اچھا بابا۔ شام کو آؤں گی۔“

”یہ نہ ہو میں وہاں پینڈو پینڈو سی لگوں۔“ وہ تشویش سے بولی۔
 ”مسرت! تمہارے اندر یہ کس قسم کا کمپلیکس ہے۔ یہاں اور وہاں کی زندگی میں کچھ زیادہ فرق نہیں

رہا۔ ہم بھی وہ ساری سہولیات برت رہے ہیں، جو پہلے صرف شہر والوں تک محدود تھیں۔ ٹی وی، فون، سلنڈر گیس، وہ کوئی علیحدہ زندگی نہیں گزار رہے۔ وہاں بھی لڑکیاں شتر بے مہار نہیں پھرتیں۔ اگر کچھ آزادیاں ہیں تو بہت پابندیاں بھی ہیں۔ اس طرح مت سوچا کرو۔“
 فاطمہ نے سمجھانا چاہا تو اس کا منہ بند ہو گیا۔

”ٹی وی، فون آجانے سے کیا سوچ بھی بدل گئی ہے۔“

”تبدیلی آہستہ آہستہ ہوتی ہے، ایک دم سے کچھ بھی نہیں بدلتا۔ پہلے ہمارے گاؤں میں لوگ لڑکیوں کو تعلیم دلانے کے خیال سے کانٹوں کو ہاتھ لگایا کرتے تھے۔ اب لڑکیاں شہر جا کر پڑھ رہی ہیں۔ وسعت خیالی کا مطلب بے مہار آزادی نہیں۔ شعور کا مطلب اپنی اقدار سے منہ موڑنا نہیں۔ ہر جگہ ہر علاقے

لی اپنی ویلیوز ہوتی ہیں۔ ہمیں انہی کے اندر رہ کر اپنے لیے گنجائش نکالنی ہے۔ اپنی مثبت روایات کے خلاف جانا تو اپنی ہی تعلیم کی توہین ہے۔“

”گمنامی تقریر ختم تو تباد۔ میں وہاں کیسے کپڑے لے کر جاؤں۔“

”تم بھی نہیں سدھو گی۔“ فاطمہ اک طویل سانس لے کر رہ گئی۔

”اس کو خود ہی بھائی شفیق سدھارے گا۔“ زبیر پیپی کے دو گلاس لے کر آیا تھا فوراً بولا۔

”شفیق۔ شفیق کا یہاں کیا ذکر؟“ فاطمہ چونکی، ساتھ ہی اس کے ہاتھ سے ٹرے لے لی۔ خود مسرت

کا بکا رہ گئی۔
”مجھے اپنی کتابوں سے فرصت ملے تو دنیا کی خبر ہو۔ باجی مسرت کا رشتہ طے ہو گیا ہے۔ بھائی شفیق کے

ساتھ۔“

مسرت کو تاؤ ہی آگیا۔ ساتھ ہی اماں پر غصہ بھی کہ اتنی جلدی خبر نشر کر دی۔

”مجھے میں بتاتی ہوں پوچھا کہیں کا۔“ مسرت نے جوتے کی طرف ہاتھ بڑھایا۔

”ہاں تو نہیں ہوا۔“ وہ چمک کر بولا۔ ”شکر ہے تیرا بوجھ تو سر سے اترا۔ اب رہ گئی باجی فاطمہ۔ اس کا

سبب بھی اللہ بنا دے گا۔“

”ہاں سارے بوجھ تیرے سر ہی تو ہیں۔“ مسرت جل کر بولی۔

”میں فکر نہیں کرنی تے ہو رکنے کرنی آں۔“ وہ سینہ تان کر بولا۔

”کوئلڈ رنک لے لے ہے۔ اب جاف۔ فاطمہ نے قدرے سنجیدگی سے کہا تو وہ بھی شرافت سے کھڑا

ہو گیا۔

”باجی! میں نے تیری شادی پر سو سو پیسہ لینا ہے۔“

”شفیق کا سٹروالا (شہ بالا) بن جانا۔“ مسرت نے جال کر کہا۔ زبیر کو یہ آئیڈیا خاصا پسند آیا۔ اسی لیے

خوش خوش سر ہلاتا چلا گیا۔

”یہ کیا قصہ ہے؟“ فاطمہ نے تجسس سے پوچھا۔

”خالہ آئی تھی اپنے لاڈ لے کا رشتہ لے کر۔“ وہ جل بھن کر بولی۔

”سچ۔“

”اس میں اتنا خوش ہونے والی کون سی بات ہے۔“ مسرت کو اس کی خوشی ایک آنکھ نہیں بھائی۔

”پاگل ہو شفیق بہت اچھا ہے۔“

فاطمہ کی سمجھ میں اس کی بے زاری نہیں آئی۔ شفیق واقعی اتنا اچھا تھا کہ اس کی ماں جس گھر بھی رشتہ

لے کر جاتی مورا“ ہاں ہو جاتی۔

”بھلے ہو، پر ریتا تو گاؤں میں ہے اور میں نے گاؤں میں شادی نہیں کروانی۔“ مسرت نے آرام سے

کہا۔ فاطمہ نے بے حد افسوس سے اسے دیکھا۔

”تمہارا دل غبالگل ہی خراب ہے۔ اتنا بچکانہ سوچ کا انداز، میرے لیے تو باعث حیرت ہے۔“
 ”بیٹھی کرتی رہ اپنی حیرت کا اظہار۔ مگر شام کو ضرور آنا بہت سے مشورے لینے ہیں۔“
 ”فائدہ۔ جب کرنی تم نے اپنی ہے۔“
 فاطمہ نے طنز کیا۔ جسے وہ پیسی کے ساتھ ہی پی گئی۔



کھٹ پٹ کی آواز سے اندازہ ہوا کہ اماں اٹھ گئی ہیں۔ ملگجے اندھیرے میں مدھالی کی ہلکی سی گھر گھر سنائی دے رہی تھی۔ مسرت نے کوٹ بدل کر دیکھا۔ اماں وہیں تھیں۔ وہ کچھ لمحے انہیں دیکھتی رہی۔ وہ ابھی تک مسرت سے ناراض تھیں۔ مسرت نے کبھی بھی ان کی ناراضی کی زیادہ پروا نہ کی تھی۔ لیکن آج اسے جانا تھا تو دل کی عجیب سی حالت تھی۔ وہ انہیں یوں خفا چھوڑ کر نہیں جانا چاہتی تھی۔ وہ اٹھ کر ان کے قریب چلی آئی۔

”اماں! یونہی ناراض رہو گی۔“ جنت بی بی نے بیٹی کی سوئی جاگی صورت دیکھی۔ پھر برف کوٹ کر چائی میں ڈالی اور دو مارے سے بٹن دبا دیا۔

”اماں! تم میری بات کیوں نہیں سمجھتی ہو۔“

”سمجھنے کی ضرورت تھی ہے۔ سنی! جتنا جلدی سمجھ لے اتنا ہی اچھا ہے۔“ اماں ٹھنڈے لمبے میں بولیں۔

”اماں! تو نہیں چاہتی میں خوش رہوں۔“

”ستی! میں نے دنیا نہیں دیکھی، پر زندگی کو برتا ہے خوشی، محبت اور بھروسہ کرنے والے مرد کا ساتھ ہے۔ خوشی شہر اور گاؤں میں ہی ہوئی نہیں۔ خوشی وہ ساتھ ہے۔ جب بیوی اور شوہر زندگی کے سرد گرم میں ایک دوسرے کی چھپر چھپاؤں بن جاتے ہیں۔ تو بیاہ کر شہر میں چلی جائے۔ تجھے وہ ملے، جو نہ تجھے محبت دے سکے، نہ اعتبار کر سکے۔ تجھے دل کی رانی کی جگہ گھر کی باندی بنا کر رکھے تو فائدہ ایسے شہر کا۔“

”شہر میں سب برے تو نہیں ہوتے اماں۔“ وہ آہستگی سے بولی۔

اماں نے اک سرد آہ بھری مدھالی بند کر کے نکالی، ملی بن چکی تھی۔ مکھن بن چکا تھا۔

”اچھے برسے ہر جگہ ہوتے ہیں۔ میں ان پڑھ، گھر کی چار دیواری میں رہنے والی عورت کسی کے بارے میں کیا رائے دوں۔ پر اللہ پاک کی قسم کھاتی ہوں۔ دل کو یقین ہے۔ دنیا کا کوئی مرد تجھے وہ خوشی نہ دے گا۔ جو تجھے شفیق کے گھر اس کے ساتھ میں ملے گی۔ تو، تو نا شکری ہے۔ کیسا سچا رشتہ گھر بیٹھے مل گیا۔ لوگ تو منتیں مانگتے ہیں۔ ایڑیاں رگڑتے ہیں تو بھی ڈھنگ کے بر نہیں ملتے۔ تو، تو نصیبوں والی تھی، پر ناتقدیری نکلی۔ اب جاوہاں کے رنگ بھی دیکھ لے۔ چھ۔ چھ لڑکیاں بیٹھی ہیں۔ رشتوں کی آس میں۔“

”ٹھیک ہے جا۔ میری باتیں تجھے کہاں اچھی لگتی ہیں۔ پر پچھتائے گی سہی۔ اسی لیے میرا دل روتا ہے۔“
 ”اماں! میرے لیے بددعا مت کر۔“

اماں نے ست روی سے مکھن نکالنا شروع کیا اور زیر لب بددعائیں۔

”تو سمجھتی ہی نہیں دعا کیا ہے اور بددعا کیا؟“

مرست سر جھٹکتے ہوئے اٹھ گئی۔ اسے افسوس تھا کہ وہ اماں کو منانہ سکی۔ مگر اس افسوس کے لیے اس کے پاس زیادہ وقت نہ تھا کہ اسے تیار ہونا تھا۔



”اباجی! تایاجی کی بیٹیاں کیسی ہیں؟“

ویگن میں بیٹھے ہی مرست نے پہلا سوال کیا۔ اس کا بھاری بھر کم بیگ کنڈیکٹر عقب میں رکھ چکا تھا۔ جس میں اس کے آٹھ دس جوڑے، میچنگ جوتے اور جیولری کے ساتھ نجانے کیا کچھ تھا۔ حسرت تو تھی کہ کچھ جوڑے نئے بھی بنوالے مگر اماں کی وجہ سے دیا گئی۔

”بہت پیاری بچیاں ہیں۔“ ساجد علی نے مختصر جواب دیا۔

”بچیاں تو نہیں۔ میرے جتنی ہوں گی۔“ اس نے اعتراض کیا۔

”تم سے تو خیر بڑی ہی ہیں۔“

”اور چھوٹے تایا؟“

”ہاں ان کی چھوٹی لڑکیاں تمہاری عمر کی ہوں گی۔“

ویگن جب تک شہر پہنچی، گرمی، پسینے اور جس نے مل کر ساری تیاری کا ناس مار دیا تھا۔ خواہ اس الگ اڑے سے تھے، مگر نظروں کے سامنے، نازک نازک، سچی سچائی، پائسجامہ اور شارٹ شرٹس میں ملبوس گوری گوری سی لڑکیاں آ رہی تھیں، خوشبوؤں سے مکی مکی سی۔

”ہائے اللہ! اب ان سے اس طرح ملوں گی۔ گوڑے گوڑے پسینے میں ڈوبی، کوئی ایسی جگہ بھی نہ ہوگی کہ ہاتھ منہ دھو کر دوبارہ سے میک اپ ہی کر لوں۔“

وہ ویگن سے اتر کر ٹیکسی میں جا بیٹھے، اباجی ساتھ تھے۔ ورنہ ذرا سا نقاب کھسکا کر تھوڑی بہت دورنگی تو ہو ہی سکتی تھی۔ پرس میں تمام مطلوبہ اشیاء موجود تھیں۔ گنجان آبادی کا علاقہ تھا۔ ایک دوسرے سے گئے ملتے۔ دو، دو، تین، تین منزلہ گھر، پرانا طرز تعمیر، مکانوں کی خستہ حالی، سڑک روکتی، دودھ، دہی، نان

چھوڑوں کی دکانیں، پھر ٹیکسی اک دو منزلہ گھر کے سامنے جاری۔ یہاں قدرے سکون تھا۔ ارد گرد دکانیں بھی نہ تھیں۔ گھر کے سامنے شہوت کا بڑا سا خوب پھیلا ہوا درخت تھا۔ جس نے گھر کے سامنے کے حصے کو کھنی چھایا بخشی تھی۔ درخت کے نیچے پلاسٹک کی کرسی پر چند خشک پتے گرے ہوئے تھے۔ اباجی نے بیل پر انگلی رکھ دی۔

وہ دھڑ دھڑاتے دل کے ساتھ دروازہ کھلنے کی منتظر تھی۔



صبح عبور کر کے برآمدے میں قدم رکھتی صغریٰ بی ٹھنک کر رہی۔
عجیب و غریب آوازیں تھیں۔

انہوں نے ہمہ تن گوش ہو کر سننے کی کوشش کی۔

”جیسے کوئی غرانے کی کوشش کر رہا ہو۔ یا۔۔۔“ انہوں نے دوبارہ غور کیا۔ ”جیسے کوئی زکام زدہ بلی چھینکیں مار رہی ہو۔“

”نہیں۔۔۔ بلی کے گلے میں چھپڑا پھنس گیا ہے۔“ صغریٰ بلی نے خود ہی اپنے خیال کی نفی کی۔ تب ہی نظر پکچن کے کھلے دروازے پر پڑی۔

”لو کھلا پکچن، بلیاں پھریں یا کتے لوٹیں۔ اس گھر کی لڑکیاں بھی نکمی ہی ہیں، آواز برآمدے میں بجھے پلنگ کے آس پاس سے آ رہی تھی۔ اور بہت زور و شور سے۔“ متحس صغریٰ نے جھک کر پلنگ کے نیچے جھانکنا چاہا۔ تب ہی ایک استخوانی ہاتھ نے گردن دیوچلی۔

”پکڑ لیا۔ تم ہی ہو جو ہر روز۔۔۔ اس۔۔۔ صغریٰ۔۔۔ تم۔۔۔“ اس کے ہاتھ یوں جھٹکا گیا مردہ چھپکلی کو چھو لیا ہو۔ پلنگ پر لے لٹا و جو داٹھ کر بیٹھ گیا تھا۔

”حق با بھلا یوں چوروں کی طرح پلنگ کے نیچے کیا جھانک رہی تھیں۔ میں سمجھی وہ چور ہے جو ہر روز میرے سرہانے تلے سے پیسے نکال لیتا ہے۔“ وہ اک دھان پان سی ستر سالہ خاتون تھیں۔ سر پر برف اور چہرے پر جھریوں کا جال تھا۔ رنگت بے حد سفید، جوان کے پنے کپڑوں کے ساتھ میچ کر رہی تھی۔

”توبہ بے جی، ایسے تو تم کتنی ہو کہ میں کچھ کھاتی ہی نہیں اور زور ایسا کہ کیا ہی گاما پسلوان میں ہو گا۔“

صغریٰ کی منجھی سی گردن میں بل گیا تھا۔ جسے وہ دائیں بائیں ہلایا کرتا تھا۔

”یہ گاما کون ہے؟“

بے جی اب سرہانے کے نیچے سے بڑا نکال کر ریز نگاری گننے میں مصروف تھیں، پسلوان کا لفظ نہ سن سکیں۔

”میرا پچھڑ۔“ صغریٰ نے جل بھن کر کہا۔

”تو اس میں اتنا غصہ کرنے والی کون سی بات ہے۔“ بے جی نے حیرت سے اس کا منہ دیکھا۔ پھر ہمدردی سے پوچھا۔

”کیا تمہاری ان کے ساتھ بنتی نہیں۔ اے ہے۔ یہ وہی تو نہیں جن کے گھر تمہاری بیٹی کا رشتہ۔“
”جہنم میں گیا میرا پچھڑ، یعنی کہ گاما۔ میں تو خالہ تمہارے زور اور طاقت کی بات کر رہی تھی۔ تم نجانے کدھر کی کدھر نکل گئی ہو۔“

”ہاں تو کیوں نہ ہو۔“ بے جی نے فخر سے اپنا جھریوں زدہ ہاتھ دیکھا۔ ”مکھن میں گندھے پراٹھے کھائے
 اں۔ ساری جوانی، نور پیر کے ویلے دودھ بلوتے، کررڑنی ہے۔ (ادھ بلوئی لسی جس میں مکھن شامل ہوتا
 ہے۔) یہ آج کل کی لڑکیوں کی طرح تھوڑی کہ کالی بھنگ چائے کے ساتھ سوکھا توس نگل لیا۔ سینک
 مانی۔ ہوا چلے تو آگے پیچھے جھول جائیں۔ چہرہ جیسے چوسی ہوئی امیاں، دو کلو چینی کا لفافہ اٹھالیں تو آگے
 پیچھے جھول جائیں۔ کمر میں چک پڑ جائے۔“

ایسے زریں خیالات کا اظہار وہ بغیر لحاظ کیے اپنی پوتیوں کے سامنے بھی کرتی رہتی تھیں۔ جنہیں سن کر
 سر پٹنے کے سوا اور کیا کر سکتی تھیں۔

”نازک جھٹاں ہیں جی۔“ صفری نے اپنے خیال کا اظہار کیا تو بے جی نے اسے ٹوکتے ہوئے انتہائی
 غم سے دیکھا۔

”جھٹاں اور نازک۔؟ یہ تو بڑھاپے نے رول دیا۔ ورنہ ہم وہ تھے کہ چوکھٹ میں بیٹھتے تو چوکھٹ بھر
 باتی۔ پتا چلتا کہ جٹی چلی آری ہے۔ دو من کے ٹوکرے اٹھا کر یوں چلتی تھی کہ راہی دو مربے پہلے ہی
 رہتے چھوڑ جاتے۔“

”کس چیز کے ٹوکرے؟“

”خربوزے اور تربوز کی فصل ہوتی تھی۔ پورے ساہیوال، چیچہ وطنی اور عارف والا تک مشہور تھے۔
 خربوزوں میں ایسی مٹھاس گھویا شکر منہ میں کھلی ہو اور تربوز، یہ تمہارے سر کی طرح بڑے بڑے۔“
 وہ اپنی ہی جھونک میں کہہ نکلیں۔ صفری نے پہلو بدل کر منہ بنالیا۔ اس کا سردھڑکی نسبت بڑا تھا۔ منحنی
 سے وجود پر یہ بڑا سا سر خاصا عجیب لگتا۔

”میں خود اپنی نگرانی میں فصل اتروایا کرتی۔ حق ہا۔ کیسا سنہری دور تھا۔ عورتیں گیت گاتیں، بچے
 شونیاں کرتے، ڈھیر کے ڈھیر لگ جاتے۔“ انہوں نے اک سرد آہ بھری اور بڑا واپس تکیے کے نیچے گھسا کر
 تسبیح نکالی۔

”پھر وہ ڈھیر کیا ہوئے؟“ صفری نے افسوس سے پوچھا۔ فی زمانہ یہ حالات ہوتے تو وہ بھی ڈھیر میں سے
 بڑے بڑے تربوز چھانٹ رہی ہوتی وہ بھی گھر لے جانے کے لیے۔

”سب کے سب بے فتنے۔ بیلوں کی طرح شہروں کا رخ کر بیٹھے۔ زمین ٹھیکے پر چڑھا دی۔ سب اجڑ بڑ
 کیا۔“ ان کے لہجے میں اداسی سرایت کر گئی۔

”لالا جی بھی مرکز گاؤں نہ گئے؟“

”پہلے جاتے تھے۔ اولاد نے جب تھوڑی زمین بچی تو ول ہی ٹوٹ گیا۔ باقی زمین ساجد علی کے حوالے
 کی۔ پھر مڑ کر نہ دیکھا۔ اللہ بھلا کرے ساجد علی کا اسی کی وجہ سے گاؤں سے کچھ رشتہ قائم ہے۔“

”ساجد علی کون۔“

”میرے دیور کا لڑکا۔ دیور۔ دیورانی تو گزر گئے۔ اب وہی زمینوں کی دیکھ بھال کرتا ہے۔ ٹھیکہ بھی

دے جاتا ہے اور موسم کی ہر سوغات بھی۔ ورنہ اس منگائی کے دور میں ہم سفید پوشوں میں اتنی سکت کہاں کہ نوکرے بھر بھر پھل کھائیں۔ اللہ اسے اور ترقی دے۔ زمینیں سونا انگلیں۔ اس دوڑ بھاگ کے دور میں بھی ہمیں یاد رکھے ہوئے ہے۔ ”کچھ لمحے خاموشی چھائی رہی۔ پھر بے جی کو یاد آیا۔

”پر تم میرے پلنگ کے نیچے کیا کر رہی تھیں؟“

”میں تو وہ ملی ڈھونڈ رہی تھی جس کے گلے میں چھپھرا پھنس گیا تھا۔“

”ہیں۔۔۔ پر آج تو گھر میں گوشت پکا نہیں۔“ انہوں نے تعجب سے کچن کے دروازے کی طرف دیکھا۔

”اب یہ میں کیا جانوں۔ میں نے تو آواز سنی تھی۔“

”اچھا!“

”میں تو اس لیے آئی تھی کہ آپ نے بلوایا تھا۔“

”اے۔۔۔ تو کیا آج شام نہ ہونی تھی۔“

”شام میں میل لگ جاتا ہے۔ برانہ مانتا ہے جی! تمہاری بہوؤں کے سامنے بات کرنا مشکل ہی نہیں ناممکن ہے۔“

بات سچ تھی سو بے جی چپ رہیں۔ پھر آہستگی سے پوچھنے لگیں۔

”تم سے کہا تھا کوئی ڈھنک کا۔۔۔“

”بے جی! اوس روپے تو دے دیں۔“ مانو نے خاصے غلط وقت میں انٹری دی۔ بے جی نے بد مزہ ہو کر مانو کی طرف دیکھا، پھر سر ہٹا کر جانہ لیا۔ وہ درمیانے قد کی دہلی پتلی سی لڑکی تھی، گول چہرہ، صاف رنگت، بڑی بڑی آنکھیں۔ جس میں نو عمری کا بانگین اور لا پرواہی عیاں تھی۔

”یہ تم کس کلاس میں پڑھتی ہو؟“

سوال بے موقع تھا۔ اس لیے وہ کچھ سٹیٹائی۔

”تھرڈ ایئر میں۔“

”تھرڈ۔ یعنی۔۔۔ تیرہویں کلاس میں۔“ انہوں نے انگلیوں پر حساب لگایا۔ پھر دوبارہ اسے گھورا۔

”تمہاری عمر میں میں نے سارے کے سارے بچے پیدا کر لیے تھے۔“

”اس میں میرا کیا قصور ہے؟“ وہ روہانسی ہو گئی۔ بھی نیل کی تیز آواز گونجی۔ صفری منہ پر دوپٹہ رکھے، ہنسی روکتی دروازے کی طرف بڑھ گئی۔

پاؤں میں جوتا نہیں۔ کندھے پر دوپٹہ نہیں۔

صفری نے دروازہ کھول کر آنے والوں کو رستہ دیا۔

”گھر میں اب نہیں۔ بھائی بھی نہیں۔“ مانو نے وضاحت دینا چاہی۔

ڈھائی انچ کی قمیص، ٹانگوں پر منڈھاپا سجا، آنے والی نے گھبرا کر اپنی ٹانگیں دیکھیں۔ پھر سامنے

جہاں بے جی برس رہی تھیں۔

”ایں۔ یہ تو گھری کا۔ فلر نہ۔“
 مسرت نے مہمن عبور کرتے ہوئے ہول کر سوچا۔
 ”میں پوچھتی ہوں! اب تک بچی رہو گی۔ گھر میں سب سے چھوٹی ہونے کا مطلب یہ نہیں کہ ابھی
 تک چوسنی منہ میں لے کھو۔“
 ”افوہ! کہاں ہے چوسنی۔ آپ تو پیچھے ہی پڑ گئی ہیں۔“ وہ بد بدائی۔
 ”پاگل جو ہوں۔ لڑی اپنے کرتوت ٹھیک کرو۔“
 ”کیا ہو گیا ہمارے کرتوتوں کو۔ ایک دوس روپے ہی مانگتے ہیں۔“
 ”کیا کرنے ہیں؟“
 ”گول گئے۔“

”اپنا یہ گول مجھے جیسا منہ لے کر فوراً غائب ہو جاؤ۔“ بے جی کو تاؤ آگیا۔ سارا دن کالج میں الم غلم
 کھانے کے باوجود گھر میں بھی اس کی توجہ سڑک سے گزرتے پھیری والے پر ہی رہتی۔ وہ پیر پختے ہوئے
 غائب ہو گئی۔ تبھی بے جی کی نظر آنے والے مہمانوں پر پڑی۔
 ”بسم اللہ۔ بسم اللہ۔ ساجد علی آیا ہے۔“ وہ فوراً پذیرائی کو اٹھیں۔
 ”بیٹھی رہیں۔“ وہ سلام کر کے ان کے سامنے جھکے۔ انہوں نے ڈھیروں دعائیں دیں، پھر اشتیاق سے
 مسرت کو دیکھا، جس نے نقاب کھسکا دیا تھا۔ اور اب چادر کے کونے سے پسینہ خشک کر رہی تھی۔
 ”یہ مسرت ہے؟“

”جی بے جی! آپ کی پوتی۔“
 ”ماشاء اللہ! ماشاء اللہ۔“ انہوں نے سر پر ہاتھ پھیرا۔ پھر دونوں کو پاس ہی بٹھالیا۔

”صغریٰ بی! بھاگ کر شربت ہی بنا لو۔“
 بے جی نے کہا تو وہ سر ہلاتی کچن میں جا گھسی۔ بے جی ان سے گاؤں کے بارے میں چھوٹے چھوٹے
 سوال کرتی رہیں۔ شربت بی کر کچھ حواس بحال ہوئے۔
 ”ساجد علی! میں اپنی بیٹی کو جلدی نہیں بھیجوں گی۔ اب یہ بہت سارے دن ہمارے پاس رہے گی۔ آخر
 اس کے دادا کا گھر ہے۔“

”کیوں نہیں بے جی! اچھوڑنے ہی تو آیا ہوں۔ جب تک مسرت کا دل لگے۔“ انہوں نے سعادت
 مندی سے جواب دیا۔

”اس کی فکر نہ کرو۔ اپنی بچیوں کے ساتھ خوش رہے گی۔ نہادھو لو تو کھانا لگواتی ہوں۔“ صغریٰ ذرا سارا
 بیٹی کو اٹھا دے۔ باقی سب تو مردوں سے شرط لگا کر سوئے ہیں۔ جگائے نہ جاگیں گے۔ وہ کچھ مہمانوں کے
 لیے روٹی ٹکڑے کا بندوبست کرے۔
 بے جی نے کہا تو ساجد علی اطمینان سے اٹھ کر مہمان خانے کی طرف بڑھ گئے۔

”بٹی! تم اس کمرے میں چلی جاؤ۔ اندر ہاتھ روم بھی ہے۔“ انہوں نے کہا تو مسرت کھڑی ہو گئی۔ نگاہ بھاری بیگ پر پڑی جو ساجد علی پلنگ کے پاس رکھ گئے تھے۔

”ہاں۔ ہاں۔ وہیں لے جاؤ۔ کپڑے بدلنے ہوں گے۔ ان کا تو پسینے سے ناس ہو گیا ہو گا۔“

وہ بیگ گھسٹ کر مطلوبہ کمرے میں چلی گئی۔ کمرہ دیکھ کر اندازہ ہوا تھا کہ بے جی کا ہے۔

”واہ! اٹیچ ہاتھ۔“ مسرت کو خوشی تھی کہ کسی سے بھی ملنے سے پہلے نہانے کا موقع مل گیا۔ سفید ٹائلوں سے مزین ہاتھ روم چھوٹا، مگر خوبصورت تھا۔ ہر چیز موجود۔

”واہ! بے جی کے تو بڑے مزے ہیں۔“ اس نے یونہی چیک کرنے کو ایک دوئل کھولنا چاہے کہ اوپر سے پانی کی پھوار برسی اور اسے سر تپا بھگو گئی۔ وہ یہ دیکھنا بھول گئی کہ اوپر شاور بھی لگا ہے۔ شاور بند کرنے کی کوشش میں سارے قفل کھل گئے۔ اور وہ کپڑوں سمیت شاور ہو گئی۔ بمشکل تل بند ہوئے تو نہی آنے لگی۔ خوب نہا کر ہلکی پھلکی ہو گئی۔ سب سے اچھا سوٹ نکال کر پہنا۔ اب مسئلہ تو بھیجے کپڑوں کا تھا۔ سوکھے ہوتے تو بیگ میں گھسائی۔ ان میں سے تو پانی نپک رہا تھا۔ اس نے غصے سے شاور کو گھورا، کپڑے خوب نچوڑے۔

اک دروازہ دوسری طرف بھی تھا۔ اس نے بے حد آہستگی سے دروازہ کھولا تو بائیں پھیل گئیں۔ یہ چھوٹا سا صحن تھا۔ پانی کی موٹر کپڑے سکھانے کے لیے باندھی گئی تاریں، واشتک مشین اور نجانے کیا کیا الم غلم۔

اس نے جھٹک جھٹک کر کپڑے پھیلائے۔ اطمینان سے مڑ کر دروازہ کھولنا چاہا تو دروازہ بند تھا۔ یقیناً اندر سے لاک لگ گیا۔

”ہائے اللہ! میں تو گوڈے گوڈے مصیبت میں پھنس گئی۔“ وہ ماتھے پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔ ”اب کیا کروں؟ دروازہ کھٹکھاؤں۔“

اس نے مڑ کر دیکھا۔ صحن میں کئی کمریوں کی کھڑکیاں تھیں۔ سب کی سب بند۔ اس نے ناک چپکا چپکا کر اندر جھانکنے کی کوشش کی۔ مگر بے کار، اندر اندھیرے میں کچھ بھی واضح دکھائی نہ دیتا تھا۔ ان سے آگے دو دروازے تھے۔ یقیناً ۱۳۱ میں سے کوئی دروازہ سامنے کے حصے میں نکلتا تھا۔

”نجانے کس کا کمرہ ہو؟“ دروازے کے ہینڈل پر ہاتھ رکھے وہ سوچنے لگی۔

”اوئے۔ کون ہے؟“ نجانے کس طرف سے للکار آئی۔ وہ جھٹ سے دروازہ کھول کر اندر کود گئی۔ وسیع کمرہ۔ جس کے دوسری طرف بھی دروازہ تھا۔ بڑے سے بیڈ پر دو دو محو خواب تھے۔ یہ سب تو دیکھا۔ بس یہی نہ دیکھا کہ قالین پر اک دروازے سے دوسرے تک آڑھی تر چھی، ٹیڑھی میزھی مخلوق خواب خرگوش کے مزے لے رہی تھی۔ اس نے تو بس سامنے دروازہ دیکھ کر دوڑ لگا دی۔ کسی کا ہاتھ پکڑا، کسی کا پاؤں۔ کسی کی شہ رگ ملی تو کسی کے سینے پر مونگ دلتی وہ دوسرے دروازے تک پہنچی۔

ہائے۔ میرا پاؤں۔

میرا ہاتھ۔

”میں۔ میں۔“ جس کی شہ رگ پراڑی پڑی تھی۔ وہ میں، میں کرتی رہ گئی۔ اس نے جھٹ سے دروازہ کھولا اور دوسری طرف۔

بے جی نے سراٹھا کر دیکھا۔ عقب میں آہو نکا۔ دروازہ بند ہوتے ہی دم توڑ گئی۔
 ”یہ تم گئی تو ادھر تھیں۔ آدھر سے رہی ہو؟“ انہوں نے تعجب سے پوچھا۔ ”یسا ہی گھر دیکھنے کا شوق تھا بیٹی! تو تھوڑا انتظار کر لیتیں میں کسی کو ساتھ کر دیتی۔“
 وہ شرمندہ سی سر جھکا کر ان کے پاس بیٹھ گئی۔

”سارا۔ سارا بیٹی۔“ بے جی نے پکارا تو اس نے دوپٹے کے نیچے سے اپنے الجھے ہیکے بال انگلیوں سے سنوارے۔

”ہیلو۔“

مست نے سراٹھا کر دیکھا۔ میک اپ سے مبرا تھتا ہوا چہرہ، یقیناً ”وہ کچن سے نکلی تھی۔ بالوں کو خوب سمیٹ کر بڑا سا بند پٹا ہار کھا تھا۔“

”یہ سارا ہے تمہارے تایا نوا کی لڑکی۔“

”السلام علیکم!“ مست نے ہاتھ بڑھایا تو اس نے ہاتھ میں پکڑا کفگیر مست کو تھما دیا۔ اس نے بے خیالی میں پکڑ بھی لیا۔

”کھانے میں کتنی دیر ہے؟“ بے جی نے پوچھا۔

”بس تیار رہی ہے۔ روٹیاں بنانے لگی ہوں۔“

وہ جواب دے کر مڑی، ٹھنک کر اپنے خالی ہاتھ کو دیکھا۔ پھر جھل سی ہو کر مست کے ہاتھ سے کفگیر لے لیا اور معذرت کرتی کچن میں جا گئی۔ آلو گوشت، اور کھیر تو دوپہر کے کھانے میں بنی تھی، ساتھ میں رائتہ اور سلاد اس نے جھٹ پٹ بنالیا۔ کھانا باپ بیٹی دونوں نے بی جی کے کمرے میں کھایا۔
 کھانے کے بعد ساجد علی تو مہمان خانے میں آرام کے لیے چلے گئے۔ مست کو بے جی نے سارا کے حوالے کر دیا کہ وہ اسے اپنے کمرے میں لے جائے۔

”تھوڑا سولو۔ شام کو سب سے ملاقات ہو جائے گی۔“

”آجائے۔“ سارا نے بے تکلفی سے کہا تو وہ اٹھ کر ساتھ ہوئی۔ کچن اور کمرے کے درمیان جو تھوڑی سی جگہ تھی وہیں سے میزٹھیاں اوپر جاری تھیں۔

”تم پہلی بار آئی ہو۔ اس سے پہلے کبھی دل نہیں چاہا ہم سے ملنے کو؟“

”آپ لوگ بھی کہاں آتے ہو۔“

”بس یار۔ مصوفیت۔“

”ہاں، ہم تو بالکل ویلے ہوتے ہیں۔“ مست نے دل میں سوچا۔ پھر مسکرائی۔

”بس۔ اس سے پہلے کبھی ابو جی نے کہا ہی نہیں۔ ورنہ میرا تو بہت دل چاہتا تھا آپ لوگوں سے

ملنے کا۔“

”ہاں پچھلی بار بچا آئے تھے تو بتا رہے تھے۔ تمہیں شہر دیکھنے کا بہت شوق ہے۔“ دونوں بیڑھیاں چڑھ کر اوپر آگئیں۔

”اف۔ بھلا یہ کہنے کی کیا ضرورت تھی۔“ مسرت جزبہ ہو گئی۔

”ہمیں بھی گاؤں دیکھنے کا بہت شوق ہے۔ بس اتفاق دیکھو کہ اتنا قریبی تعلق ہونے کے باوجود کبھی آنا ہی نہیں ہوا۔“ اوپر چھوٹے لیکن بہت سے کمرے تھے۔ سارا ساتھ ساتھ جتا جتا گئی۔

”یہ صدف آپنی کا کمرہ ہے۔“

”یہ میرا اور نایاب کا۔ تمہارا بیڈ کرن کے ساتھ لگا دیا ہے۔ وہ مریم اور مارہ شیر کرتی ہیں۔“ تبھی اک کمرے کے کھلے دروازے سے اک لمبا ڈنڈا نکلا اور سارا کی ناک چھو تا چلا گیا۔

”نایاب۔“ سارا چلائی۔

لمبا ڈنڈا کمرے سے باہر نکلتا چلا گیا۔ جس سے بچنے کی کوشش میں مسرت دیوار سے جا لگی۔ ڈنڈا ابھی گویا اسی کے تعاقب میں تھا۔ وہ جس طرف کھسکتی وہ اسی طرف ہو جاتا۔

”نیا کی بچی، خدا تمہیں سمجھے۔“ سارا نے دانت پیسے۔

ڈنڈے کے آخری سرے پر جو لڑکی سامنے آئی۔ اسے دیکھ کر مسرت کی آنکھیں کھلی کی کھلی رہ گئیں۔ صاف رنگت، مندی مندی سی آنکھیں، سر پر گھنگھریالے بالوں کا گھونسلہ، وہ بھی اتنا گھٹنا کہ چیل بھی انڈے دے کر خود ہی تلاش کرے۔

فرہی مائل وجود، درمیانی قامت، اس پر چھوٹی قمیص، تنگ پاجامہ، دوپٹہ غائب، یوں لگتا تھا مگدبے سے تکیے پر کھینچ کھانچ کر غلاف چڑھایا گیا ہے۔

”یا اللہ مہمانوں کے ساتھ ایسا سلوک۔“

”کون سے مہمان؟“ اس نے پوری آنکھیں کھولیں۔

”مسرت آئی ہے۔“ سارا نے اطلاع دی۔

”ہائے۔“ اس نے ایک ہاتھ سے گھونسلہ بٹھانے کی کوشش کی۔

”میں نایاب ہوں۔“

”ہائے۔“ اس وقت تم نایاب ہی لگ رہی ہو۔ اہرام مصر سے بھی ایسی چیز نہ برآمد ہوئی ہوگی۔“ سارا نے تہقہ لگایا تو وہ جھل سی ہو گئی۔

”اپنا حلیہ دیکھا ہے۔ کسی باورچن کی اولاد لگ رہی ہو۔“

”اولاد کیا؟ میں تو ہوں ہی باورچن۔ بارہ میں سے گیارہ گھنٹے تو میرے بچن میں گزرتے ہیں۔“ اس نے

لاپرواہی سے مسرت کو بتایا۔ جو گنگ سی کھڑی تھی۔

”یہ تم اس شکروپہر میں ڈنڈے کے ساتھ کیا کر رہی ہو؟“

”گنگ فوسیکھ رہی ہوں۔“

”جیکی چن کی نئی فلم دیکھی ہے؟“

”اُمارے ایسے نصیب کہاں۔ اسٹور میں جالے بہت ہو گئے تھے سوچا۔“

”یہوں کہو۔ کوئی ایسا افسانہ پڑھ لیا ہے۔ جس کی ہیروئن بہت سکھڑ ہے۔“

”تم اتنی حواس باختہ کیوں ہو رہی ہو؟“ اپنی تجالٹ مٹانے کو نایاب مسرت کی طرف متوجہ ہوئی۔
”اُگرمی اور سفر نے تھکا دیا ہے۔ آرام کرے گی تو ٹھیک ہو جائے گی۔“ سارا اسے لیے ایک کمرے میں
”اُگرمی۔ محدود جگہ پر کمرے ہی کمرے تھکن اور جس کا احساس پیدا کرتے تھے، لیکن فی الحال اسی سے خاصا
متاثر ہوئی کہ ہر کسی کے پاس اپنا الگ کمرہ تو ہے۔

لمرہ خوبصورتی سے سجایا گیا تھا۔ ایک طرف سنگل بیڈ، دوسری دیوار کے ساتھ فرش پر فوم بچھا تھا۔
”اس پر خوبصورت چادر اور تکیے وغیرہ پڑے تھے۔ درمیان میں جو جگہ بچی تھی وہاں دیوار کے ساتھ بک
ریک تھا۔ سامنے دیوار گھبرالماری جو غالباً ”کپڑوں وغیرہ کے لیے تھی۔ ریک کے اوپر کالج کی تصاویر دیوار
پر کڑیا کی شکل کا کلاک“ اور قدرتی آبشاروں والی تصاویر لٹکی تھیں۔

”اب کچھ دن تو رکو گی

”ہوں۔“ وہ جو کمرے کا جائزہ لے رہی تھی، چونک کر پلٹی۔

”تم آرام کرو۔ شام میں سب سے ملاقات ہو جائے گی۔“ سارا کے جانے کے بعد وہ بیڈ پر بیٹھ گئی۔
”کہاں گئیں وہ مسکی مسکی خوشبوؤں میں بسی فیشن ایبل لڑکیاں، ان سے بہتر جیلے میں تو میں اپنے گھر
میں پھرتی تھی۔ عجیب ہی لڑکیاں ہیں۔ بولتی کتنا ہیں، اباجی تو کہتے تھے، بہت پیاری ہیں، خاک۔ مجھ سے
زیادہ تو نہیں، ایک کا تہہ چھوٹا ہے اور دوسری۔ بس ٹھیک ہی ہے۔“

سامنے دیوار گھبر بڑا سا آئینہ لگا تھا۔ ساتھ میں چھوٹے سے ریک پر ضرورت کی چیزیں۔ اس نے
کھڑے ہو کر اپنا جائزہ لیا۔ کھلا کھلا شاداب چہرہ، وہ کچھ مطمئن سی ہو کر بیڈ پر لیٹ گئی۔ جانے سے قبل سارا
پنکھا فل رفتار میں چلا گئی تھی۔



ہلکے ہلکے میک اپ میں فریش چہرے کے ساتھ وہ نیچے چلی آئی۔ دو گھنٹے کی نیند نے طبیعت پر اچھا اثر
ڈالا تھا۔ برآمدے میں بے جی بیٹھی تسبیح کر رہی تھیں۔ مسرت کو سمجھ میں نہیں آیا کہ اتنی گرمی میں وہ
یہاں کیوں بیٹھی رہتی ہیں۔ اگرچہ برآمدے میں ایریز کو لڑ چل رہا تھا۔

”کیا ہوا نیند نہیں آئی؟“

”سو لیا بے جی۔“ وہ آہستگی سے کہہ کر بیٹھ گئی۔ گھر میں چھایا سناٹا تھا ابھی بھی شام کا آغاز نہیں

ہوا۔ بے جی اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتی رہیں۔

”مزے ہیں شرابیوں کے، شام ڈھلے تک سوئیں یا دن چڑھے تک، کوئی پوچھنے والا ہی نہیں۔“ وہ دل

ہی دل میں سوچ رہی تھی۔

سب سے پہلے سارا ہی اٹھی، شاید وہ نماز آئی تھی، اس کے بے حد گھنے سیاہ بے بال کمرے نیچے تک

جار ہے تھے۔ سب بہنوں میں سے اسی کو بال بڑھانے کا شوق تھا۔ بے جی اس کے بالوں کے لیے دسی ٹونکے بنانے کے لیے ہمہ وقت تیار رہتیں۔ وہ بھی عملدرآمد کرنے میں ذرا تاخیر نہ کرتی۔ ایم ایس سی میٹھس کے بعد وہ اوپن یونیورسٹی سے بی ایڈ کر رہی تھی۔ عملاً ”سارا گھر اسی کے بل بوتے پر چل رہا تھا۔ متناسب قد و قامت، صاف رنگت والی بے حد ایکٹو لڑکی تھی۔

”اٹھ گئیں مسرت۔“ اس نے بے حد اپنائیت اور شائستگی سے پوچھا۔

”وہ تو کب کی اٹھ گئی۔ مگر یہ ہمارا نیاں اب انھیں گی یا اے۔ سی کے سامنے خراٹے ہی لیتی رہیں گی۔ غضب خدا کا جو ان جہان بچیوں کی مائیں یوں منہ کھولے سوتی ہیں گویا سب ذمہ داریوں سے سبکدوش ہو گئیں۔ اب تو چھوٹی بھی تھڑا یہ نہیں آگئی۔“

”تو کیا کریں؟“ عالیہ ان کی چھوٹی بہو نے انٹری دی۔

”ان کو پھانسی چڑھا دیں یا خود چڑھ جائیں۔ جو ان بیٹیوں کی ماؤں کو سونا حرام ہے۔“

مسرت نے سپٹا کر اپنی چھوٹی تائی کو دیکھا۔

”اے بی! تم تو میرے منہ نہ لگو۔ اے۔ سی کے سامنے سے یوں اٹھتی ہو۔ گویا انگیٹھی پر بیٹھی ہیں۔“ بے جی نے چڑکھ بولا۔

”ماں، بیٹیاں شرط لگا کر سوتی ہیں۔ کسی کو خبر ہے کہ گھر میں مہمان آئے ہیں۔ پر یہاں تو چائے پانی پوچھنے

کا رواج بھی گیا۔ الٹا۔ صغریٰ سے کہہ کر شربت بنوانا پڑا۔“

تب ہی عالیہ کی نگاہ مسرت پر پڑی تو کھسیانی سی ہو گئیں۔

”اچھا۔ اچھا۔ یہ مسرت ہے ماشاء اللہ رنگ روپ بھی خوب ہے اور قد بھی اچھا نکالا ہے۔“ وہ اٹھ

کر ملی تو انہوں نے بے ساختہ تعریف کی۔

”اب ہمیں کیا خبر تھی کہ مہمانوں کو آج آنا ہے۔ مانو جاگ رہی تھی اس سے کہا ہوتا۔“

”وہ تمہاری ماں بی! دس روپے مانگ کر جن کی طرح غائب ہوئی۔ سارا کو جگانا پڑا۔ تب مہمانوں کو

کھانا ملا۔“

بے جی نے نوٹھے پن سے کہا۔ گھر میں شام کی چم چم پھل شروع ہو گئی۔ کرن اٹھی، سلام بھاڑا۔

جھومتی جھامت جھامت روم میں گھس گئی۔ موہم آئی تو بے جی کے پاس ڈھیر ہو گئی۔ وہ اور مارہ کلاس فیلو

تھیں۔ اسے جب تک چائے کا کپ نہ ملتا وہ یہاں سے اٹھ بھی نہ سکتی تھی۔ مسرت سے بھی اسی سوئے

جاگے انداز میں ملی۔

”ہنا صرف۔ سو رانی! اب اٹھ جاؤ کہ روز حشر اپنے نامہ اعمال کے ساتھ اٹھنے کا ارادہ ہے۔“ بے جی نے

اپنی ہونہر ایک کوپکارنا شروع کیا۔

کمرے کا دروازہ ٹھک سے کھلا اور اس میں سے چھوٹے قد کی فریبی مائل خاتون لڑھکتی ہوئی بوکھلائی

سی برآمد ہوئیں۔

”ماں جی! کیا ہو گیا؟“

”اماں جی کو کچھ نہیں ہوا۔ تم نے کیا رات کو پہرہ دیا ہے۔ جو شام ڈھلے تک سو رہی تھیں۔ سارے فساد کی جڑ تو یہ اے۔ سی ہے جس دن سے آیا ہے۔“

”دادی جان! سارا غصہ تو یہ ہے کہ اب آپ کو یہاں شفٹ ہونا پڑا ہے۔ کیونکہ اے۔ سی کی ٹھنڈک میں آپ کے سارے جوڑے جڑ جاتے ہیں۔“ اوگھتی ہوئی مریم نے وجہ بیان کی اور ساتھ ہی دہائی دی۔
”کوئی پگھلائی تیز کر دے۔ اف کیسی گرمی ہے۔“

بات سچ ہی تھی۔ پہلے بے جی بھی سب کے ساتھ ہال کمرے میں ہی موجود ہوتی تھیں۔ اے۔ سی کی وجہ سے اپنے کمرے میں اور وہاں دل گھبرا تا تو برآمدے میں شفٹ ہو جاتیں۔
”میں نے ساری دوپہر جاگ کر آپ کے دوپٹے پر کرڈیے کی تیل بنائی ہے۔ ابھی گھنٹہ بھر پہلے تو آنکھ لگی تھی۔“ ناصرونے وضاحت کی۔

”کوئی اس کو بھی نکالے حجرے سے۔ اگر حفظ ہو گیا ہو تو نیچے تشریف لے آئے۔“
بے جی نے کہا تو کسی نے جواب نہ دیا کہ سب کی توجہ سارا کی طرف تھی۔ بلکہ سارا سے زیادہ اس کے ہاتھوں میں موجود ٹرے پر تھی۔ عدیل اور عمیر کے سوا سب ہی چائے کے رسیا تھے۔ چائے کی خوشبو نایاب کو بھی نیچے کھینچ لائی۔ آنکھوں میں سرخی، طبیعت میں کسلندی! جو ساری دوپہر اوپر کے کمرے میں جہاں کا پگھلا ہوا سے زیادہ پھونکیں مارنے پر اکتفا کرتا تھا۔ وہاں بیٹھ کر شعلہ اور خواتین ڈائجسٹ کے مطالعہ کا نتیجہ تھا۔ گھر میں صرف نایاب اور کرن ہی تھیں۔ جنہیں ڈائجسٹوں کا جنون تھا۔ بلکہ نایاب تو ہیروئن کے کپڑوں کی تفصیل سن کر فوراً ”اپنے کپڑے ڈیزائن کرنے لگتی، جس کے نتیجے میں وہ شاہکار تخلیق ہوتے کہ مقدر میں صرف۔ بے جی کی ڈانٹ پھٹکار ہی رہ جاتی تھی۔ بے جی اس کمرے کو نایاب اور کرن کا حجرہ قرار دیتی تھیں۔

”ہائے ایوری باڈی۔“
عدیل مزے سے مسرت کے برابر میں براجمان ہوا، وہ بوکھلائی تو وہ اجنبی صورت دیکھ کر اچھل کر پیچھے ہوا پھر اشاروں سے عمیر سے پوچھنے لگا۔ وہ بھی لاعلم تھا۔ سو کندھے اچکا کر پوچھنے لگا۔

”سنا ہے چچا ساجد تشریف لائے ہیں۔ کیا خالی ہاتھ ہی آگئے؟“
”تو کیا ہاتھ ساتھ لاتے۔“ عالیہ نے گھورا۔

”کوئی خروڑے کا ٹوکرا۔ کوئی تروڑ کی بوری۔“
”تمہارا سر۔“ سب نے دانت پیس پیس کر اس بری طرح گھورا کہ وہ سٹپٹا کر پوچھنے لگا۔

”کیا ہوا؟“
”کھلاپت۔“ (بالکل بیٹا) بے جی ہنس دیں۔ پھر مسرت کی طرف اشارہ کر کے بتایا۔

”یہ تمہارے ساجد چچا کی بیٹی ہے۔“
عمیر جی بھر کر شرمندہ ہوا، جبکہ عدیل اچھل پڑا۔

”اے! یہ کہاں سے پیدا ہوئیں۔“ اس کے حد درجہ نامعقول سوال پر سارا نے اسے اک دھپ رسید

کی۔

”پہلے یہ بتاؤ یہ دوپہر میں کون بے نیتھے تیل کی طرح ہال کمرے میں آگھسا تھا۔ میرا پیر کچل کر رکھ دیا۔“
مریم کی حیات چائے کے ہر گھونٹ کے ساتھ جاگنے لگیں۔

”ہائے۔ میرا بازو۔“

”افس۔ میرا گلہ۔“

”وہ بے نیتھا تیل، پچھلے صحن میں گھوم رہا تھا۔ میں نے ذرا لکارا تو کمرے میں جاگھسا۔“ عدیل کی شرارت بھری آواز پر مسرت کا دل چاہا۔ پلنگ کے نیچے جاگھسے۔ یوں بھی اتنے سارے لوگوں میں وہ پزل سی ہو گئی تھی۔

”مساجد چچا اکثر تمہارا ذکر کرتے تھے۔ پچھلے دنوں آئے تو کہنے لگے۔ مسرت کو شہر دیکھنے کا شوق ہے۔“
نجانے کون بولی تھی۔

”اف! بوجی نے خوب ہی شہرت کرائی ہے۔“ مسرت جڑبڑہو گئی۔

”حالانکہ شہر میں دیکھنے کو ہے ہی کیا؟“ عقب میں کھڑے عدیل نے لقمہ دیا۔ ”گاؤں میں البتہ بہت کچھ ہو گا۔ کھیت کھلیاں، سرسوں کے پھول، نیلے نیلے پھول کا ٹھنڈا پانی۔“

”ہونہ گائے کا گوبر، مکھیاں، مچھر، کچی پکی ٹوٹی پھوٹی سڑکیں۔“ مسرت نے جل کر سوچا۔

”سنائے گاؤں میں آسمان بہت نیلا ہوتا ہے اور رات کو بے تحاشا ستارے چمکتے ہیں۔“

(آوارہ کتے دیواریں پھلانگ کرتے ہیں، اگر بد قسمتی سے کوئی برتن باہر رہ جائے تو منہ میں دبا کر بھاگ جاتے ہیں۔) اس نے پھر سوچا۔

”یار! ابھی بچپن میں ہی گاؤں گئے ہوں گے۔ ان چشموں میں بنائیں پروگرام؟“ عدیل نے جوش سے کہا۔

”پہلے اس کو تو شہر دکھا دو۔ پھر بنالینا پروگرام۔ عمیر! دیکھو تمہارے بچا اٹھ گئے تو انہیں بھی چائے دے آؤ۔“ بے جی نے کہا تو اس نے دہائی دی۔

”خالی چائے۔ کیا کچن میں قحط آپڑا ہے۔“

”آرہی ہوں نریدو۔“ سارا دوبارہ چلی آئی۔ کباب کے ساتھ املی کی چٹنی، ساتھ میں پیاز تھے۔

”آپا۔ سہمان کے صدقے ہمارے بھی مزے آگئے ورنہ آپ تو صرف پیاز پر ہی ٹرخا دیتی تھیں۔“

عمیر نے بھول پن سے کہا۔ سب نے اسے بری طرح گھورا تو دھڑائی سے بولا۔

”میں کون سا جھوٹ بول رہا ہوں۔“

”دو کلو قیمہ ہو تب پورے ٹبر کو کباب پورے آتے ہیں۔ گوشت کیا بھاؤ مل رہا ہے۔ پتا بھی ہے میں

نے ہی روک رکھا ہے۔ فضول کا خرچہ۔“ بے جی نے کہا۔

”میں نے کہا۔ عدیل نے کچھ کہنا چاہا۔ پھر سب کی طرف دیکھا۔ ”ان کا اسم گرامی۔“

”مسرت۔“ نایاب نے بتایا۔

”سنو۔“ مسرت منمنائی۔ شر آکر نامید لے کا ارادہ خاص پر انا تھا۔
 ”اس۔“ سب نے ایک دوسرے کی طرف دیکھا۔ پھر کورس میں پوچھا۔ ”سنو؟“
 ”سنو۔“ سب مجھے گھر میں سونو کہتے ہیں۔“ مسرت نے کمال دھناتی سے جھوٹ بولا۔
 ”ماشاء اللہ ماشاء اللہ۔ کیا خوبصورت اسم گرامی ہے۔“ عدیل پھڑک اٹھا۔
 ”سنو! میرے دل کی صدا۔“

”وہ سنو ہے۔“ سارا نے اس کے کندھے پر دھپ رسید کی۔ وہ جوالی کی چٹنی میں کباب ڈوبنے جا رہا تھا۔ پورے کا پورا کباب پیالی میں دیکھ کر سردی آہ بھر کر رہ گیا۔
 ”یہ نہ تھی ہماری قسمت کہ وصال کباب ہوتا۔“
 ”تمیز سے کھاؤ۔“

”وہ کیسے کھاتے ہیں۔“ اس نے معصومیت سے کہا، پھر پکارا۔ ”سنو۔“
 ”جی۔“ مسرت بے خیالی میں بول اٹھی۔
 نہیں، یہ دوسرے والا سنو ہے۔“ آنکھوں میں بلا کی شرارت تھی۔ ”سنو! یہ کچھ کباب ہمیں بھی مرحمت فرمادیں۔“

”آپ میرا مذاق اڑا رہے ہو۔“ مسرت کو غصہ آگیا۔
 ”توبہ۔“ توبہ میری اتنی جرات۔“ وہ ناک سے لکیریں کھینچنے پر تیار ہو گیا۔
 عالیہ نے جل کر چار کباب ایک پلیٹ میں رکھے۔ پھر عمیر کے ہاتھ میں تھماتے ہوئے بولی۔
 ”تم دونوں یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“
 ”کہاں؟“

”اپنے کمرے میں۔“
 ”بس یہی؟“ عمیر نے انگلی سے چار کباب گن کر پوچھا۔
 تب ہی ساجد علی وہاں آگئے۔ سب نے انہیں کورس میں سلام کیا۔ انہوں نے فردا ”فردا“ سب کو پیار دیا۔

”بیٹھ جاؤ ساجد بیٹھے چائے لوگے یا ٹھنڈا۔“
 ”صرف اجازت لوں گا۔ کافی دیر ہو گئی ہے۔“ انہوں نے معذرت کی تو بے جی نے بھی اصرار نہ کیا کہ زیادہ دیر ہو جاتی تو گاؤں جانے والی بوئین نہیں ملنا تھی۔
 ”اچھا مسرت بانو۔“ ساجد علی ابھی یہیں تک پہنچے تھے کہ کسی کے ہاتھ سے کباب چھوٹا، تو کسی کی چائے پھلک گئی۔ اور مسرت کا جی چاہا ابا کے منہ پر ہاتھ رکھ دے۔ وہ بغیر سرائٹھائے بھی سب کے لبوں پہ مسکرائیں دیکھ سکتی تھی۔

”توبہ ہے ابا جی۔“ جب بھی کروانا گوڑے گوڑے شرمندہ کروانا۔“ وہ منہ ہی منہ میں بدبوائی۔
 ”کچھ مجھ سے کہا؟“ ساجد علی نے چونک کر پوچھا۔

”نہیں جی اماں کو میرا سلام کہئے گا۔“
 ”اچھا۔ میں اگلے جمعہ کو آؤں گا۔“ وہ سب سے مل کر چلے گئے۔
 ”یہ صدف کہاں ہے؟“ بے جی کو خیال آیا کہ پوتیوں میں ایک کم ہے۔
 ”سہیلی کی شادی میں گئی ہے۔“ عالیہ نے بتایا۔
 ”ہاں بھولیاں ایک ایک کر کے سب کی سب بیاہی گئیں اور یہ ہیں کس۔“ بے جی بیڑا نہیں۔
 ”پتا ہے کیسے بیاہی گئیں اور کن کے ساتھ بیاہی گئیں۔“ عالیہ چمک کر بولیں۔
 ”اے لے لے پتو بہت، لیکن اپنی نازوں پٹی بیٹی یونہی کسی کے حوالے ہم سے تو نہیں کی جاتی۔ کسی کی
 تنخواہ کم، کسی کی شکل کوئی میٹرک، ایف اے پاس، ہونہ، یہ تو بیٹیوں کو پھینکنے والی بات ہوئی۔“
 ”اتنی گرمی میں شادی۔“ کرن نے بات کا رخ پھرنے کی کوشش کی۔ جبکہ بے جی نے شاید مسرت کی
 وجہ سے عالیہ کے خیالات پر تبصرہ کرنے سے گریز کیا۔
 ”ہاں لوگوں کو جون جولائی میں بھی چھین نہیں۔“ عالیہ کے لہجے میں ہلکا سا حد در آیا۔
 ”اتنی گرمی میں چائے پی جاسکتی ہے تو شادی بھی کی جاسکتی ہے۔ اے سارا بیٹی! مجھے تو ایک گلاس
 مسکنجین بنا دے۔ ہم سے نہیں اتنی گرمی میں کلجہ جلایا جاتا۔ اس کام کے لیے تمہاری چچی کی باتیں ہی
 کافی ہیں۔“ بے جی نے جل کر کہا۔
 ”تو ایک گلاس سے کیا ہو گا پورا جگہ نہوائیں۔“ ماہرہ کھلکھلائی تو عالیہ نے بیٹی کو بری طرح گھورا۔ پھر
 نایاب کو گھر کا جو چیکے چیکے چوٹھا کباب اٹھانے جاری تھی۔
 ”ٹھونے جاؤ گی۔ اٹھ کر اپنے ابو کے کپڑے استری کرو۔“
 ”چائے تو پینے دیں۔“ اس نے بد مزہ ہو کر کپ اٹھا لیا۔
 ”اے بچی! تم کیوں نہیں چائے لے رہیں۔“
 ”توبہ! چائے پی کر میں نے رنگ کالا کرنا ہے۔“
 اس نے دل میں سوچا مگر بولی کچھ نہیں۔
 ”اچھا اچھا۔ سارا مسکنجین کا جگ ہی بنا لو۔“ بے جی نے آواز دی تھی۔



”اف اللہ! یہ لڑکا ہے؟“
 اسٹیج پر آتے دو لہما کو دیکھ کر صدف چارٹ اوپر اچھلتی، جو اس کے کندھے پر صبیحہ کا بھاری بھر کم بازو نہ
 پڑا ہوتا۔
 ”یہی لڑکا ہے۔“ صبیحہ نے کہا اور اس کے کندھے پر سر رکھ کر زور و شور سے ہنسنے لگی۔ صدف نے اپنی
 کرسی سمیت تل کر رہ گئی۔
 ”ایکسکیوز می۔“ صدف نے بمشکل اسے خود سے دور کیا۔

”فروا کو شادی کے لیے یہی چیز دستیاب ہوئی۔“

”آخر اس کو سو جھی کیا۔“

”وہ بھی کیا کرتی۔ شادی کے لیے آج کل یہی دستیاب ہے۔“

”آخر۔۔۔“ آپ اسٹک ٹھک کرتی فروزاں تنک کر کہنے لگی ”وہ اچھے اچھے لڑکے کیا ہوئے۔“

”طاق نسیاں ہو گئے۔“ ۴۔ ”نجم نے آہ بھری۔

”مطلب؟“ ساری گردنیں اس کی طرف مڑیں۔

”مطلب۔“ وہ ایک پل کر گڑبائی۔ ”خاندان والے لے اڑے۔“

”اور ہمارے خاندان کے اچھے لڑکے!“ مارے غصے کے فروزاں نے اپنی ہیل سے اس کا پاؤں پکچل ڈالا۔

”باہر والے لے اڑے۔“ مارے تکلیف کے انجم نے چیخ کر جواب دیا۔ نجانے کس کس نے مرکز

دیکھا۔

”تف ہے ایسے خاندان پر۔“

”تف ہے ایسے لڑکوں پر۔“

”ہاں۔۔۔ ہاں ایسے لڑکوں پر۔۔۔ جنہیں ہم جیسی خوبصورت، طرحدار اور اسارٹ لڑکیاں نظر نہیں

آتیں۔“ صبیحہ نے آہ بھری۔

سب کے منہ باجماعت کھلے تو وہ گڑبائی۔ ظاہر ہے اپنے اسی کلو وجود کے ساتھ اگر وہ اسارٹ تھی تو پھر

ڈکشنری میں اسارٹس کے معنی بدل دینے چاہیے تھے۔

”یہ خود پر سے تھوڑا گوشت گھٹا لو تو شاید کسی کی نظر کرم ہو ہی جائے۔۔۔ ورنہ بارہ من کی دھوین لے جا

کر کسی نے مرنا ہے۔“ ۴۔ ”نجم نے ناک چڑھا کر چوٹ کی۔ صبیحہ تڑپ کر سیدھی ہوئی۔

”تم نے تو جم بھی جوائن کیا تھا۔۔۔ تم پر نظر کرم ہو گئی؟“

”ہاں تو اور کیا!“ ۴۔ ”نجم نے ڈینگ مارنا چاہی۔ صبیحہ نے درمیان ہی سے جملہ اچک لیا۔

”ہاں پھپھو کے دیور کی۔ جو چپاس کی دہائی چھو رہے تھے۔ ایک بیوی بھی بھگتا چکے تھے۔“ ۵۔

”اچھے خاصے ڈینٹ تھے۔ بیوی ہی بد مزاج تھی۔“ ۴۔ ”نجم کھیا کر بولی۔

”تو یڈ کیوں نہ بچوایا؟“

”بس۔۔۔ مجھے ہی کچھ پسند نہ آئے۔“

”ہا۔۔۔ ہا۔“

”زلزلہ آگیا تو پجاری فروا کی شادی رہ جائے گی۔۔۔ خدا کے لیے ہنسنا بند کرو۔“ فروزاں نے منت کی۔

تو ادھر ادھر جھولتی صبیحہ سنبھل گئی۔ جبکہ انجم دانت پیٹتے ہوئے سوچ رہی تھی۔ محلے داری کا یہی نقصان

ہے۔۔۔ ہر بات ہر کسی کے سامنے آجاتی ہے۔

”خیر۔۔۔ ہمارے خاندان میں تو کوئی ڈھنگ کا پر پوزل ہے ہی نہیں۔“ صدف نے ایک ادا سے اپنے

بالوں میں ہاتھ پھیرا۔

”ہونہ۔۔۔ ایڈی ڈیانا۔“ سب صدف کی اس ادا پر جل بھن گئیں۔ کچھ اپنی فریش کنگ اور دلکش نقوش کے ساتھ وہ سب میں یک اور اسمارٹ لگ رہی تھی۔ وہ مسیحاں تھیں۔ کوئیکز تھیں۔ لیکن اس ایک مقام پر آکر سب میں جلاپا شروع ہو جاتا۔ حالانکہ سب کا ماحول، مسائل، حالات ایک دوسرے سے مختلف تھے۔ مشترک تھا تو یہی کہ شادی کے لیے رائٹ مین دستیاب نہ تھا۔ وہی پڑھی لکھی، برسر روزگار لڑکیوں کا عام مسئلہ جس نے اس معاشرے کی بیشتر لڑکیوں کو اپنی پلیٹ میں لے رکھا تھا۔

وہ سب اسٹیج کی طرف متوجہ ہو گئیں۔ ہال میں رنگ و روشنی، خوشبوؤں کا سیلاب اُٹھ آیا تھا۔ وہ سب اپنے اندر کی ہلکی سی جلن، جو فروا کو اسٹیج پر دلہن بننے دیکھ کر پیدا ہوئی تھی اس پر قابو پائے خوش گچھوں میں مصروف تھیں۔ ابھی چند ماہ قبل فروا بھی ان کے ساتھ بیٹھی انہی کی طرح آہیں بھرتی تھی۔ پھر نجانے یہ کاٹھ کا الو (ان کے خیال میں) کہاں سے دستیاب ہو گیا کہ آج وہ ان کی کیشنگری سے نکل کر سب سے الگ اسٹیج پر ہر کسی کی توجہ کا مرکز بنی بیٹھی تھی۔

”تمہارے رائٹ مین کی کوالیفیکیشن کیا ہیں؟“ نجم نے سب کی طرف دیکھا۔

”اسمارٹ۔“

”بزنس مین۔“

”ہارٹ اسپیشلسٹ۔“

”ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ ہارٹ اسپیشلسٹ مل سکتا ہے۔“

”سٹاپ۔۔۔ تم۔۔۔“ نجم نے صدف کی طرف اشارہ کیا۔

”ہائیلی ایجوکیٹڈ گڈ لکنگ، اُن کا کماتا ہو کہ میری ہر خواہش پوری ہو سکے۔“

”گاڑی، بنگس۔۔۔“

”سکھو! کچھ نیچے آؤ۔۔۔ ایسے آرڈر پر بنے بنائے بندے کہاں سے ملیں گے۔“ ناجیہ کی آواز پر سب

نے پلٹ کر دیکھا۔

”میٹھا مائی اسپنڈل عدیل۔“

اس نے اپنے ساتھ کھڑے معقول سے انسان کی طرف اشارہ کیا۔ جو گڈ لکنگ بھی تھا اور شائستہ اطوار بھی رکھتا تھا اور ان سے مل کر حضرات کی طرف بڑھ گیا۔ ان میں سے کوئی بھی ناجیہ کی شادی میں شریک نہ ہو سکا تھا۔ لیکن سب ہی نے اسے پسند کیا۔

”ایسا ماسٹر ہیں کہاں سے ملا؟“ فروزاں نے حسرت سے پوچھا۔

”اپنے خاندان میں موجود تھا۔“ وہ ہنستے ہوئے ان کے قریب بیٹھ گئی۔

”کرتے کیا ہیں۔۔۔؟“

”فی الحال ڈھنگ کی جاب نہیں ملی۔۔۔ میڈیکل ریپ۔“ ناجیہ نے مختصر جواب دیا اور اسٹیج کی طرف دیکھنے لگی۔ سب نے معنی خیز نظروں سے ایک دوسرے کو دیکھا۔

”کوئی بات نہیں۔ کماء پیوی ہو تو گزارا ہو ہی جاتا ہے۔“

ناجیہ نے کوئی تبصرہ نہیں کیا۔ وہ اپنی سہیلیوں کے خیالات اچھی طرح جانتی تھی۔ چند ماہ پہلے تک خود اس کے بھی یہی خیالات تھے۔ پھر اپنی شادی شدہ بہنوں کو دیکھتے ہوئے اسے ایک بات تو ضرور ہی سمجھ میں آئی کہ کم از کم اس معاشرے میں بغیر شادی زندگی گزارنا خاصا دشوار امر ہے۔۔۔ پھر شادی نہ کرنے کی کوئی خاص وجہ بھی نہ تھی۔ اس نے اپنی زندگی نام نہاد آئیڈیلزم میں بڑ کر ضائع کرنے کے بجائے اک معقول انسان کا ساتھ قبول کر لیا۔۔۔ چھوٹی چھوٹی الجھنیں اپنی جگہ۔۔۔ لیکن اب وہ اک خوش و خرم زندگی گزار رہی تھی۔

”اؤ فروا سے مل لیں۔“ سٹیج پر رش کم ہوتا دیکھ کر ناجیہ کھڑی ہو گئی۔

فروا نے انہیں ولیمہ پر آنے کی تاکید کی۔۔۔ اس کے میاں نے بھی فروا کا ساتھ دیا۔

”ابھی سے مٹھی میں کر لیا ہے۔“ نجم اس کے کان میں ٹھسی۔ اس نے مسکرا کر ہاتھ دیا۔



رات دیر تک بے جی اسے اپنے پاس بٹھائے گاؤں کے ایک ایک فرد کے بارے میں دریافت کرتی رہیں۔ ساتھ ساتھ انہیں اپنا وقت بھی یاد آ جاتا۔ اسی میں اس کے پسندیدہ ڈرامے کی قسط بھی نکل گئی۔

جبکہ سب بی بی وی لاؤنجمیں خوش گہوں میں مصروف تھے۔

”السلام علیکم! تب ہی خوشبو کے جھوٹے کی طرح صدف چلی آئی۔“

”آگئیں سہیلی! کورخصت کر کے۔“ بے جی کے لہجے میں جو طنز تھا۔ اسے صرف صدف محسوس کر سکتی تھی۔ جبکہ مسرت مرعوب سی صدف کو دیکھ رہی تھی۔ اسٹائنلٹس ڈریس، نازک جیولری، ہاتھ میں موبائل، ہاتھ میں نازک پرس، خوشبو میں لسی۔

”یہی تو ہے شردی کڑی۔“ مسرت اسے یک ٹک دیکھے گئی۔ وہ بے جی کے طنز کو پی کر مسرت کی طرف متوجہ ہوئی۔

”مساجد علی کی لڑکی ہے۔“

”اوہ، پہلو، کیسی ہو۔۔۔“ اس کی آواز اس کی شخصیت کی طرح نازک اور ٹھنکتی ہوئی تھی۔

”جی اچھی ہوں۔“

”اتنی دیر کیسے ہو گئی۔“ بے جی نے پوچھا۔

”فنکشنزمیں دیر سویر تو ہو ہی جاتی ہے۔ پھر انجم کی گاڑی خراب ہو گئی۔“

”تم کیا رکھا لگا رہی تھیں۔“

”ہم اسی کی گاڑی میں آرہے تھے۔“

”سہیلی تمہاری تھی۔ شادی کیسے کر لی؟“ بے جی نے اک اور وار کیا۔

”کبھی کبھی عقل پر پردہ پڑ ہی جاتا ہے۔“ صدف نے متانت سے جواب دیا۔

”تمہاری عقل پر کب پڑے گا؟“ بے جی کہاں چوکتی تھیں۔

”آپ دعا کریں۔“ اس نے بروہاری سے کہا۔

”ارے میری دعاؤں میں اثر ہوتا تو کب کی اپنے گھریا کی ہو جاتیں۔“

”تب پھر سکون سے سو جائیں۔ میں بھی تھکی ہوئی ہوں۔“ وہ آرام سے کہہ کر مسرت کو اپنی شخصیت اور اعتماد کا اسیر کرتی چلی گئی۔

”کتنی خوب صورت ہیں۔“ مسرت زیر لب برزداؤی۔

”ہونہ۔۔۔ ماں کی طرح بے عقل، سہیلال یا ہایاہ کر تھکی نہیں۔۔۔ بیسیوں رشتے آئے۔۔۔ مگر ان کی ناک کے نیچے کوئی نہیں آتا۔ اللہ جانے کس خلائی مخلوق کا انتظار ہے۔“

”ان کے لیے تو کوئی شہزادہ آنا چاہیے۔“ مسرت نے دل میں سوچا۔

”اچھا بچی! اللہ۔۔۔ کہیں نہ کہیں تو نصیب کھولے گا ہی۔۔۔ جا مسرت بچے جا کر سو جا۔ بڑی دیر سے تجھے بٹھائے ہوئے ہوں۔“ انہوں نے ایک طویل سانس لے کر کہا تو وہ جلدی سے اٹھ کر لاؤنج میں آگئی۔

”ڈرامہ ختم ہو گیا۔“ اس نے کرن کے پاس بیٹھ کر پوچھا، ”کیوں اب تو کوئی ایوارڈ شو چل رہا تھا۔“

”کون سا ڈرامہ؟“

”پلیٹی وی کا وہ ”شیشے کا۔۔۔“

”پلیٹی وی۔۔۔ وہ کون دیکھتا ہے۔“ عدیل نے موقع سے فائدہ اٹھا کر چیل بدلایا۔

”ہمارے ہاں تو یہی چیل آتا ہے۔ یا پھر۔“

”کاکی! بھول جاؤ اس اولڈ چیل کو ہم تمہیں کچھ اور دکھاتے ہیں۔“

”کچھ اور کے بچے۔۔۔ یہ دو ادھر۔“ نایاب نے ریمورٹ ہتھیلیا۔ ساتھ ہی سارا نے اعلان کیا۔

”لڑکے یہاں سے دفع ہو جائیں۔“

”میں تو ابھی بچہ ہوں۔۔۔“ حمید جلدی سے بہن کو گود میں سوار ہو گیا۔ مگر بہن نے اتنے بڑے بچے

کو گود لینے سے صاف انکار کر دیا۔ سو وہ چاروں شانے چت قالین پر پڑا تھا۔ اتنی ساری لڑکیوں کے سامنے

دو لڑکے کیا ٹھہرتے۔۔۔ سو واک آؤٹ کر گئے۔

”اچھی سی فلم دکھاؤ۔“ مریم نے فرمائش کی۔ مشترکہ پسند سے اک فلم سلیکٹ ہوئی۔ مسرت کی دلی

مراد بر آئی تھی۔ فلم کے درمیان تک تقریباً ”سب ہی اٹھ گئیں۔ ماسوائے اس کے اور کرن کے جو شاید

موتاً“ رکی تھی۔

”اب سوئے چلیں۔“ ابھی اینڈ کے ساتھ فلم تمام ہوئی تو کرن نے اک لمبی سی جمائی لے کر پوچھا۔

”مسرت شرمندہ سی ہو کر اٹھ گئی۔“

”جی میں تو آپ کی وجہ سے بیٹھی تھی۔“

”کیا اسکرین سے ایک پل کے لیے آنکھ تم نے نہیں جھپکی اور میری وجہ سے رکی ہو۔۔۔“ کرن چیخی تو وہ

کھسیانی سی ہو کر اس کے ساتھ اوپر آگئی۔

صبح اس کی آنکھ مقررہ وقت پر کھل گئی کہ شروع ہی سے اماں تڑکے جگاڑا کرتی تھیں۔ ایک تو ویسے ہی آدمی رات گروٹیں بدلتے گزری۔ جس مگر می ٹوڈ شیدنگ اور بند کمرہ سے تو یوں ہی کھلے صحن میں تاروں بھرے آسمان کے نیچے سونے کی عادت تھی۔ اس کے ساتھ کرن کا بھی یہی حال تھا۔ جہاں بجلی بند ہوتی اس کی بیڑا نہیں شروع ہو جاتیں۔ واپڈا والوں کی شان میں قصیدے، چھڑوں کو کونے میں رات بیت جاتی۔

یہ اس گھر میں بلکہ شہر میں مسرت کی پہلی رات تھی۔ اس نے گردن گھما کر سوئی ہوئی کرن کو دیکھا۔ کمرے میں اس وقت صبح کی مخصوص ٹھنڈک کا راج تھا۔ سوہ گچھا سچھا ہو کر سو رہی تھی۔

”شہر میں لکٹا سورج کیسا لگتا ہو گا۔“

اسی سوچ اور تجسس میں اس نے بستر چھوڑ دیا۔۔۔ المیچ ہاتھ کی سہولت استعمال کر کے باہر نکل آئی۔ یہ دوسری منزل کا کمرہ تھا۔۔۔ یہاں صحن تو نہیں۔۔۔ ذرا سی ٹیرس نما جگہ ضرور تھی۔ مگر اسے ایسی ہوئی۔۔۔ بہت سے کھمبوں، تاروں۔۔۔ اور مکانوں کے بیچ طلوع ہوتا سورج کیسا بچارہ سا لگتا تھا۔ اسے بے اختیار دور تک پھیلے کھیتوں اور احمود کے باغوں پر سے طلوع ہوتا شاہ خاوری یاد آیا۔۔۔ کچھ دیر کھڑی دیکھتی رہی۔ پھر نیچے آگئی۔ لاؤنج خالی تھا۔ وہ برآمدے میں آگئی۔ جہاں بے جی تخت پر نماز کے بعد بیچ میں مصروف تھیں۔ اسے دیکھ کر ذرا سا مسکرائیں۔ مگر بولیں کچھ نہیں۔ آنکھیں موند کر پھر سے بیچ گھمائے لگیں۔۔۔ وہ خاموشی سے کھڑی انہیں دیکھنے لگی۔

تب ہی اس کے کانوں نے اک آواز سنی۔

وہ حیرت زدہ سی غور کرنے لگی۔

ٹائٹل سے ماحول میں کیسی مانوس سی آواز تھی۔ پھر آواز آتا بند ہو گئی۔

”اٹھ گئی مسرت بیٹی۔“ ٹائٹل کی آواز پر وہ پٹی۔۔۔ وہ کچن سے نکلی تھیں ہاتھ میں لی سے بھرا جگ اور گلاس، جو انہوں نے تخت کے پاس رکھ دیا۔

”جی۔۔۔ میں تو تڑکے ہی اٹھ جاتی ہوں۔“

”نماز پڑھ لی؟“

ان کے غیر متوقع سوال پر وہ گڑبڑائی۔ غصہ ہوا کہ ٹائٹل نے جواب کا انتظار نہیں کیا۔۔۔ بلکہ باقی پستی روحوں کو کونے لگیں۔۔۔ جو ابھی تک بستر میں ایندھ رہی تھیں۔ مسرت، ٹائٹل کے ساتھ ہی کچن میں چلی آئی۔ جہاں اس نے بجلی کی مدد مانگی اور چائی دیکھی۔۔۔ وہ آواز بجلی کی مدد مانگی تھی۔

”آئی۔۔۔ آپ بھی لی مانتی ہیں۔؟“ وہ حیران سی پوچھنے لگی۔ اس کا تو خیال تھا کہ یہاں صرف ڈبوں میں بند دودھ اور دی استعمال ہوتا ہو گا۔

”ہاں۔۔۔ سب ہی شوق سے پیتے ہیں۔“

انہوں نے سادگی سے ہٹا کر فریق سے دی کا باؤل نکال کر ایک طرف موجود چار کرسیوں والی چھوٹی سی

میز پر رکھا۔ آٹا وہ گوندھ چکی تھیں۔ آلیٹ کے لیے پیاز وغیرہ بھی کاٹ رکھی تھی۔
 ”لیجئے مہمان پہلے ہی کچن میں موجود ہیں۔“ سارا نے اندر آتے ہوئے کہا تو مسرت مسکرا دی۔
 ”بابی! میں مہمان تھوڑی ہوں۔“

اس نے آتے ہی ناصرہ کی سیٹ سنبھالی۔ آلیٹ بنایا۔۔۔ چھوٹے چھوٹے، پتلے اور خستہ پراٹھے تلے
 ۔۔۔ وہیں ناشتے کی میز پر ناشتہ کرتے ہوئے مزا آگیا۔
 ”سونو۔۔۔؟“ وہ بری طرح اچھلی۔ گھبرا کر ناشتے سے ہاتھ کھینچ لیا۔ جب کہ عدیل بے نیازی سے گنگناتا
 سارا کے پاس جا کھڑا ہوا۔

”میرے دل کی صدا۔۔۔“

”زبان بند رکھو۔“ سارا نے مسکراتے ہوئے ہلکا سا ڈانٹا۔

”میں نے کیا کہا۔۔۔؟“ اس نے حیرت سے پوچھا۔

”خدا خواہ۔۔۔ اسے تنگ مت کرو۔“ سارا بڑبڑائی۔

”ارے۔۔۔ میں تو گانا گا رہا تھا۔۔۔ کیوں مسرت خاتون۔۔۔ میں نے آپ کو تنگ کیا۔“ وہ معصومیت سے
 مڑ کر براہ راست اس سے پوچھنے لگا تو مسرت خاتون کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ اس نے گھبرا کر دوپٹ
 سنبھالا اور تیزی سے اٹھ کر باہر نکل گئی۔
 ”انہیں کیا ہوا؟“

جواباً ”سارا نے اس کے ہاتھ پر گرم چھچھو دے مارا۔

”خبردار جو اس نے چاری کے پیچھے پڑے۔“

”اس نے چاری کے لیے اپنے بھائی پر تشدد۔۔۔“

گھر میں صبح کی مخصوص گماگماہی تھی۔ بالا خرد دیر دیر سے ماند پڑ گئی۔ مسرت نے نما کر بڑے اہتمام
 سے اپنا پسندیدہ چوڑی دار پانسٹامہ اور کرتا پہنا۔ کچھ دیر بے جی کے پاس بیٹھی مگر ظاہر ہے عمر کے مطابق
 اس کا دل بھی لڑکیوں میں زیادہ لگتا تھا۔ وہ اپنی دھن میں اوپر چڑھنے لگی تھی۔ جب پانی کے زبردست ریلے
 نے اس کا استقبال کیا۔

”آ۔۔۔ آ۔۔۔ اس کی لمبی چیخ کے جواب میں اوپر سے ٹایاب نے جھانکا۔ پھر ہنس دی۔ اس کی ہنسی خوب
 صورت مگر بے تحاشا تھی۔

”ہو۔۔۔ ہو۔۔۔“ وہ ہنستے ہوئے ذرا سا آگے آئی۔ ”اوہ سونو! بابی گاڈ! میں نے جان بوجھ کر نہیں کیا۔“

”یہ کون سا وقت ہے میڑھیاں دھونے کا۔ جب بھی سونجھے گی، بے وقت کی سونجھے گی۔“ عقب سے آ
 کر سارا نے ڈانٹا۔

”اب مجھے کیا پتا تھا یہ تشریف لا رہی ہیں۔“ وہ مسرت کی حالت دیکھ کر اب بھی ہنس رہی تھی۔

”تمہیں ضرورت کیا تھی۔ ابھی نورائیں آکر صفائی کر دیتی۔“

”مجھے لگا، میں موٹی ہو رہی ہوں۔ اب یہ ایکس سائز تو میرے بس کا روگ نہیں۔ اس لیے میں نے سوچا۔۔۔ بے جی بھی راضی ہو جائیں گی اور سیڑھیاں بھی صاف ہو جائیں گی۔ نوراًں صاف تھوڑی کرتی ہے۔ بس کاروائی ڈال جاتی ہے۔ اتنی دھول مٹی۔ فرش کا تو رنگ ہی نظر نہیں آتا۔ تم مجھے اتنا گھور کیوں رہی ہو؟“

سارا کے اہلے دیدے دیکھ کر وہ گڑبڑائی۔
 ”سو نہ! ابھی نہ مار کر آئی تھی۔“ سارا نے بتایا۔ جبکہ مسرت بڑی بے چارگی سے اپنا بھگدا من نچوڑ رہی تھی۔

”تو کس احمق نے مشورہ دیا تھا کہ اتنی صبح نہاؤ۔“ نیا ڈھٹائی سے بولی۔

”بابی! آپ نے تو مجھے گوڑے گوڑے بھگو ڈالا ہے۔“

”بابی۔۔۔“ نیا لڑھکتی ہوئی نیچے آئی۔

”ان کو کیا ہوا؟“ مسرت بوکھلائی۔

”تم کپڑے بدل لو۔“ سارا نے اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”یہ سوٹ میرے نصیب میں نہیں ہے۔“ وہ بڑبڑاتی، پچتی بچاتی اوپر آئی تب ہی کمرے سے نکلتی صدف کو دیکھ کر ٹھٹھک گئی۔ سی گرین ساڑھی میں سانچے میں ڈھلا وجود، خوشبو میں بسی، اک ہلکی سی مسکراہٹ اس کی طرف اچھالتی وہ نیچے چلی گئی۔ وہ اس کے غائب ہونے تک مبسوت سی اسے دیکھتی رہی۔ پھر اپنے کمرے میں آکر کپڑے بدلنے لگی۔

”باقی تو ایویں سی ہیں۔ لیکن صدف بابی کی تو بات ہی کچھ اور ہے۔“

کپڑے بدل کر باہر نکلی تو سارا نیا کے کمرے کا دروازہ کھٹکھٹا رہی تھی اور اندر سے فل والیوم میں چلتے گانے کی آواز آرہی تھی۔

وہ حینہ وہ نیلم
 کر گئی کیسی جاؤ گری

”یہ کرن ہے۔“ سارا نے دروازہ پیٹ ڈالا۔ کیونکہ اک چھوٹا سا شیپ ریکارڈر صرف نیا کے کمرے میں تھا۔ سو جسے میوزک کا شوق پورا کرنا ہوتا۔ اسی کے کمرے میں جاتی۔ صدف کے کمرے میں جانے کی ہمت کس میں تھی۔

”کیا مصیبت ہے؟“ حسب توقع پسینے میں شرابور کرن سامنے تھی۔

”یہی تو تم سے پوچھنا ہے۔ کسی ڈانس کمپینشن میں حصہ لینا ہے۔“

”یو نہی یار۔۔۔! تھوڑا ویٹ بڑھ گیا ہے۔ سوچا ایکس سائز تو مشکل ہے۔ ڈانس آسان ہے۔۔۔ بندہ بور بھی نہیں ہوتا۔“ وہ ہانپتے ہوئے بتانے لگی۔

”یا الہی! خیر ہو۔ اس گھری لڑکیاں اتنی ویٹ کانفیشن کیوں ہو گئیں۔“ سارا نے گانے کا ولیم کم کیا۔
 ”تمہیں تو کسی بات کی خبری نہیں۔“ نیا ان کے پیچھے ہی چلی آئی۔ مسرت بھی ساتھ تھی۔
 ”بے جی نے صغریٰ خالہ کو بلوایا ہے۔ ان کے پاس کچھ اچھے رشتے ہیں۔“ نیا ایک آنکھ دبا کر بولی۔ پھر
 آئینے کے سامنے کھڑی ہو کر اپنا جائزہ لینے لگی۔ وہ پانچ فٹ کی گدبندی وریلی سی لڑکی تھی۔ اپنے سنہری
 گھنگھریالے بالوں کی دو چوٹیاں باندھے اس پر بے حد فٹنگ والی قمیص، تنگ پانچجامہ اس نے ہر زاویے
 سے اپنا جائزہ لیا۔ پھر کچھ مایوس سا ہو کر بوجھنے لگی۔
 ”سارا! میں اس سوٹ میں تھوڑی سی منظر کشی نہیں لگ رہی۔“
 سارا نے اسے سر تپا دیکھا۔ پھر واپس مڑتے ہوئے بولی۔
 ”تم اس سوٹ میں پوری کی پوری بطخ لگ رہی ہو۔“

”ہاں تو تم کیا کہہ رہی تھیں۔“ بے جی صغریٰ بی بی کی طرف متوجہ ہوئیں۔ ان کا بسکٹ غراب سے چائے
 کے کپ میں غائب ہو گیا۔ جسے نکالنے کی کوشش میں ناکامی کے بعد اس نے دوسرا اٹھالیا۔
 ”ایک رشتہ ہے۔ یہ بڑی ساری کوٹھی۔“
 ”اے صغریٰ بی بی! میں نے تمہیں پہلے ہی کہہ دیا تھا۔ یہ بڑی بڑی کوٹھیاں مجھے نہیں چاہئیں۔“
 ”بر کے ساتھ ساتھ اچھا گھر بھی مل جائے تو کیا حرج ہے۔ لوگوں کو تو برسوں بیت جاتے ہیں کرائے کے
 گھروں میں دھکے کھاتے۔ ان کی تو اپنی کوٹھی ہے۔ وہ بھی لڑکے کے نام۔“
 ”بی بی! ہمارے جیسے لوگ دکھاؤ۔ یہ کوٹھی والوں سے رشتہ ہمیں نہیں جوڑنا ساری عمر ہماری لڑکی کو
 میکے کے طعنے دیتے رہیں گے۔“ بے جی نے کہا۔
 ”اچھا! یہ ایک اور لڑکا ہے۔ رنج کے سوننا۔“

”ہم نے کیا اس سے فلموں میں کام کروانا ہے۔“ بے جی جل کر بولیں۔ ”ہزار بار بولا، ہمیں نہ تو بڑی
 بڑی کوٹھیوں کا لالچ ہے، نہ لمبی لمبی گاڑیوں کا، نہ ہمیں خوب صورت زنانی قسم کے لڑکے چاہئیں۔۔۔
 ہمارے جیسے شریف خاندانی لوگ ہوں لڑکا نہ متھے کا لگتا ہو۔ باکوار اور کمزور ہو۔ بس۔“
 بے جی نے صاف صاف بات کی، جس دن سے انہوں نے اپنی پوتیوں کے رشتے کروانے کا بیڑا اٹھایا
 تھا۔ صغریٰ کا اسی دن سے اس گھر میں آنا جانا ہو گیا۔ بے جی نے اسے دس رشتے کروانے والیوں میں سے
 پسند کیا تھا۔ وہ چھ چھوڑی ولا لچی نہیں لگی تھی۔ جو دے دیا خوش ہو کر رکھ لیا، نہ دیا تو نہ سہی، ان کی اس
 عادت کو لوگوں نے استعمال بھی کافی کیا۔ بڑے بڑے سبز باغ دکھا کر رشتے کروا لیے۔ بعد میں آنکھیں
 ماتھے پر رکھ لیں۔ وہ بچاری صبر و شکر کر کے اگلے گھر سدھا رہ جاتی۔
 ”اچھا پھر خسرو صاحب کا رشتہ سب سے مناسب ہے۔ میرے پاس اس کی تصویر بھی ہے۔“ صغریٰ

نے کچھ سوچ کر بتایا اور اپنی بٹاری کھولنے لگی۔ جس میں لڑکے لڑکیوں کی ڈھیروں تصاویر تھیں۔

”خسرو کی۔“

”اس کے بیٹے کی زبیر نام ہے۔ بچل کے محکمے میں کام کرتا ہے۔ اپنا مرغی خانہ بھی ہے اور اچھی خاصی زمین بھی۔ اپنا گھر اپنی موٹر سائیکل۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں گھر میں اللہ کا دیا اور بندوں کا خرید اسبھی کچھ ہے۔“

صغریٰ نے تصویر نکالی اور بے جی نے عینک۔

تصویر کا بغور معائنہ کرنے کے بعد لڑکا ٹھیک ہی لگا۔ مگر وہ اب بھی متفکر تھیں۔ وجہ صرف یہ تھی کہ ان کی اور عالیہ کی رائے کبھی ایک نہ ہوئی۔ بیٹے تو خیر بے جی کے سامنے چوں بھی نہ کر سکتے تھے۔ لیکن ہو اور اس کی تینوں بیٹیاں خاصی تیز تھیں۔

لڑکیاں خوب صورت بھی تھیں اور پڑھی لکھی بھی۔

صدف کالج میں پڑھا رہی تھی۔ نایاب ایم اے کے بعد فارغ تھی۔ مانو تو خیر تھوڑا سیر میں جانے کے باوجود ابھی تک پچہ پڑھی تھی لڑکیوں کے خواب تو اونچے تھے ہی، جہاں تک عالیہ کا سوال تھا تو انہیں اپنی بیٹیوں کے لیے کسی شہزادے کا انتظار تھا، جو کسی ریاست کا مالک ہو نہ ہو، پڑھا لکھا اور خوب صورت ہونے کے ساتھ ساتھ کوٹھیوں کا مالک ضرور ہو۔ ہر رشتے میں مین میخ نکالتے ہوئے نہ تو انہیں صدف کی بڑھتی عمر کا احساس ہوتا، نہ نایاب کا چھوٹا قد نظر آتا۔ سو بے جی اور ان ماں بیٹیوں کی رائے کبھی ایک نہ ہوئی۔

البتہ بے جی کا زور بڑی ہونا ضرور چلتا، جو پانچ بیٹیوں کی ماں ہونے کی وجہ سے ہمہ وقت ہولائی ہولائی سی رہتیں۔ ان کی پانچوں بیٹیاں سگھر، قبول صورت، اور پڑھی لکھی تھیں۔ جیسی جی حضوری کی عادت ناصرہ کو تھی، ویسی ہی بااوب اور بات ماننے والی ان کی بیٹیاں نکلیں، یہی وجہ تھی کہ بے جی ان میں سے دو کو رخصت کرنے میں کامیاب ہو گئیں۔ حالانکہ عالیہ نے ان رشتوں میں خاصی مین میخ نکالی، سدرہ بیاہ کر گوجرانوالہ چلی گئی، بڑا خاندان، بے تحاشا کام، میاں اپنا بزنس کرتا تھا۔ سسرال والے ہنس کھہ اور کھلے دل کے تھے۔ اس لیے سدرہ آرام سے ایڈجسٹ کر گئی۔ اب ماشاء اللہ دو بچوں کی اماں جان تھی۔ شوہر سادہ اور ہنس و طبیعت کے مالک تھے۔

زارا کے لیے جو صاحب ہاتھ لگے، وہ ہائی اسکول کے استاد تھے، مشکل و صورت مناسب، چھوٹا سا مگر ذاتی گھر، دو شادی شدہ ننندیں، دونوں ہی گوجرانوالہ میں، ایک بیماری مرنج طبیعت کی مالک ساس، جو صرف اس بات کی منتظر تھی کہ ہوا سے چارپائی پر بٹھا کر دو وقت کی روٹی کھا دے۔ ان کی گھر کے دھندوں سے جان پھوٹ جائے۔ سو زارا نے انہیں چارپائی پر بٹھا دیا۔ خود اس کا سارا وقت اپنے چھوٹے سے گھر کو سنوارنے اور دو ننھنے منے جڑواں بچوں کو سنبھالنے میں گزرنے لگا۔ دونوں میاں بیوی میں بلا کی محبت و یگانگت تھی۔ بے جی چاہتی تھیں کہ اب وہ صدف کی بات طے کر دیں۔ وہ زارا کی ہم عمر تھی۔ مگر ان کے

اونچے خیالات بے جی کے ارادوں پر پانی پھیر دیتے۔ انہیں بالکل امید نہ تھی کہ ماں بیٹی اس رشتے پر آمادہ ہوں گی۔

”ایک رشتہ اور بھی ہے پر لڑکا۔“ مصغری بی بی کچھ متذبذب نظر آئیں۔

”لنگڑا ہے۔“ بے جی اس کے سنگین لہجے پر چونکیں۔

”نہ نہ۔“

”کالا ہے؟“

”نہ نہ۔ وہ تو بس۔۔۔“

”آوارہ ہو گا؟“

”خالہ بی! اب میری بھی سن لو کہ کس کوئی کے دس سوال ضرور ہی پورے کرنے ہیں۔“ مصغری جھنجھلائی۔

”تو بول بھی چکو۔ ایک تو تم ست ست ہو۔“

”لڑکا مولوی ہے۔“ مصغری نے ڈرتے ڈرتے بتایا تو بے جی ماتھے پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔

”مصغری بی! لاحول ولا۔۔۔ ارے یہ کوئی عیب ہے۔“

”آج کے دور میں تو عیب ہی ہے۔ شرعی دائرہ ہی رکھتا ہے۔ انگریزی میں ایم اے کیا ہے۔“ مصغری نے

افسوس سے بتایا۔ پھر جائے کا آخری گھونٹ بھر کر کپ سائیڈ پر رکھ دیا۔

”لوگ کہتے ہیں۔۔۔ بلکہ سمجھتے ہیں کہ مولوی ہے تو ان کی بیٹی کو گھر میں بند کر کے رکھے گا۔۔۔ پرچ پوچھو

تو لڑکا ہیرا ہے ہیرا۔ بابا، مہربان، محل مزاج، صابر و شاکر، سادہ طبیعت کوئی خیر نہیں۔ ہر وقت ہی۔۔۔

ہی۔۔۔ بابا تو نہیں پر ہنس کھ طبیعت ہے۔ سچ خالہ میرا تو اس پر بڑا دل ہے۔“

”ہے۔ ہے مصغری! اپنی عمر تو دیکھو۔“ بے جی نے لتاڑا۔

”اپنی سارا کے لیے۔“ مصغری نے بوکھلا کر وضاحت کی۔

”کرنا کیا ہے؟“ بے جی نے کچھ سوچتے ہوئے پوچھا۔

”گو ننگے سروں کے اسکول میں پڑھانا ہے۔“

”آمدنی تو کچھ خاص نہ ہوگی۔“ بے جی کو مایوسی ہوئی۔

”ہاں، لیکن پڑھتا جا رہا ہے۔۔۔ کہتا ہے بڑا افسر لگوں گا۔۔۔ میرے تو برسوں کے جاننے والے ہیں۔ ماں

بڑی ہی نیک طبیعت عورت ہے۔ باپ نے دو سری شادی کر لی تھی۔ اس لیے باپ سے نہیں ملتا۔ گھر میں

دونوں ماں بیٹا ہی ہیں۔ بہن ایک تھی۔ بیاہ کر اسلام آباد چلی گئی۔“ مصغری کی تفصیل سن کر بے جی سوچ

میں ڈوب گئیں۔

”تو پھر کروں ان دونوں گھروں میں بات؟“

”جلدی کیا ہے؟ ذرا چھری تلے دم تو لو۔“ بے جی نے کہا۔ ”میں ذرا چھان بین تو کروالوں۔“

بے جی کا طریقہ کار ذرا مختلف تھا۔ وہ کبھی بھی ان رشتے کروانے والیوں پر پورا بھروسہ نہ کرتی تھیں۔

کسی کو گھر بلانے سے قبل ہی ساری چھان کروالیتیں۔ اس سے یہ ہوتا کہ بہت سے فضول رشتے بالا بالا ہی مل جاتے۔ لڑکیاں بھی بے کار کی پریڈ سے بچ جاتیں۔ بہت ہوا تو لڑکے کی تصویر منگوا کر لڑکی کی بھجوا دی۔ ”صغریٰ بی آئی بیٹھی ہیں۔“ عالیہ نے غلط وقت میں انٹری دی۔ بے جی کا منہ بن گیا۔ وہ صغریٰ کو دوپہر میں صرف اس لیے بلواتی تھیں کہ سکون سے بات ہو جاتی۔ ورنہ عالیہ تو فوراً ”مین میخ نکال اسے یوں رہجکٹ کرتیں۔ گویا لائن لگی ہو۔“

”کیا ہوا! آج اے سی تلے سکون نہ آیا۔“

”صغریٰ کی آواز آئی تو چلی آئی۔ پھر آپ ہی اعتراض کرتی ہیں کہ کسی کو چائے پانی کا نہ پوچھا۔“

”ہو نہ، مکن سوئیاں لینے کی عادت نہ گئی۔“

”مجھے کیا ضرورت ہے۔“ عالیہ چمک کر بولیں۔ ”جو دودھ کی نہر آپ دونوں نکال رہی ہیں سامنے آہی جاتی۔“

”جاؤ شروت بنا لاؤ۔“ بے جی نے ٹالنا چاہا۔ مگر عالیہ کی نگاہ چائے کے خالی کپ پر پڑ گئی۔

”چائے تو پی لی۔ اب شروت کیا کرنا ہے۔“

”ہاں، ہاں شروت کی ضرورت نہیں۔“ صغریٰ نے منع کیا۔ ”میں تو صدف کے لیے ایک دو اچھے رشتے۔“

”پتا تھا مجھے، کوئی نیا جن ہی چڑھانے آئی ہوگی۔ لیکن میں کہہ دیتی ہوں۔ میری صدف کے لیے کوئی ڈھنگ کا رشتہ ہوا تو بتانا۔ یہ چھوٹے موٹے کلرک، زمیندار مجھے نہیں بھاتے۔“

”ہاں۔ امریکہ کے وزیراعظم کا رشتہ بتاؤ ان کو۔“ بے جی بڑبڑائیں۔ پھر تیزی سے تسبیح پڑھنے لگیں۔

صغریٰ بی نے فوراً ”پٹاری کھولی۔“

”یہ افسر، یہ بزنس مین، یہ اعلاما، زمت۔“

”سب کے سب چھچھورے، نو دولتھے۔“ بے جی کی بڑبڑاہٹ خاصی بلند تھی۔ عالیہ کو ساس کی دخل اندازی ذرا پسند نہ آئی۔ انہیں یہ رشتے خاصے بھائے تھے۔

”آپ کو میں بیٹھے الہام ہو گیا۔“

”زمانہ دیکھا ہے۔ یہ بال دھوپ میں سفید نہیں کیے۔“

”کون جانے؟۔ ہاں تو وہ۔“

وہ دوپارہ سے صغریٰ کی طرف متوجہ ہوئیں۔ بے جی کو عالیہ کی یہی حرکتیں نا پسند تھیں۔ عالیہ کو جو رشتہ پسند آتا۔ فوراً ”کھانے یا چائے پر بلا لیتیں۔ ہر ایریا غیرا، چھچھورا منہ اٹھا کر چلا آتا۔ بے جی چڑ جاتیں۔“

”یہاں کیا میلہ مویشیاں لگا ہے۔“

لا تعلقی کے اعلان کے باوجود ان سے رہانہ جاتا کہ آخر معاملہ ان کی پوتیوں کا تھا۔ کڑھائی والا سفید دوپٹہ اوڑھ کر مہمان کا شجرہ نسب کھنگالنے پہنچ جاتیں۔ ان کے تابڑ توڑ سوالوں کے سامنے بڑے بڑے

بوکھلا کر میدان چھوڑ جاتے۔

جہاں وہ اپنی معاملہ فہمی، جہاں شناسی کی داد چاہتیں، وہیں عالیہ اسے رشتے بھگانے کی مہم قرار دیتی۔ غرض اس معاملے میں ساس بہو کے درمیان اینٹ کتے کا بیڑہ تھا۔ اب جس کا دل چاہے خود کو اینٹ سمجھے اور جس کا دل چاہے۔

”مجھے ان رشتوں کی پوری تفصیل لا کرو۔“ عالیہ نے صفری سے کہا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ پھر بے جی کی طرف متوجہ ہوئی۔

”تو پھر میں ان لوگوں کو کہ۔۔۔“

”بتا دوں گی۔ دو چار دن کے بعد چکر لگانا۔“

بے جی نے درمیان میں ٹوکا۔ وہ چاہتی تھیں کہ پہلے بیٹے سے بات کر لیں۔ پھر انہوں نے ہنر سے کرایہ نکال کر صفری کو تھمایا۔

”سیدھی گھر جاؤ گی۔؟“

”نہ نہ۔ ایک جگہ اور جانا ہے۔۔۔ اپنے پنڈ کے نمبردار کے بیٹے کا رشتہ کروانا ہے۔ انہوں نے کہا۔ کسی ڈھنگ کی لڑکی سے رشتہ کروا دو۔۔۔“ (بھینس) کوں گا۔“ صفری نے خوش ہو کر بتایا۔

”اللہ تمہارے نصیب میں کرے۔“

”رشتہ اچھا تھا۔۔۔ پر آپ کی ذات برادری کے نہیں ہیں۔“

”جہاں میری پوتیوں کے نصیب۔۔۔“

”صفری بی! خیال رکھنا۔ لڑکے خوب صورت ہوں۔ تم نے میری صدف کو تو دیکھا ہی ہے۔“ عالیہ نے

تاکید کی۔

”ہو نہ سمجھی کٹڑی۔“ بے جی کی زبان پھسلی۔ انہیں صدف کے کٹے ہوئے بالوں سے اللہ واسطے کا بیڑہ تھا۔ عالیہ منہ ہٹا کر رہ گئیں۔



لال بھبھو کا چہرہ پسینے سے تڑپے زاری کے ساتھ وہ گھر میں داخل ہوئی تو موڑا اچھا خاصا خراب تھا۔ ایک تو گرمی، پھر دین والے کی چھٹی اس پر آج مریم بھی کانچ نہیں گئی تھی۔ سوا کیلی پبلک دین میں دھکے کھاتی گھر پہنچی۔ بے جی تخت پر موجود نہ تھیں۔ سو شارٹ کٹ استعمال کیا۔ سیدھا ڈرائنگ روم میں جا کھسی۔ جس کا دو سرادروا نہ اندر رکھتا تھا۔

ڈرائنگ روم میں کوئی نہ تھا۔ اس کے خیال میں۔ پھر فل اسپینڈ سے چٹا پنکھا، خاموشی سے نیم تاریکی سے گلے ملتی فرحت بخش ٹھنڈک کا احساس سرسراتے پردے اس نے فوراً ”بیگ ٹیبل پر اچھالا اور خود دھم سے صوفے پر۔“

”آ۔ آ۔“ بھرپور مردانہ چیخ نے اسے کئی فٹ اوپر اچھالا۔ میز سے الجھتی، لمب گراتی۔۔۔ دروازے سے گلے ملتی سرپٹ واپس بھاگی۔ برآمدے میں تخت کے پاس رک کر سانس اور حواس بحال کرتے، ہاتھوں کے اڑے چڑیاں، ٹھوٹے واپس بلاتے اس نے حیرت سے سوچا۔

”کون تھا۔۔۔؟“ اور کمال جرات سے پلٹ کر ڈرائنگ روم کی جالی سے ناک چپکادی۔ اندر کا منظر واضح نہ تھا۔ جو بھی تھا۔ بڑبڑاتے ہوئے دوبارہ نے صوفے پر دراز ہو گیا تھا۔

”یہ تم چپکلی کی طرح دروازے سے چپکی کیا کر رہی ہو؟“

سارا کی آواز پر وہ بوکھلا کر پلٹی پھر سرگوشی میں پوچھنے لگی۔

”اندر کون ہے؟“

”اسرار آیا ہے۔۔۔ اور کون صوفے پر سوتا ہے۔“

”اوس ہوں۔“ وہ خاصی بد مزہا ہوئی پھر سوچا۔

”پہلے بتا ہوتا تو اچھی طرح کچھ مر نکالتی۔“

”کھانا کھانا ہو تو آجاؤ۔ نکال دوں۔“ سارا نے کہا تو وہ اس کے پیچھے کچن میں چلی آئی۔ کھانا کھا کر اپنے اور مریم کے مشترکہ کمرے میں آگئی۔ جہاں منہ پر دوپٹہ لیے مریم گنگنا رہی تھی۔ کتاب سینے پر اوندھی پڑی تھی۔ سارہ کو غصہ آگیا۔ اس نے کتاب اور دوپٹہ دونوں کھینچے۔

”شرم تو نہیں آئی۔ پہلے بتا دیتی تو میں بھی چھٹی کر لیتی۔“

مانو کو قلق اسی بات کا تھا کہ مریم نے عین اس وقت بتایا، جب وہ تیار ہو کر بالکل دروازے کے پاس کھڑی وہیں اور مریم دونوں کا انتقال کر رہی تھی۔

”اسی لیے نہیں بتایا تھا۔“ اس نے اطمینان سے کہا۔

مانو مکمل ناراض ہو کر اپنے بیڈ پر چلی گئی۔ جب سو کر اٹھی تو شام ہو رہی تھی۔ صحن میں ایئر کولر چل رہا تھا۔ بے جی اور اسرار بیٹھے پھیلیاں (بھٹے) کھا رہے تھے۔ بے جی کے دانت اس عمر میں بھی اخروٹ توڑ لیتے تھے۔ پھر بھٹے کیا چیز تھے۔

”یہ کہاں سے آئے؟“ مانو لپک کر قریب آئی۔

”اسرار لایا ہے۔۔۔ بوری بھر کے ساتھ میں سنگھاڑے بھی ہیں۔“ بے جی نے خوش ہو کر بتایا۔

”ہیں۔“ مانو کے منہ میں پانی بھر آیا۔ اسرار اس کی دور پر بے کی پھپھو کا بیٹا تھا، جب بھی گاؤں سے آتا،

پھپھو طرح طرح کی سوغاتیں بھیجتیں۔ وہ یہاں بی اے کے پیپرزدینے آیا تھا۔

”سنگھاڑے کہاں ہیں؟“ مانو کا دل لپکا گیا۔

”اُبلنے کے لیے چولہے پر چڑھائے ہیں۔ کچے تھے۔“ بے جی بھی موج میں تھیں۔

”بس بے جی۔“ اسرار نے آدھا بھٹا چھوڑ دیا۔ ”مجھ سے نہیں کھایا جا رہا۔“

”کیوں۔“

”میرے بانو میں درد ہے۔“

”بیٹھے بیٹھے ہو گیا؟“ بے جی نے تشویش سے کندھا دباتے اسرار کو دیکھا۔

”بیٹھے بیٹھے کہاں؟ دوپہر میں حادثہ ہو گیا تھا۔“

اس نے مانو کی طرف دیکھنے سے اجتناب کیا۔ جس کے کان کھڑے ہو گئے تھے۔

”حادثہ۔“ بے جی ہٹا کھانا بھول گئی تھیں۔

”مجھ پر بلڈوزر چڑھ گیا تھا۔“

”تم کیا سڑک پر جا لیٹے تھے۔“ مانو کو اس کی شوخی ایک آنکھ نہیں بھائی۔

”نہیں۔ بلڈوزر بیٹھک میں گھس آیا تھا۔“ وہ معصومیت سے گویا ہوا۔ مانو غصے سے کھڑی ہو گئی۔

”تم کہاں چلیں؟“ اسرار نے فوراً پوچھا۔

”جسم میں۔“

”ہاں وہاں سنگھاڑے جلدی اہل جائیں گے۔ ایسا کرو یہ بھٹا بھی تم لے لو۔“ اس نے ادھ کھایا بھٹا اس کی طرف بڑھایا۔

”سوری میں جھوٹا نہیں کھاتی۔“ وہ کھولتے ہوئے اندر آ گئی۔

”لفٹنگا۔ پنڈو۔ جاہل۔“

”ہیں۔ ہیں یہ کس کو کوس رہی ہو۔“ عالیہ، ناصرہ اور سارا بیٹھی کچھ گھریلو امور پر تبادلہ خیال کر رہی تھیں۔

”ایک ہی تو ہے۔ نہ بات کرنے کی تمیز، نہ لباس پہننے کا سلیقہ، جب دیکھو کف کھلے، یہ وہ سی چپل پہنے سارے گھر میں پھینڈ کر رہے۔ بے جی کا چچہ۔“

”کیسی پھینڈ زبان چل رہی ہے۔ کس کی بات کر رہی ہو۔“ عالیہ نے چڑکریٹی کو دیکھا۔

”اسرار کی۔“ سارا فوراً ہی سمجھ کر ہنسی۔ ”تمہاری تو اس کے ساتھ شروع سے ہی نہیں بنتی۔“

”بری بات ہے۔ ایسا بے ضرر سالز کا ہے۔ گھر کے سینکڑوں کام نمٹا دیتا ہے۔ تمہیں پڑھاتا بھی تو ہے۔

ناصرہ نے نوکا۔

”ہو نہ۔“ مجھ پر احسان کرتا ہے۔ مت پڑھایا کرے۔“ وہ ترخ کر بولی۔

”اور اس کی لائی چیزیں۔ جو تم مزے لے لے کر کھاتی ہو۔“ سارا نے یاد دلایا۔

”میں تو ہاتھی نہیں لگاؤں۔“ وہ ناک چڑھا کر بولی۔

”ہاں لڑکا تو ایویں سا ہے۔“ عالیہ نے کہا تو سارا اور ناصرہ ایک دوسرے کی طرف دیکھ کر رہ گئیں۔ جبکہ

مانو، جب سنگھاڑے اہل گئے تو وہ پلیٹ بھر کر کالا نمک ڈھونڈتی پھر رہی تھی۔

ہال میں پہنچ کر صدف نے سب سے پہلے اپنا گروپ تلاش کیا۔ وہ سب ایک کونے میں خوش گہوں میں مصروف تھیں۔ فروپار لر سے ابھی ابھی پہنچی تھی۔ اس کی منہیں اسے تھام کر اسٹیج تک لے گئیں۔
 ”او۔ واؤ بیٹی کوئن۔“ اس کے گروپ نے مخصوص انداز میں اس کی پذیرائی کی۔ وہ تقاریر سے مسکراتی ان کے ساتھ بیٹھ گئی۔

”اتنی دیر سے آئی ہو۔“

”چیف گیسٹ آخر میں آتے ہیں۔“

”اوہ ہو۔۔۔ چیف گیسٹ۔۔۔“ صبیحہ نے حسب عادت اس کے کندھے پر سر ٹکایا۔ صدف جتنا اس کی اس عادت سے جڑتی تھی۔ وہ اتنا ہی باز نہ آتی۔

”فروا اچھی لگ ہے۔۔۔ لیکن ویلہ کا جوڑا ہلکا ہے۔۔۔ فروزاں نے کہا تو سب اسٹیج کی طرف متوجہ ہو

گئیں۔۔۔ جہاں فروا کے سرال والوں نے دھرتا دے رکھا تھا۔۔۔ اپنے رشتے داروں کو بلوا کر موسیقی بجائی جا رہی تھی۔ سبھی صدف کی توجہ وہاں کھڑی اک شخصیت نے کھینچ لی۔

”ارے۔۔۔ یہ نواز شریف کون ہے؟“ اس نے بے ساختہ پوچھا۔

”کون۔۔۔؟“ سب نے دیکھا۔ پھر ہنس دیں، صبیحہ نے دوبارہ سے اپنا ڈھائی من کا سر صدف کے کندھے پر دے مارا۔

”اف۔۔۔“ صدف نے بھنا کر اسے دھکا دیا۔ پھر اپنا کندھا سہلانے لگی۔

”سیٹ بدل لو۔ ورنہ گھر اس کے بغیر جانا پڑے گا۔“ انجم نے کندھے کی طرف اشارہ کیا۔

”ویسے نام ٹھیک دیا ہے۔۔۔ بتایا نواز شریف ہے۔“ فروزاں مسکرائی۔

”کس نواز شریف کی بات کر رہی ہیں؟“ عقب سے کسی نے چبا چاکر پوچھا۔

”وہی جو دو لہما کے ساتھ کھڑے سب کو سیاسی قسم کی مسکراہٹ سے نواز رہے ہیں۔ گویا کسی جلے میں شریک ہوں۔۔۔ بس قد ہی لمبا ہے، ورنہ بالوں کے اسٹائل سے لے کر انداز تک بالکل۔ میاں صاحب ہیں۔ صدف نے تفصیلی تبصرہ کیا۔

”کس کے میاں۔۔۔؟“ صبیحہ چونکی۔

”افوہ، کسی کے نہیں۔ یا ہو سکتا ہے کسی کے ہوں۔“

”نہیں خوش قسمتی سے وہ کسی کے میاں نہیں ہیں۔ البتہ بن سکتے ہیں اگر کوئی چاہے تو۔“

سب نے گھوم کر بلکہ گھور کر بولنے والی کو دیکھا۔ نی پٹک پٹوازا غالباً ”اپنے ولیمے کی سونے کا بھاری

سیٹ“ اس سے زیادہ بھاری جھمکے ہاتھوں میں سونے کے خوب صورت کڑے، بالوں کا خوب صورت

اسٹائل، زبردست میک اپ۔۔۔ وہ ایک ہاتھ انجم کی کرسی پر ٹکائے بظاہر اسٹیج کی طرف متوجہ نبجانے کب

سے ان کی گفتگو سن رہی تھی۔

”دراصل یہ اپنے آئیڈیل کی تلاش میں ہیں، نہ آئیڈیل ملتا ہے، نہ یہ کسی کے میاں بننے کو تیار ہوتے

ہیں۔“ اس نے معلومات میں مزید اضافہ کیا۔

”کرتے کیا ہیں؟“ صبیحہ نے ناقدانہ نظموں سے موصوف کا جائزہ لیا۔

”ممکنہ شکل انجینئر ہیں۔“ اس کی معلومات قابل رشک تھیں۔

”آئیڈیل میں کون سی خصوصیات چاہتے ہیں؟“ نجم نے پوچھا۔

”جیسے دھچک کر سانسیں رک جائیں، دل دھڑکنا بھول جائے، راتوں کی نیندیں اڑ جائیں۔“

”اتنا خوفناک آئیڈیل تراش رکھا ہے؟“ فروزاں نے جھرجھری ملی۔

”ویسے آپ کو اتنی معلومات کیسے ہیں؟“ صدف نے پوچھا۔

”کیونکہ میں نواز شریف کی بہن ہوں۔“

”ایں۔“ ساری گردنیں اس کی طرف گھومیں، جو اب ”وہ مسکرائی اور نگن کھٹکھٹائی اسٹیج کی طرف بڑھ

گئی۔ سب کی ہنسی ایک ساتھ بلند ہوئی۔

”تبصروں سے گریز کریں، کون جانے کون کا کیا لگتا ہے۔“ نجم نے ہاتھ اٹھا کر اعلان کیا۔ پشتواز

والی محترمہ اب نواز شریف کے پاس جا کھڑی ہوئیں۔

”ویسے بندہ ٹھیک ٹھاک ہے۔“ صبیحہ نے تھوڑی خاموشی کے بعد کہا۔

”ہاں تم اس کے آئیڈیل سے کسی حد تک میل کھاتی ہو۔“

”بد تمیز۔“ نجم کے طنز پر صبیحہ خفا ہو کر سرخ بدل گئی۔

”بس کرو، آؤ فروزاں مل آئیں۔“ فروزاں کھڑی ہوئی تو سب نے اس کی تقلید کی۔ فروزاں کو مبارکباد

دینے اور باقی لوگوں سے رسمی تعارف کے بعد جب صدف اپنی سی گرین ساڑھی کا پلو سنبھالے واپسی کے

لیے مڑی تو نہیں جانتی تھی کہ

کسی کی سانسیں رک گئی ہیں۔

دل دھڑکنا بھول گیا ہے اور راتوں کی نیندیں ساڑھی کے پلو سے باندھ لائی تھی۔

نواز شریف اس کی جانب ٹکٹکی باندھ گھڑا تھا۔



بے جی نے جبار احمد کو طلب فرمایا اور اس وقت فرمایا جب عالیہ ان سے بہت ضروری بات کر رہی تھیں

۔ ایسی ضروری بات، جس کا کوئی سرچر نہ تھا، بس اتنا پتا چلا کہ بات صدف کے رشتے سے متعلق ہے۔

کہیں کہیں جبار احمد کی چشم پوشی اور ساس کی بے رخی کا ذکر بھی ملتا تھا۔ وہ بڑی صبر آمیز بے بسی کے ساتھ

اخبار ہاتھ میں لیے چائے کی پیالی کو گھور رہے تھے۔ کہ انہوں نے جب بھی پیالی کو لبوں تک لے جانے

کی کوشش کی۔ وہ پیالی پرے کھسکا کر چڑ کر کہیں۔

”آپ میری بات غور سے نہیں سن رہے۔“

اب وہ کیسے سمجھاتے کہ چائے منہ سے پینی ہے اور بات کانوں سے سنی ہے۔ مگر یہ عورت جو سامنے بیٹھی پڑ پڑ رہی تھی۔ جوانی میں خوش قسمتی سے اور اب بد قسمتی سے (جوانی میں عالیہ بیگم خاصی خوبصورت ہوا کرتی تھیں) ان کی بیوی تھیں۔ کبھی وہ ان کی خاطر دفتر سے بہانے کر کر کے گھر بھاگا کرتے تھے۔ آج اسی کی وجہ سے گھر سے باہر رہنے کے بہانے تراشتے تھے۔

”آپ میری بات نہیں سن رہے۔“

ذرا خیالی رویہ بھی نہیں اور عالیہ بیگم نے گرفت کی نہیں۔

”سن رہا ہوں۔“ انہوں نے بے چارگی سے ٹھنڈی پڑتی چائے کو دیکھا۔ ان کی اسی بے چارگی نے عالیہ کو شیر کیا ہوا تھا۔

”میری تو جیسے تیسے روتے و صوتے گزر گئی۔ اب مجھے اپنی بیٹیوں کے لیے تو اچھا سوچنے کا حق ہے یا نہیں۔“

”تو سوچو۔“

”بس میں سوچوں۔ آپ بھی تو باپ ہیں۔“

”میں نے کب انکار کیا ہے؟“

”آپ انکار کر بھی کیسے کر سکتے ہیں۔“ وہ بھڑک اٹھیں۔

”افوہ! میرے کہنے کا مطلب ہے۔“ وہ گڑبڑائے۔ ”جی مرمم نے جھانک کر انہیں بے جی کا پیغام دیا۔“

”دلیں۔۔۔ آگیا بلاوا۔۔۔ اب خوا خواہ ماں کی باتوں میں آکر کسی ایسے ویسے رشتوں پر ہاں مت کرو تجھے گا۔“

اول تو صدف نہیں مانے گی۔ ماشاء اللہ پڑھی، لکھی، خوب صورت اور برس روز گار ہے۔ اس کے لیے رشتوں کی کمی نہیں۔ نہ وہ دادی کے پسند کیے رشتوں پر ہاں کرے گی۔

جبار احمد نے طویل سانس لے کر اخبار ایک طرف رکھا اور کھڑے ہو گئے۔

”غور سے سن رہے ہیں۔ میں کیا کہہ رہی ہوں۔۔۔ مجھے سدرہ اور زارا کی طرح اپنی بیٹیوں کو جہنم میں

نہیں جھونکنا۔“

”تم تو خوا خواہ ہی۔ اچھا بھلا۔ اپنے اپنے گھروں میں بس رہی ہیں۔“

وہ بڑبڑاتے ہوئے کمرے سے نکل گئے۔ یہ پیچھے کلستی رہیں۔ پھر وہ نہ سکیں تو اٹھ کر باہر نکل گئیں۔

برآمدہ خالی تھا۔ چپکے سے جا کر ساس کے کمرے کے سامنے جا کھڑی ہوئیں اور کان دروازے سے لگا

دیے۔

”یہ ہیں دو رشتے۔۔۔ سہلا حق صدف کا بنتا ہے۔ اس لیے تم سے بات کر رہی ہوں۔ تمہاری بیوی سے

بات کرنا فضول ہے۔“

”اماں! عالیہ چاہتی ہے۔“

”کب تک بیوی کے دماغ سے سوچتے رہو گے۔ اپنی عقل کیا گروی رکھی ہے۔“
 ”بے جی! صدف بھی نہیں مانے گی۔ وہ چاہتی ہے کہ لڑکا اس سے زیادہ پڑھا لکھا ہو۔“
 ”باپ ہو۔۔۔ تم فیصلہ کرو گے تو کیسے نہیں مانے گی۔“ بے جی نیک نیتی سے چاہتی تھیں کہ اب صدف کا رشتہ طے ہو جائے۔

”یہ ہمارا زمانہ نہیں ہے بے جی کہ جہاں والدین نے رشتہ کر دیا۔ چپ کر کے بھالایا۔۔۔ آج کل کے بچے اپنی الگ ڈیمانڈز رکھتے ہیں۔ پڑھی لکھی لڑکیاں۔۔۔ انہوں نے ذرا مل ل انداز میں بات کرنا چاہی۔

”کیا پڑھی لکھی۔ ایسا کیا نرالا پڑھ لیا تمہاری لڑکیوں نے۔۔۔ لڑکیوں نے جہاز اڑا لیے، یہ کالج میں پڑھا کر خود کو توپ سمجھنے لگی ہیں۔ نوازی لڑکیاں بھی تو ہیں۔ پڑھی لکھی، خوب صورت گھڑمجال نہیں کہ ماں باپ کے فیصلے کے خلاف چوں بھی کر جائیں۔۔۔ ہاں یہ کہو کہ ماں کی سکھائی پڑھائی خوب ہیں۔“
 عالیہ تلملا کر رہ گئیں۔ ”ساری عمر ساس ہی بن کر رہیں۔“
 ”بے جی! آپ تو عالیہ کے پیچھے خواستخواہ پڑی رہتی ہیں۔“ جبار احمد کی آواز نے جلتے جلتے سینے پر چند قطرے ٹھنڈے پانی کے ڈال دیے۔

”تو کیا تمہاری طرح اس کی غلامی کروں۔“ بے جی تاؤ کھا کر بولیں۔
 ”اس میں غلامی کی کیا بات ہے۔ پھر عالیہ بھی تو آپ ہی کی پسند ہے۔۔۔ میں نے تو بس آپ کا حکم مانا تھا۔“

”بس۔۔۔ ساری زندگی میں مجھ سے یہی ایک غلطی ہوئی۔“ بے جی ٹھنڈی سانس بھر کر بولیں۔
 ”غلطی۔۔۔ بھگت تو میں رہی ہوں۔“ تلملاہٹ کا گراف کچھ اور بلند ہو گیا تھا۔
 ”غور سے سنو۔۔۔ رشتہ دونوں معقول اور شریف گھرانوں کے ہیں۔ تو قیر سے کہہ کر میں نے ساری چھان بین کروالی ہے۔۔۔ صدف کو تم خود سمجھاؤ۔ اپنی اوقات سے بڑھ کر خواب دیکھنے والے ساری عمرنا مراد رہتے ہیں۔“

”اے ہے۔۔۔ کہنے والوں کے منہ میں خاک۔۔۔“
 ”کہیں نہ کہیں تو سمجھو تا کرنا پڑتا ہے۔ ساری شرطیں کہاں پوری ہوتی ہیں۔ خواب تو سدرہ اور زارا نے بھی دیکھے ہوں گے۔ بڑے امیر اور اونچے گھرانوں کے، لیکن میرے سمجھانے پر ہاں کہہ دی۔ اب تم ایمان داری سے بتاؤ۔ کیا وہ اپنے اپنے گھروں میں بری ہیں۔ سہاگنیں ہیں۔ آل اولاد والی۔ معاشرے میں عزت ہے۔ ماں باپ سکھ کی نیند سوتے ہیں اور کیا چاہیے۔ باقی تنگی و فراخی۔۔۔ دکھ سکھ سب نصیب کے کھیل ہیں۔ ہمیں تو صرف یہ دیکھنا ہے کہ لڑکا شریف ہے۔ عزت دار گھرانے سے تعلق رکھتا ہے۔۔۔ سرسروزگار ہے۔ بس زیادہ اونچی ہواؤں میں رہنے کی ضرورت نہیں۔ تمہاری لڑکیاں دنیا سے نرالی ہیں

۔۔۔ کتنی ہی برسرِ روزگار اور خوب صورت لڑکیاں اپنی ہٹ دھرمی کے آگے کنواری بیٹھی ہیں۔ کچھ عقل کو ہاتھ مارو۔ اپنی بیٹی کو کنٹرول کرو۔۔۔ اس کی دیکھا دیکھی۔۔۔ چھوٹی والیاں بھی مزاج دار بنتی جا رہی ہیں۔۔۔ اور اس بے وقوف کو سمجھاؤ۔۔۔ جسے میرے دروازے سے کان لگا کر کن سونیاں لینے کی عادت پڑی ہے۔۔۔ بے جی نے اچھا خاصا لیکچر دے دیا۔۔۔ بارے غصے کے عالیہ دروازہ کھول کر اندر جا گھسیں۔۔۔
 ”مجھے کوئی ضرورت نہیں۔۔۔ دروازے سے کان لگا کر کن سونیاں لینے کی۔۔۔“ بے جی نے معنی خیز نظروں سے بیٹے کو دیکھا۔

وہ جربز ہو کر بیوی کو دیکھنے لگے۔ تب عالیہ کو جوش جذبات میں ہونے والی غلطی کا ادراک ہوا مگر ڈھیٹ بن گئیں۔

”میں تو ان سے کہنے آئی تھی کہ چائے ٹھنڈی ہو گئی ہے۔“

”جب میں آیا تھا۔۔۔ چائے تب بھی ٹھنڈی تھی۔“ جبار احمد نے قدرے غصے سے جتایا۔

”ہاں۔۔۔ ہاں اب ماں کے سامنے یہ ثابت کریں کہ میں آپ کا خیال نہیں رکھتی۔۔۔ ٹھنڈی چائے پلاتی ہوں۔“ وہ چمک کر بولیں۔

”ارے بی بی! پتا ہے۔۔۔ تمہیں اپنے شوہر کا بہت خیال ہے۔ پر اب کیا وہ ماں کے پاس بیٹھ کر دو گھڑی بات بھی نہیں کر سکتا۔“ بے جی نے ناگواری سے ہو کر دیکھا۔

”سو بار کریں۔۔۔ پر ایک بات یاد رکھیں۔۔۔ میں ماں ہوں صدف کی۔۔۔ اس کے بارے میں فیصلہ کرنے کا پورا اختیار رکھتی ہوں۔“ عالیہ نے تن کر کہا۔

”جم جم کرو۔۔۔ یہ ایک مشورہ میرا بھی ماں لو۔ یہ اور اک کنوارا خانہ کھول لو۔۔۔ جو ارادے تمہارے اور تمہاری اولاد کے ہیں۔ اس میں تو کوئی نہیں بیاہی جائے گی۔“ بے جی نے صل بھن کر کہا۔

”دیکھا۔۔۔ دیکھا یہ ہمیشہ سے میری اور میری بیٹیوں کی مخالف رہی ہیں۔ میں بیگانی مگر پوتیاں تو سگی ہیں کیسے بڑے بڑے بول منہ سے نکالے ہیں اگر اگر کوئی بول پورا ہو جائے تو۔“ وہ روہانسی ہو گئیں۔

”ہاں اللہ تعالیٰ نے سارے فرشتے میری مرضی پر تو چھوڑ رکھے ہیں۔“
 جبار احمد ساس ہو کر نوک جھوک کر تاپچھوڑ کر چپکے سے اٹھے اور باہر نکل گئے۔ سامنے سارا کو دیکھ کر

فورا ”فرمائش کر دی۔“

”سارا بیٹی! ایک کپ چائے تو پلاؤ۔“

”چچا جان! آج جو شانہ نہیں ملا۔“

”شرر۔۔۔“ انہوں نے گھورا۔ وہ خود ہی عالیہ کی بنائی چائے کو جو شانہ کہتے تھے۔۔۔ چائے انہیں صرف سارا کے ہاتھ کی پسند تھی۔ اسے خوب خبر تھی کہ کسے زیادہ پتی والی چائے چاہیے اور کسے زیادہ دودھ والی۔۔۔ وہ ابھی لاتی ہوں کہہ کر کچن میں چلی گئی۔۔۔ اور جبار احمد اپنے کمرے میں۔۔۔ انہیں باقی ماندہ اخبار ختم

کرنا تھا۔۔۔ ان کی گھریلو معاملات سے اسی لا تعلقی نے عالیہ کو شیر بنایا تھا کہ وہ ہر معاملے میں اپنی چلاتی تھیں۔



”ہائے نایاب! تم نے مجھے پہچانا نہیں؟“

دروازہ نایاب نے ہی کھولا تھا۔ سامنے کھڑی چھوٹی سی گول مٹول سی لڑکی کو قدرے غور سے دیکھا۔ مگر وہ غور لگاتی اس کے گلے آگئی۔ نایاب نے بمشکل خود کو اس کی گرفت سے آزاد کروایا۔

”صبیحہ۔“

اگرچہ وہ پہلے سے موٹی بھی ہو گئی تھی اور کالی بھی، مگر نایاب اپنی کالج فیلو کو پہچان ضرور گئی تھی۔ پرانی سہیلی کو دیکھ کر قدرتی سی خوشی ہوئی۔

”آج میری یاد کیسے آگئی؟“

”دیکھ لو ہم بھولے نہیں۔۔۔ آج تو اسپیشل تم سے ملنے آئی ہوں۔“

”ساتھ میں کوئی ہے؟“ نایاب نے اسے اندر بلائے سے قبل پوچھا۔

”بھائی چھوڑ کر گئے ہیں۔ آدھے گھنٹے تک لینے آئیں گے۔“

”صرف آدھا گھنٹہ۔۔۔؟“ نایاب اسے اندر لے آئی۔

”ہاں۔“ وہ ذرا سا مسکرائی، ہلکا سا شرمائی۔

نیا کو سمجھ میں اگرچہ کچھ نہیں آیا۔ پھر بھی وہ اسے لیے بے جی کے کمرے کی سمت بڑھ گئی۔ جو منتظر

نگاہوں سے دونوں کو دیکھ رہی تھیں۔

”بے جی یہ میری کالج کی سہیلی ہے صبیحہ۔“ نیا نے تعارف کروایا۔

”اچھا۔۔۔ اچھا۔“ انہوں نے زور زور سے سر ہلایا۔ پھر دونوں کو غور سے دیکھا قدرت میں دونوں ایک سی تھیں۔

”ماشاء اللہ! سہیلیاں بھی ناپ تول کر بنایا کرتی تھیں۔“ وہ زرب لب بڑبڑائیں۔

صبیحہ نے تو سنایا نہیں۔۔۔ نیا کی سمجھ میں اچھی طرح آگیا تھا۔ کچھ بھی گڑبڑا کر صبیحہ کو ساتھ لیے ڈرائنگ روم کی سمت بڑھ گئی۔

”بے جی! کون تھا؟“ سارا اندر کے کمرے سے برآمد ہوئی۔

”وہ اپنے جیسا لٹو پیڑا لے کر ڈرائنگ روم میں گئی ہے۔۔۔ شربت پانی پر بنچا دو۔“

بے جی نجانے کس بات پر چڑی بیٹھی تھی۔ سارا کچھ نا سمجھی کے عالم میں آگے بڑھی، ڈرائنگ روم کی کھڑکی سے جھانکا۔ پھر مسکراہٹ دہاتی بچن میں گھس گئی۔ صبیحہ سے وہ اچھی طرح واقف تھی۔ بچن میں مسرت اور کرن موجود تھیں۔

”شرمت تیار ہے؟“ کرن نے بوکھلا کر جگ اس کی سمت بڑھا دیا۔ غالباً ”وہ بے جی سے چوری ان کے فالے کے شرموت پر ہاتھ صاف کرنے آئی تھیں۔ سارا نے دونوں کو گھورا اور مڑ گئی۔

”موادیا باجی! کوڑے گوڑے شرمندہ کروادیا۔“ مسرت خجالت سے بولی۔

”ایسی چھوٹی موٹی باتوں پر شرمندہ نہیں ہوتے۔“ کرن نے کندھے پر ہاتھ کر تسلی دی۔ ”آؤ نیا کی پہلی سے مل آئیں۔“

”سارا! تم تو پہلے سے زیادہ پیاری ہو گئی ہو۔“ صبیحہ کہہ رہی تھی۔

”میں پہلے بھی خاصی پیاری تھی۔ بہر حال شکریہ۔“ سارا اترائی۔

”تمہیں یہی خوش فہمیاں لے ڈوبیں گی۔“ نیا کو اس کا اترنا ایک آنکھ نہیں بھایا۔

”حسن دیکھنے والے کی آنکھ میں ہوتا ہے اور تمہاری آنکھیں۔“ سارا نے غور سے اسے دیکھا پھر

مایوسی سے سر ہلایا۔

”اتنی چھوٹی آنکھوں میں کچھ نہیں ساسکتا۔“

”میری آنکھیں خوابیدہ ہیں۔“ نیا تلملائی۔

”نشئی کہو۔ یہ خوابیدہ کی اصطلاح بھی خوب ہے۔“

”تم غالباً ”نشیل“ کہنا چاہتی ہو۔“

”کہاں؟ ایسا لگتا ہے بھنگ پی رکھی ہے۔ بلاوجہ گول گول گھومتی ہیں۔“

سارا انجانے کس جنم کا بدلہ لے رہی تھی۔ یہ صریحا ”نیا کی بے عزتی تھی“ مگر وہ صبیحہ کے سامنے اور کر بھی کیا سکتی تھی۔ ابھی کچھ دیر قبل ہی سارا نے اس سے کہا تھا۔

”ملکہ عالیہ کو تھوڑا بلنا منظور ہو تو آج روٹیاں آپ بنالیں۔“

نیانے بے نیازی سے جواب دیا تھا۔

”ملکہ عالیہ کو بلنا منظور نہیں ہے۔“

سارا غالباً ”اسی بات کا بدلہ لے رہی تھی۔ نیانے بات بدلنا چاہی۔

”صبیحہ کھانا ادھر ہی کھائے گی۔“

”بھندیاں تیار ہیں۔“ سارا نے کہا اور گلاس بھرنے لگی۔

”نہیں۔ نہیں۔ میں نے ابھی آدھے گھنٹے میں چلے جانا ہے۔“ صبیحہ بوکھلائی۔

”کیوں صبیحہ جان! آدھے گھنٹے میں یہاں ہم پھنسنے والا ہے۔“ سارا نے دوستانہ انداز میں پوچھا۔

ایک گلاس صبیحہ کے سامنے اور دوسرا اپنے سامنے رکھ لیا۔ کرن اور مسرت ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ چوری بھی کی اور ہاتھ بھی کچھ نہ آیا۔

”سارا! تمہاری اب بھی وہی باتیں ہیں۔“ صبیحہ ہنسی۔

”مجھے تو لگتا ہے۔۔۔ چولہے پر ہانڈی چڑھانے کے بجائے یہ خود چڑھ گئی تھی۔“ نیانے کڑے تیوروں

سے سارا کو گھورا۔

”اس جون کی گرمی میں ذرا کچن میں جا کھڑی ہو۔ خود بخود ہٹا چل جائے گا۔ ہانڈی چڑھتی ہے یا تم۔“

”یہ بھی تمہاری بہن ہے۔“ صبیحہ نے مسرت کی طرف اشارہ کیا۔

”بہن ہی سمجھ لو۔ کزن ہے۔ گاؤں سے آئی ہے۔“

حق ہا۔ یہ بتانا ضروری تھا۔ ”مسرت تلمٹائی۔

”اور سناؤ۔ کوئی مشکلی ہو گئی کروائی۔“ صبیحہ نے شربت کا گھونٹ بھرا۔

”ہم وہ میریاں ہیں جس پر تاحال کوئی پتھر نہیں آیا۔“ نیا نے حسرت سے آہ بھری۔

”اچھا۔“ صبیحہ کھلکھلائی۔

آنکھوں کی چمک میں خاطر خواہ اضافہ ہوا۔ نیاز اٹھکی پھر احتیاطاً پوچھا۔

”تم سناؤ!“

”اسی لیے تو آئی ہوں۔ سوچا تمہیں بھی مٹھائی کھلا دوں۔“ اس نے پاس رکھے بلیک شاپر سے مٹھائی کا

ڈبہ نکال کر میز پر رکھا۔

”اوہ۔ میں بھی کہوں تمہیں ہماری یاد کیسے آگئی۔“ (ہمارے زخموں پر نمک جو چھڑکنا تھا۔)

”کون ہیں موصوف؟“ (عقل کا اندھا۔)

”کہاں گھرا گئے؟“ (کس کی آنکھوں پر پردہ بڑ گیا۔)

نیا نے سوال کیے۔ آج کل یہ ٹاپک جان جلاتا تھا کہ اس کی ساری مسہلیاں یکے بعد دیگرے مشکلی

شدہ یا شادی شدہ ہوتی جا رہی تھیں۔

مسہلیاں تھیں بھی تھوک کے حساب سے ڈھیریں ڈھیر۔ آدھا کالج اس سے واقف تھا۔ شروع

شروع میں بڑے جوش و خروش سے شادیاں منگنیاں انینڈ کیں۔ جب توپوں کا رخ اس کی طرف ہوا اور

ہر کسی نے اس سے پوچھنا شروع کیا کہ وہ کب مٹھائی کھلا رہی ہے تب اس کا جوش مدھم بڑ گیا۔

”میرے ماموں کے بیٹے ہیں۔ ایک دن ہمارے گھر آئے۔ واپس جا کر کہنے لگے شادی کروں گا تو

صبیحہ سے۔ بس آنا“ فانا“ رشتہ ہو گیا۔“

”ایک ہی دن میں ایسا کون سا جادو کروا۔“ نیا نے غور سے سہیلی کو دیکھا۔

نہ آنکھیں نشیل نہ چہرے کے خدو خال میں جا زبیت چہرے کے داغ دھبے باوجود میک اپ کے نظر آ

رہے تھے۔

”بس مہمانی تو راضی بھی نہ تھیں۔ مگر اس نے منا کر ہی چھوڑا۔“

”مگر ایسا کیا۔؟“ نیا اشتیاق سے اس کے قریب کھسکی۔

”بس۔ ایک دن ہوا یوں کہ۔ وہ ہمارے گھر آئے۔ میں نے نہا کر نیا سوٹ پہنا تھا بال کھلے۔

تھوڑے سوکھے تھوڑے کیلے۔ اس دن یونہی شوق میں تھوڑا میک اپ بھی کر لیا تھا۔“

”یہ نئی شوق میں...؟“ سارا مسکرائی۔

”پپ کرو۔“ نینا جھنجھلائی۔ اسے تو وہ راز معلوم کرنا تھا۔ جس سے مقابل ایک ہی ملاقات میں چاروں شانے چت قدموں میں پڑا ہو۔ پورے خاندان سے نکریں لے رہا ہو۔
”پھر...؟“

”پھر کیا...؟ میں دیوار سے پینٹنگ اتار رہی تھی کہ اس میں سے نپاک سے چھپکلی گری اور وہ بھی میرے پاؤں پر۔ میں جو ڈر کر بھاگی تو سامنے سے وہ آگئے۔“ صبیحہ شرمائی۔
”اور تم بن گئیں ان کے گلے کا بار۔ اس نے پیار سے تمہارے کانپتے وجود کو سنبھالا اور پوچھا ”کیا ہوا ڈر گئیں؟“ سارا نے اک طول سانس لے کر واقعہ پورا کیا۔

”ہائے اللہ! تمہیں کیسے پتا چلا۔“ مارے حیرت کے صبیحہ اچھلی اور اس کے اس جملے پر باقی تینوں۔
”پچھلے ماہ کا ڈائجسٹ میں نے بھی پڑھا ہے۔ غالباً“ موصوف نے نہیں پڑھا اسی لیے دام میں آگئے۔“
”خدا خواہی۔“ صبیحہ نے خاصا برا منایا۔ سارا نے پروا نہیں کی۔

”لیکن وہ ڈائجسٹ ضرور چھپا دینا۔ کہیں موصوف اس ناول کا اینڈ نہ پڑھ لیں۔“
سارا نے بات ختم کر کے نیا کو دکھا۔ جو منہ کھولے صبیحہ کو تک رہی تھی۔ مسرت کے پلے کچھ نہ پڑا۔
”اے۔۔۔ لرن منہ پر ہاتھ رکھے کھی کھی کر رہی تھی۔

”تم منہ کھولے بغیر بھی ہونتی لگتی ہو۔“

”ہوں۔۔۔“ نینا چونکی۔ جبکہ صبیحہ نے سارا کی باتوں پر توجہ نہ دیتے ہوئے مزید پھندے ڈالنے لگے۔
”میرے تو مزے ہیں۔ جب سے منگنی ہوئی ہے۔ بلا ناغہ میرے لیے کچھ نہ کچھ بھجواتے ہیں۔ کبھی اُس کریم، کبھی کیک۔ ایک بار جوڑبہ کھولا تو کیک پر لکھا تھا۔
”چندا! کبھی کھڑا تو دکھا دے۔“
”چندا! کھڑا۔“ نیا کو غش آنے لگے۔

”حوصلے کے ساتھ۔“ سارا نے تسلی دی۔ ساتھ ہی پوچھا۔
”موصوف خود کیسے ہیں؟“

خیال تھا کہ خود بھی یونہی سا ہو گا۔ صبیحہ نے پرس کھول کر تصویر نکالی۔۔۔ جو سب سے پہلے سارا کے ہاتھ آئی۔ تصویر دیکھ کر خود سارا کا منہ کھل گیا۔ اچھا خاصا خوب صورت، ویل ڈریسڈ نو جوان تھا۔
”کرتے کیا ہیں؟“ سارا نے تصویر نیا کی طرف بڑھائی۔ آخری خیال یہی تھا کہ شاید نکلا ہو۔
”ایم بی بی ایس کیا ہے۔ ڈینٹسٹ ہیں۔“ نیا کو صحیح معنوں میں قسمت پر اعتبار آگیا۔ ناصرو بھی آگئیں۔
”خوشدلی سے ملیں، مٹھائی کھائی، تصویر دیکھ کر خوش ہو گئیں۔“
”لڑکا خوب صورت ہے۔“

صبیحہ شواگئی۔ بھروسہ دین کر کہنے لگی۔

”آئی! اب نیا کے بارے میں بھی سوچیں۔ ان کے ساتھ کی تقریر“ ساری ہی لڑکیاں بیابہ گئی ہیں یا متکلی شدہ ہو گئی ہیں۔“

”ہائے۔ کل تک ہماری کیشگری میں تھی۔ اب ”شدہ“ ہو گئی ہے تو۔“ نیانے آہ بھری۔

”بس کیا کروں؟ کوئی ڈھنگ کا رشتہ ملے تو۔“ ہتیرے نیانے اشارے کیے۔ بھلا ایسی باتیں سیمیلیوں کو بتانے والی ہوتی ہیں۔ مگر کہاں، ماں آرام سے دکھڑے روتی رہیں۔

”ایسی بھی کوئی بات نہیں۔۔۔ رشتے تو کافی ہیں۔ بس پسند آنے کی بات ہے۔“ آخر نیا کو دخل اندازی کرنا ہی پڑی۔

”میرا خیال ہے۔ اب پسند کر ہی لو۔ معقول رشتے بھی بس اک عمر تک ہی آتے ہیں۔ اب تین سال تو کلچ چھوڑے ہو گئے ہیں۔“ صبیحہ نے ہلکا سا طنز کیا۔

نیا جتنا بھی تمللا سکتی تھی تمللائی۔ سارا مسکراتے ہوئے جگ میں بچا شرمٹ پتی رہی۔ خدا خدا کر کے صبیحہ نی سدھاریں۔

”کیسے کیسے لوگ ہمارے دل کو جلانے آجاتے ہیں۔“

سب اٹھ گئے۔ سارا وہیں نیا کے پاس بیٹھی گفتگو کرتی رہی۔ مگر نیا کے ارتکاز میں کوئی فرق نہیں پڑا۔ آخر اسے پکارنا ہی پڑا۔

”کیا سوچتی ہو نیا اب بی بی!“ نیانے اک طویل سانس لے کر سارا کی طرف دیکھا۔

”صبیحہ کے ساتھ ہونے والے اتفاق پر غور کر رہی تھی۔“

”ہا۔۔۔ اتفاق۔“ سارا دل کھول کر ہنسی۔ ”اتفاق سے نمائی۔ اتفاق سے میک اپ اتفاق سے چھپکلی۔ اتفاق سے موصوف ہا ہا۔ اتفاق سے سارے گھر والے غائب۔ ہو۔۔۔ ہو۔“

”مگر وہ ڈینٹسٹ گھاسل تو ہو گیا نا؟“

”عورت کے وجود میں بڑی کشش ہے۔ مگر صبیحہ یہ نہیں جانتی۔ وجود کی کشش عارضی ہوتی ہے۔“

سارا ذرا اسخیدہ ہوئی۔

”تم کچھ بھی کہو۔ متکلی تو ہو گئی۔ اور یہاں کوئی آثار ہی نہیں۔“ نیانے آہ بھری۔

”ہاں تمہیں پریشان ہونے کی ضرورت ہے مگر مجھے نہیں۔“

”کیوں تم میں کون سے سرخاب کے پر لگے ہیں۔ یا رشتے دوڑے چلے آ رہے ہیں۔“

”بھئی جہاں حسن، سلیقہ اور ذہانت یکجا ہوں۔ وہاں فکر کرنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ وہ اپنی لمبی چوٹی

پر ہاتھ پھیر کر بے نیازی سے گویا ہوئی۔

”اچھا کون کہتا ہے۔“ نیانے طنز کیا۔

”سلیقہ گھر والے مانتے ہیں۔ ذہانت کا گواہ میرا اکیڈمک ریکارڈ ہے اور رہ گیا حسن۔ تو وہ دیکھنے والے

لی آٹھ میں ہوتا ہے اور تمہاری آنکھیں۔ ”وہ جملہ ادھورا چھوڑ کر شرارت سے ہنسی۔
 ”تم نے صبیحہ کے سامنے بڑی بے عزتی کی۔“ نیانے اسے گھورتے ہوئے کہا۔ وہ اطمینان سے کھڑی ہو
 گئی۔

”تم ڈیرہ کرتی تھیں۔ اب ملکہ عالیہ کو تو بلنا بھی منظور نہیں۔ سو میں دیکھتی ہوں کہ کچن کی پوزیشن
 ایسا ہے؟“

”مال ہے لوگ ایک ہی دن میں کیسے دوسروں کو پاگل بنا لیتے ہیں۔“ وہ بہت دیر تک وہیں بیٹھی الجھتی
 رہی۔ یہاں تک کہ بے جی کی کپاٹ دار آواز آئی۔

”تم کیا وہاں اعتکاف میں بیٹھ گئی ہو۔“ وہ ہڑبڑا کر باہر بھاگی۔



اسے یہاں آئے کچھ دن گزر گئے تھے۔ سب سے زیادہ دوستی کرن کے ساتھ تھی۔ مگر جس سے وہ
 سب سے زیادہ متاثر تھی۔ وہ تھی صدف۔ بالکل ویسی جیسا اس نے شہر کی لڑکیوں کے بارے میں سوچا
 تھا۔ خوش لباس، خوش گفتار تو نہیں کہہ سکتے تھے۔ کہ گھر والوں کے ساتھ وہ کم ہی باتیں کرتی تھی۔
 آزاد، خود مختار کالج سے آتی تو اپنے کمرے میں بند ہو جاتی۔ بازار تک اکیلی چلی جاتی جو کہ مسرت کے
 نزدیک خاصی بہادری کا کام تھا۔

مسرت کو اس کا کمرہ بھی بہت اچھا لگتا۔ نفیس پردے، خوب صورت سنہری اور سبز بیلوں سے سجا
 کونے میں پڑا اسٹیریو، جس پر وہ انگریزی گانے سنتی۔ کتابوں سے بھری الماری، جس میں زیادہ تر کتابیں
 انگریزی ہی کی تھیں۔ ڈسٹنک ٹیبل پر بچہ بہت سے پرفیوم اور دیو اور پر لگی اس کی بڑی سی تصویر۔
 ”پہلے یہ کمرہ حارث بھائی کا تھا۔ پھر صدف آپنی نے لے لیا۔“ کرن نے اسے بتایا تو وہ چوکی۔
 ”حارث کون؟“

”چچی کا بیٹا۔ صدف سے چھوٹے حارث بھائی ہیں۔ پنڈی میں جاب کرتے ہیں۔“ تب اسے پتا چلا
 کہ عدیل اور عمیر نامرہ خاتون کے بیٹے ہیں۔
 ”ہیلو! تمہارا دل لگ گیا سونو۔“

وہ دادی کے تخت پر بیٹھی مومگرے صاف کر رہی تھی۔ جب صدف وہاں چلی آئی سفید کائن کا سوت
 جس کے دوپٹے اور قمیص پر سلور تلے کا نازک سا کام تھا۔ سلور ڈوریوں والی خوب صورت چپل۔ اسے
 کالج سے آئے تھوڑی ہی دیر ہوئی تھی۔
 ”جی۔ گوڈے گوڈے لگ گیا۔“
 ”واٹ۔“

مست نے زبان دانتوں تلے دپالی۔ کتنا سمجھایا تھا کہ اپنا یہ تکیہ کلام گاؤں میں ہی چھوڑ آتا ہے۔ مگر زبان تھی کہ پھل ہی جاتی۔

”جی۔۔۔ میرا مطلب ہے۔۔۔ اچھی طرح لگ گیا۔“

”ایک بلووا دی کے سامنے بھی پھینک دیا ہوتا۔“ بے جی نے کہا تو صدف ہنس دی۔
”السلام علیکم؟“

”وعلیکم السلام۔۔۔ جیتی رہو اللہ جلد اپنے گھریار کا کرے۔“

ان کی دعا پر صدف جزیر ہو گئی۔ وہ اچھی طرح جانتی تھی بے جی آج کل اسے گھریار کرنے کا مصمم ارادہ کیے بیٹھی ہیں۔۔۔ مگر جب تک اسے اپنے معیار کا بندہ نہ مل جاتا وہ کیسے ہاں کر سکتی تھی۔۔۔ اور جہاں تک اس کے قائم کردہ معیار کی بات تھی۔ اس میں دقت گزرنے کے ساتھ ساتھ اضافہ ہی ہو رہا تھا۔ وہ طویل سانس لے کر بیٹھ گئی۔

”خیر ہے۔۔۔ آج دادی کو اتنی لفٹ کیوں؟“ نہیں اپنی اس پوتی سے شکایتیں ہی شکایتیں تھیں۔

”مجھے فروا اور اس کے شوہر کی دعوت کرنی ہے۔“ صدف نے ٹوٹی پوائنٹ بات کی۔

”بس سیلیوں کی دعوتیں نبھاتی رہنا۔“ بے جی بڑبڑائی۔

”مجھ سے کچھ کہا؟“

”ضرورت کیا ہے۔۔۔ ایسی کون سی رشتہ داری ہے۔“ انہوں نے حسب توقع اعتراض کیا۔

”ضرورت ہے۔ سب کو لیکز کر رہی ہیں۔ مجھے بھی کرنا پڑے گی۔ اگر کوئی پراہلم ہے تو کھانا ہوٹل سے آجائے گا۔“

”کیوں؟ اس گھر میں کیا کھانا نہیں پکتا۔“ بے جی نے غصے سے گھورا۔

”تو پھر پرسوں بلا لوں؟“

”جاؤ بی بی! بلاؤ۔“

مست کو سمجھ میں نہیں آیا۔۔۔ بے جی اس سے اتنا چڑی ہوئی کیوں ہیں جبکہ بے جی صدف کے جانے کے بعد بھی بہت دیر تک بڑبڑاتی رہی تھیں۔



صبح سے گھر میں ایمر جنسی نافذ تھی۔ صدف نے تو خیر کسی کام کو ہاتھ لگایا نہ تھا۔۔۔ شامت باقیوں کی

آئی تھی۔۔۔ نایاب اور سارا کچن میں، کرن ملازمہ کے ساتھ ڈرائنگ روم کی تزئین و آرائش میں۔ جبکہ عمید اندر باہر کے چکروں میں کھپ گیا۔ مست کچھ دیر کچن میں ساتھ دیتی رہی۔۔۔ مگر عجیب و غریب کھانوں کے عجیب و غریب نام سر پر سے گزر گئے۔

”یہ وائٹ ساس دینا۔“ نیانے کہا تو وہ ہکا بکا منہ دیکھنے لگی۔
 ”یا اللہ! کس کی ساس؟ وہ بھی وائٹ۔ یعنی کہ سفید۔“
 وہ تو غصیت ہوا کہ تخت پر بیٹھی ککستی بے جی اٹھ کر کچن کا جائزہ لینے آگئیں۔ وہ بہانے سے کچن سے کھسک کر کزن کمپاس ڈرائنگ روم میں چلی آئی۔
 بے جی کچھ لمحے ناک پر انگلی رکھے ان غلامی کھانوں کا جائزہ لیتی رہیں۔ پھر ایک ڈش کی طرف اشارہ کر کے پوچھا۔

”یہ کیا ہے؟“ نیاپاشا کے اوپر قیمہ اس پروائٹ ساس کی تہہ لگاری تھی۔
 ”پاشا دو وائٹ ساس۔“
 ”حق ہا۔ تمہارے نصیبوں میں ساس کہاں۔“ انہوں نے آہ بھری اور سارا کی طرف متوجہ ہوئیں۔
 ”تم کیا بنا رہی ہو؟“
 ”کچو موم۔“ وہ بڑی عرق ریز سے ان انواع و اقسام کی سبز یوں کو باریک باریک کاٹ رہی تھی۔
 ”اس۔۔۔ کس کا؟“

”کچو مرسلہ بنا رہی ہوں۔“ اس نے وضاحت کی۔
 ”تھوڑی دیر میں ٹوٹے ٹوٹے بریانی اور دم نکلا قیمہ بناؤ گی۔ کوئی ڈھنگ کی چیز نہیں بنائی۔“
 ”جیسا مینہان، ویسا مہمان اور ویسا ہی مینو۔“ سارا نے آہ بھری۔
 ”لیڈی ڈیانا خود کہاں ہیں؟“ انہوں نے غالباً صدف کا پوچھا تھا۔
 ”ما مجھ رہی ہیں۔“
 ”آج برتنوں کے نصیب کیسے کھل گئے۔“

”اپنا منہ مانجھ رہی ہیں۔“ نیانے پاشا اوون میں بیک ہونے کے لیے رکھا۔
 ”ہو نہ ہو۔ جو مرضی کر لے۔ رہے گی تو پھیکا گوٹنگو۔ سر بر بال، وہ بھی چار گنجی ککڑی۔“ داوی کا غصہ ابھی تک ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔
 ”کون سی ککڑی۔“ سر تپا لشکتی چمکتی صدف نے عنابی کلر کے سوٹ میں انٹری دی۔
 ”گنجی؟“
 ”کیا گنجی۔“

”وہ بے جی اپنی گنجی مرغی کا قصہ سنارہی تھیں اور پوچھ رہی تھیں گوٹنگوؤں کی ڈش نہیں بنائی۔“ سارا نے بتایا۔
 ”گوٹنگو، مائی گاڈ۔“ اس نے نخت سے سر جھٹکا۔ ”یہ کون کھاتا ہے؟“
 ”کون جانے؟ کس کا نصیب بنتا ہے یہ پھیکا گوٹنگو۔“ بے جی نے سر تپا صدف کو دیکھا اور باہر چلی گئیں۔

”نیا اور سارا کے قہقہے چھت پھاڑتھے۔ صدف نے انہیں بری طرح گھورا اور بڑبڑائی۔
”بے وقوف لڑکیاں۔“

”ایکس کیوزی یہ بے وقوف لڑکیاں صبح سے چکن میں آپ کی خاطر کھپ رہی ہیں۔“ سارا نے کہا۔ تو وہ
بے نیازی سے پوچھنے لگی۔

”سب چیزیں تیار ہیں۔“

”ہاں آپ کے مہمان کب آئیں گے؟“

”بس آدھے گھنٹے تک۔ اور پلینے اپنے چلے بھی درست کرلو۔“

”ہونہ۔ خود تو کسی چیز کو ہاتھ لگانا منع ہے۔“ غصے میں کچو مرسلاد کچھ زیادہ ہی کچو مرکی شکل اختیار کر گیا
تھا۔

”میں نے کہا تھا۔ کھانا ہوٹل سے منگوا لیتے ہیں۔ تم لوگوں کو شوق ہو رہا تھا کوکنگ کا۔“ صدف نے ان
کی بڑبڑاہٹلی تھی۔ تب ہی خوب صورت سی ناک چڑھا کر بولی۔

”ہمیں نہیں۔ ہماری امیوں کو۔“ نایاب نے وضاحت دی۔

”اب صبح سے چکن میں نہیں جھانکا۔ آخر ہماری امیاں ہیں کہاں؟“

”تمہیں کیا امیوں کا اچار ڈالنا ہے جو ان لڑکیوں کے ہوتے مائیں کام کریں۔ شرم سے ڈوب مرو۔
ایسی بات سوچتے ہوئے بھی۔“ عالیہ بیگم نے آتے ہی لتاڑ دیا۔

”کپڑے بدلنے ہیں چچی جان۔ اب ان ماسیوں کے چلے میں مہمان ریلیو کریں گے۔“ سارا نے سلاد
میں نہتون شامل کر کے فریق میں رکھا۔

”ہاں۔ ہاں تم دونوں تیار ہو جاؤ۔ باقی ہم دیکھ لیں گے۔“ ناصر نے اندر آتے ہوئے کہا۔

”بریانی دم پر ہے۔ دس منٹ بعد اون سے پاشا نکال لیجئے گا۔ کوفتوں پر دھنیا ڈال دیں۔ کباب اور
روٹیاں مہمانوں کے آنے پر تل دوں گی۔ چکن کڑا ہی اور چکن پیس بالکل تیار ہیں۔“ سارا نے جلدی
جلدی ہدایات دیں۔

”اور بیٹھے میں۔“ صدف نے چونک کر پوچھا۔

”رس ملائی اور آکس کریم بازار سے آجائے گی۔“ بیچا نے عمید کو۔ سارا نے تسلی دی۔ باقی کام اوں
پر چھوڑ کر وہ دونوں تیار ہونے چلی گئیں۔

”باقی! میں کون سا سوٹ پہنوں۔“ مسرت نے کرن سے پوچھا۔

”جو مرضی پہن لو۔“

”یہ پہن لوں۔“ اس نے وہی سوٹ نکالا جس کے ساتھ چوڑی داہرا پانچا جمہ تھا۔

”ہاں۔ اچھا ہے۔“

اس نے خوشی خوشی وہی سوٹ پہنا۔ میک اپ بھی کیا۔ ٹی وی اور رسالوں نے میک اپ کا سلیقہ

ضرور سکھادیا تھا۔ اماں سے چھپ کر کی گئی پریکٹس بھی کام آئی۔ جب اس نے بے حد اہتمام سے اپنی میک اپ کٹ کھولی تو کرن نے ہنسی چھپانے کو رخ بدل لیا۔ مگر جب فارغ ہوئی تو بے اختیار سراہا۔ کوئی بھی چیز چہرے پر تھوپی ہوئی نہیں لگ رہی تھی۔
 ”واہ، تمہیں تو بہت اچھا میک اپ کرنا آتا ہے۔“ مسرت ذرا سہاگنی۔ کرن کو ہلکی سی جلن کا احساس ہوا اس کی حسامت قد و قامت بے حد متناسب تھی۔ جو بھی پستی سوج جاتا۔
 ”بال کھلے چھوڑ دوں؟“

”نہیں باندھ لو۔ بے جی ٹوک دیں گی۔“

مسرت نے دو چار بل دے کر کچھ لگا کر نیچے سے بال کھلے چھوڑ دیے۔ تیار ہو کر نیچے آئیں تو مہمان آچکے تھے۔ میون اور اسکن ساڑھی میں چمکتی دھمکتی فروا، سفید کاشن کے شلوار قمیض میں ملبوس اس کا سادہ مزاج شوہر، یادامی کڑھائی والا دوپٹہ اوڑھے شفیق سی خاموش طبع فروا کی ساس، سفید بریزے کے خوب صورت لباس میں، فروا کی وہی نند جو شادی پر ملی تھی۔ شادی کی نسبت وہ آج زیادہ پروقار، خوب صورت اور نازک لگ رہی تھی۔ سوٹ کی مناسبت سے سفید نگوں والا کنڈن کاسیٹ، جس کے ساتھ کڑے بھی تھے۔ جو سونو کو خاصے پسند آئے۔ اور نواز شریف، فروا کے جیٹھ۔ جو آج بھی صدف کو دیکھ کر ست بن گئے تھے۔

”بھائی جان۔“ بہن کے ٹوکے بمشکل انہیں ڈرائنگ روم تک لائے۔

بے جی جو صبح سے بے زار پھر رہی تھیں۔ مہمانوں کے آنے پر ایکٹو ہو گئیں۔ فروا کی ساس سے مل کر کھل اٹھیں۔ پیچھے سے وہ لوگ بھی گاؤں سے تعلق رکھتے تھے۔ پھر جو دونوں کی آپس میں بنی تو بے جی نے کھانے کے لیے ٹیبل تک جانے سے بھی انکار کر دیا۔
 ”ہم تو یہیں کھانا کھائیں گے۔“

”ہاں۔ ہاں۔ کرسی میز پر تو مجھ سے بھی نہیں کھایا جاتا۔ ٹانگوں میں درد ہونے لگتا ہے۔“ ساس صاحبہ نے بھولہن سے بتایا۔ ”ہم تو دسترخوان بچھا کر کھانا کھاتے ہیں۔“
 لا محالہ انہیں کھانا وہیں دے دیا گیا۔

کھانا خاصے خوشگوار ماحول میں کھایا گیا۔ نواز شریف اول تو نظریں اٹھاتے نہ تھے۔ اگر اٹھاتے تو جھکا کر بھول جاتے۔ ساس صاحبہ ان کے تیر و دیکھ دیکھ کر تپتے کو تاب کھا رہی تھی۔
 ”بھیا! ذرا پانی دیجئے گا۔“ بہن نے توجہ بھٹکانا چاہی۔ انہوں نے ہاتھ میں پکڑا اچھا اس کی پلیٹ میں رکھ دیا۔

”بھیا! پانی!“ وہ جبر ہوئی۔ انہوں نے پوری پلیٹ اسے بخش دی۔ دوسرے پل بری طرح اچھلے۔
 ”کیا ہوا؟“ سبھی ایک دم متوجہ ہوئے۔

”ک۔ کچھ نہیں۔“ انہوں نے کھاجانے والی نظروں سے بہن کو گھورا۔ جس کی نازک ہیل نے ان

کاپاؤں پھل ڈالا تھا۔ باتوں میں مگن صدف اور فروا متوجہ ہوئیں۔
 ”ارے! آپ نے تو کچھ لیا ہی نہیں۔“ صدف نے ان کے سامنے خالی جگہ کو دیکھا۔ پھر بہن کو جو دو پلیٹیں سنبھالے بیٹھی تھی۔

”آپ نے کچھ دیا ہی نہیں۔“ صدف کی نظر کرم سے ان کی باچھیں کھل گئیں۔
 ”سب کچھ سامنے ہی تو ہے۔“

”نظر کہاں کچھ آتا ہے۔“ انہوں نے ڈونگا اٹھا کر سالن ڈالا۔
 ”اوہ۔ اسی لیے سالن کی پلیٹ میں فرنی ڈال رہے ہیں۔ غالباً“ آئی سائٹ ویک ہے۔“ صدف نے افسوس کا اظہار کیا۔

”جی۔“ انہوں نے بوکھلا کر پلیٹ پر نظر کی جب کہ صدف مشورہ دے رہی تھی۔
 ”آپ لینس کیوں نہیں استعمال کرتے؟“

”اب کروں گا۔“ انہوں نے مدد طلب نگاہوں سے بہن کو دیکھا۔
 ”ان کی آئی سائٹ بالکل ٹھیک ہے۔ بس حواس ذرا اڑے اڑے ہیں۔“ بہن نے چپا چپا کر کہا۔
 ”اوہ۔ بچپن سے ہی۔“
 ”نہیں تازہ تازہ حادثہ ہے۔“

فروا نے اشارے سے نند سے ”کیا ہوا“ پوچھا۔ اس نے جزبہ ہوتے ہوئے نفی میں گروں ہلائی۔
 دعوت بہت اچھی رہی۔ باقی لڑکیوں نے کھانا الگ ہی کھایا تھا۔ کھانے کے بعد جب فروٹ چائے اور کولڈ ڈرنک کا دور چلاتا تب موڈ راننگ روم میں چلے گئے اور لڑکیوں نے لاؤنج میں ڈیرہ جمالیا۔ مسرت عرف سونو نے خاصا انجوائے کیا۔

دعوت بہت اچھی رہی۔ بے جی مہمانوں سے مل کر خاصی خوش ہوئیں۔ صدف کے مہمانوں سے متعلق جیسا تصور ان کے ذہن میں تھا مہمان ان سے بالکل مختلف نکلے۔ سادہ اور ملنسار۔
 ”دیکھا۔ فروا کے والدین نے خاندانی لوگ تلاش کیے ہیں۔ روپیہ پیسہ خوب صورتی سب ثانوی چیزیں ہیں۔ لڑکی اپنے گھر کی ہوئی۔ ماں باپ بھی ہلکے پھلکے ہو گئے۔“
 بے جی مہمانوں کے جانے کے بعد خاتمانہ بھولیں۔ عالیہ غصے میں صدف سے الجھنے لگیں۔
 ”پورے گھر کو بلا نے کی کیا ضرورت تھی؟“

”میں نے تو صرف فروا اور اس کے میاں کو انوائٹ کیا تھا۔ سب آگئے تو کیا گھر سے نکال دیتی۔“
 صدف نے تنک کر کہا۔

”اچھا ٹھیک ہے! اپنے نصیب کا کھا گئے کھانا تو پورا ہو گیا۔ کوئی کمی تو نہیں رہ گئی؟ بے جی نے رسائیبت سے کہہ کر پوچھا۔

”جی۔ بہت اچھی دعوت ہوئی۔ شکریہ۔“
 ”تو بہ اس لڑکی میں کیسا اوپر اپن ہے۔“ بے جی بیڑا نے لگیں۔

اگلے دن جب صدف اسٹاف روم میں جب ساری ہی فرینڈز موجود تھیں۔ ہنس ہنس کر سب کو فروا کے جیٹھ کے ہونق پن کے قہے سنا رہی تھی۔ فروزاں جس نے ابھی تک فروا کی دعوت نہیں کی تھی پوچھنے لگی

”اس کے سسرال والے کیسے ہیں؟“

”سادہ پنڈو سے بندے ہیں۔“ صدف نے ناک چڑھائی۔ ”ایسے لوگوں میں شادی سے بہتر ہے انسان تمنا زندگی گزارے۔ جن سے آپ کامینٹل لیول نہیں ملتا۔ ان کے ساتھ ساری زندگی کیسے گزر سکتی ہے۔“

”ایسی بھی کوئی بات نہیں۔۔۔ پڑھے لکھے لوگ ہیں۔ خاص طور پر فروا کے شوہر تو بہت شائستہ گفتگو کرتے ہیں۔“ صبیحہ نے کہا اس سے قبل کہ صدف مزید کچھ کہتی فروا آگئی۔

”او“ کو تمہارا ہی ذکر خیر ہو رہا تھا۔“

”پتا ہے محترمہ تبصرے فرماری ہوں گی۔“ اس نے ہنستے ہوئے صدف کی طرف اشارہ کیا۔

”ہال۔ نواز شریف پر۔“ سب ہی ہنس دیں۔

”ایسے تو نہ کہو۔ اتنے شریف اور بے ضرر سے انسان ہیں۔“ فروا نے جلدی سے حمایت لی۔

”ہال۔ تھوڑے سے بے وقوف اور حواس باختہ۔“ صدف ہنسی۔

”ایسی کوئی بات نہیں۔ بہت معقول بندے ہیں۔ بس آج کل خواب دیکھ رہے ہیں۔“

”کیسے خواب؟“

”میاں بننے کے۔“

”کس کے میاں۔“ سب نے باجماعت پوچھا۔

”صدف کے۔“ اس نے آرام سے جواب دیا۔

صدف بھونچکی رہ گئی۔

اس کا ہاتھ نوکری میں رنگا۔ پھر خالی ڈنڈیوں کو چھو کر اک طویل سانس بھرتے ہوئے بولی۔

”یار! زندگی میں کچھ بھی نہیں رہا۔“

”اچھا۔“ کرن نوکری پر جھکی پھر اک موٹا سا انگور کا دانہ برآمد کر کے چمکی۔

”نہیں۔ ابھی کچھ نہ کچھ باقی ہے۔“

”نہیں۔ یہ کہاں سے ملا؟“ نایاب نے نوکری قابو کی مگر تلاش بے سود۔

”کیسی لڑکیاں ہو؟ انگور کے ایک دانے پر اتنا خوش ہو رہی ہو۔“ صدف نے ناگواری سے ناک

چڑھائی۔ اس کے ہاتھ میں اک موٹی سی کتاب تھی۔

”گوروں کے بلغ تو ملنے سے رہے۔“ کرن نے رسالے پر اٹھلیاں بجاائیں۔

”انسان کو اچھی امید رکھنا چاہیے۔“

”اتنے خوش گمان نہیں کہ اتنے بڑے بڑے خواب۔“

”ف! یہ قناعت پسند لڑکیاں۔“ صدف بھنا گئی اور ایک لمبا چوڑا انگلیش میں لیکچر دے ڈالا۔ جس کا لب لباب یہ تھا کہ آخر ان میں کس چیز کی کمی ہے کہ وہ خواب دیکھنے سے ڈرتی ہیں۔ خواب دیکھنا (بڑے بڑے) اور ان کی تعبیر حاصل کرنا ان کا حق ہے۔ آخر وہ لوگ کیوں ہر چیز کو تقدیر کا لکھا سمجھ کر قبول کر لیتی ہیں۔ یہ جاہلوں کا کام ہے۔ اور وہ لوگ جاہل نہیں۔ کم از کم صدف تو بالکل نہیں۔

”تم سے اچھی تو یہ میٹر کپاس سونو ہے۔ جس کے اندر کچھ بدلنے اور اپنی منوانے کا جذبہ تو ہے۔ اسے شہر میں رہنے کا شوق تھا۔ اپنے گھر والوں سے یہ بات منوائی اور تم لڑکیاں۔ کنوئیں کی مینڈک۔“

ساری انگریزی سر پر سے گزر گئی۔ مگر آخری جملے اردو میں تھے۔ وہ خوش ہو گئی۔

”جی۔ بالکل۔ بالکل۔“

”کس بات پر بالکل۔ ہمارے مینڈک ہونے پر۔“ نیانے گھورا تو مسرت گزر رہا گئی۔

”نہیں۔ میں تو۔“

”صدف! کم از کم آپ گھر کو تو کالج سمجھنا چھوڑ دیں۔ میں کب سے آوازیں دے رہی ہوں اور یہاں لیکچر ختم نہیں ہو رہا۔“ سارا اوپر آئی۔ وہ سب اس وقت ٹیرس پر بیٹھی ٹھنڈی ہوا کے جھونکے لے رہی تھیں۔ جو سیاہ و سرمئی بادل اڑا لائے تھے۔ مگر بادلوں کو شاید کسی اور دیس برساتا تھا۔ سو ہوا کے کھٹولے پر سوار ان کے سروں پر سے گزرتے چلے جا رہے تھے۔

”تو تم پہلے ہی اوپر قدم رنج فرما لیتیں۔“ نیانے کہا۔

”تم لوگوں کی طرح فاسق ہوتی تو ضرور فرماتی۔ سارا گھر تو میرے سر پر ہے۔“ وہ جھنجھلائی کہ کچن میں بانڈی لگنے کا خدشہ تھا۔

”اب بتا چلا تم سچی کیوں ہوتی جا رہی ہو۔“ نایاب نے غور سے اس کے سر کی طرف دیکھتے ہوئے کہا۔

”میرے سر پر نغ۔“ سارا کے ہاتھوں کے طوطے اڑ گئے۔ وہ اپنے بالوں کے بارے میں خاصی حساس تھی کہ پورے خاندان میں اتنے لمبے، گھنے اور خوب صورت بال کسی اور کے نہ تھے۔

”سارا! گھر تمہارے سر پر جو ہے بالوں کے لیے جگہ کہاں پچی ہوگی۔“

”فوفہ۔“ وہ بھنا کر صدف کی طرف مڑی۔ ”آپ کو بے جی بلارہی ہیں۔“

”کیا۔“

”پتا نہیں۔ شاید کوئی بات کرتا ہے۔“

”کون سی بات۔؟ اس نے ابرو اچکائے۔“

”دو کا پہاڑ سننا ہوگا۔“ کرن نے لقمہ دیا۔

”خود ہی جا کر پوچھ لیں۔ میری ہانڈی لگ جائے گی۔“ سارا جیسے آئی تھی ویسے ہی چلی گئی۔

”بائیں۔ سہا تیریں۔ بے جی آپ کو صرف ایک ہی موقعہ پریاد کرتی ہیں۔ جب کوئی رشتہ متوقع ہو۔“

کرن اور نیا دونوں ہی ہنس دیں۔

”اف۔۔۔ بے جی اور ان کے رشتے۔۔۔ آخر میرا اور ان کا معیار میچ ہو بھی کیسے سکتا ہے۔“

وہ کتاب ایک طرف رکھ کر کھڑی ہو گئی۔ صبح پیشانی پر سلوٹیں پر لگیں۔ نیچے عالیہ اور ناصروہ باتوں میں مشغول تھیں۔ ناصروہ کے ہاتھ میں کروشہ کی سلاخیاں تھیں۔ وہ سفید دوپٹے پر نفیس سی نیل کاڑھ رہی تھیں۔

”وہ تمہارے لیے کوئی رشتہ لیے بیٹھی ہیں۔ تمہارے باپ کو بھی اپنا ہم نوا بنالیا ہے۔“ عالیہ چھوٹے ہی بولیں۔

”ان سے کہیں، میرے لیے اتنی زحمت نہ کیا کریں۔“

”رشتے تو بڑے ہی تلاش کرتے ہیں۔ اب اپنے لیے خود تو ڈھونڈنے سے رہیں۔“ ناصروہ نے رسائیت سے سمجھانا چاہا۔ وہ کھٹ سے بولی۔

”کیا حرج ہے؟“

”ہیں۔۔۔“ ناصروہ نے تعجب سے اسے دیکھا۔ عالیہ بھی جڑبڑ ہو گئیں۔ صدف کو اس جواب کی توقع نہ تھی۔ جبکہ صدف اطمینان سے بے جی کے کمرے میں چلی گئی۔ وہ اپنے پٹنگ پر نیم دراز تھیں۔

”جی، بے جی! آپ نے مجھے بلایا۔“

”ہوا کے گھوڑے پر آئی ہو۔ بیٹھ جاؤ۔“ بے جی نے حکمانہ انداز میں کہا تو وہ بید کے کنارے بیٹھ کر ٹانگ پر ٹانگ چڑھا، ناخنوں کا معائنہ کرنے لگی۔

”بد تمیزیاں کی بد تمیز بنی۔“ بے جی دل ہی دل میں جلیلائیں۔

”شادی کرنا ہے۔“ لہجہ ایسا تھا کہ صدف سمجھ نہ سکی کہ پوچھا جا رہا ہے یا بتایا گیا ہے۔ اس نے حیرت سے بھونکیں اچکائیں۔

”اس عمر میں۔۔۔؟“

”عمر کو کیا ہوا۔۔۔ چند ایک سال اوپر نیچے ہونے سے کیا ہوتا ہے۔“ نہیں پوتی پر ترس آگیا۔

”میرا خیال ہے۔ کافی دیر ہو چکی۔ بہر حال امیدوار کون ہے۔؟“ بروہاری سے استفسار کیا۔ ”تھوڑی دیر کے بعد انتخابی نشان بھی پوچھ لینا۔ اے ہے۔ میں کوئی سیاست سیاست کھیل رہی ہوں۔ بھلے لوگ ہیں۔“ انہوں نے تفصیل بتائی۔ سوچاں تو بے عقل ہے۔ شاید بیٹی کو عقل آجائے۔ یہ بھی شکر تھا کہ اسے اپنی بڑھتی عمر کا احساس تو تھا۔

”عمر کیا ہوگی۔۔۔؟“

”تم سے دو چار سال بڑا ہی ہوگا۔“ انہوں نے تسلی دی۔

”پھر تو۔۔۔ بالکل ہی نامناسب ہے۔“

”کیا بالکل ہی تنہا مانا ہے۔؟“ بے جی تنک کر بولیں۔

”اگر ایسا کوئی خیال تھا تو ادا جان کی وفات کے فوراً بعد ہی۔۔۔“

”ہیں۔ اس وقت تمہاری عمر ہی کیا تھی۔؟“ نہیں صدف کی دعاغی حالت یر شبہ ہوا۔
 ”میری۔“ صدف نے چونک کر انہیں دیکھا۔

”اے تو کیا میری۔؟“ وہ جھنجھلا گئیں۔

”تو آپ اپنی بات نہیں کر رہیں۔“ صدف نے حیرت سے دریافت کیا۔

”تیرا دعاغ چل گیا ہے۔“ بے جی کئی فنٹ اوپر اچھلے۔ ”میں اس عمر میں اپنے سر میں سواہ ڈالوں گی۔ کیسی بے ہدایتی اولاد ہے عالیہ کی۔ دعاغ ٹھیک ہے عقل ٹھکانے ہے۔ بزرگوں سے مذاق کرتے شرم نہیں آتی۔“

انہوں نے بے بھاد کی سنائیں۔ صدف نے خاموشی سے سن لیں۔ پھر کھڑی ہو گئی۔
 ”آپ خواجخواہ تھا ہو رہی ہیں۔“

”سب تمہاری مال کی شہہ ہے۔ اس نے بزرگوں کی عزت کرنا سکھایا ہی نہیں۔ خود کی ہوتی تو ہی اولاد یکھتی۔“

”خیر امی کے ساتھ تو آپ کی دشمنی خاصی پرانی ہے لیکن میرا مشورہ مانیں۔ اگر آپ کی نظر میں پر پوزل اتنا ہی اچھا ہے تو سارا کی کر دیں۔“ اس نے لاپرواہی سے کہا۔
 ”تم نے کیا جوگ لیتا ہے؟“

”یہ لوگ میرے اسٹینڈرڈ کے نہیں۔“ وہ صاف انکار کر کے چلتی بنی۔

”ہاں۔ ہاں۔ کروں گی۔ اب تو سارا ہی کی کر دیں گی۔ یونی بیٹھی رہنا۔ دیکھوں گی آسمان سے کون سے شہزادے اترتے ہیں۔ مہارانیال۔ منہ نہ مٹھا۔ جن پہاڑوں تھا۔ سارا افسہ سارا۔“
 بے جی کی آواز ہی ایسی بلند تھی کہ سارا سر پٹ بھاگتی ہوئی آئی۔ دونوں ہاتھ آٹے میں سے تھے۔
 ”جی بے جی۔“

”شادی کرنی ہے۔“

”جی۔“ جہاں سارا ابھونچکی رہ گئی۔ وہیں بے جی نے تیزی سے اپنے جملے کی تصحیح کی۔
 ”تم نے شادی کرنا ہے؟“

”پہلے ہاتھ دھو لوں۔“ اس نے ڈرتے ڈرتے بے چارگی سے پوچھا تھا۔



ملازمہ نے واشتک مشین لگا رکھی تھی۔ کنن نے سب کمروں سے کپڑے اکٹھے کر کے ڈھیر لگا دیا۔
 مہم اور ماتہ کالج جا چکی تھیں۔ صدف بھی تھوڑی دیر قبل ہی گئی تھی کہ اس کا آج تیسرا پیرڈ تھا۔ بے جی نے اس سے بول چال بند کر رکھی تھی۔ صدف کو خاص پروا بھی نہ تھی۔ پہلے کون سا ان کے پاس بیٹھ کر داستان امیر حمزہ سنا کرتی تھی۔ دوسرے پتا تھا بے جی کی یہ ناراضی چند روزہ تھی۔ کچھ دنوں کے بعد دوبارہ اپنی مہم پر نکل کھڑی ہوں گی۔ اگرچہ وقتی طور پر اس نے بے جی کو ٹال دیا تھا۔

کرن اپنے اور مسرت کے لیے چائے بنا کرٹی وی کے سامنے بیٹھ گئی۔ مسرت کو تو یوں بھی ٹی وی دیکھنے کا شوق تھا۔ یہاں یہ شوق بڑے اچھے طریقے سے پورا ہو رہا تھا۔
 ”ایسے گھر کہاں ہوتے ہیں۔“ اس نے ڈرامے میں دکھائی جانے والی شان دار عمارت کی طرف اشارہ کیا۔

”خوابوں میں۔“ کرن نے برجستہ کہا۔
 ”میں سمجھتی تھی شہروں میں سارے گھر ایسے ہی ہوتے ہیں۔“
 ”نہیں مشہروں میں ہم جیسے غریب غریبا بھی ہوتے ہیں۔ جو سارا سال دیہاتی رشتے داروں کی طرف سے ملنے والی سوغاتوں کے منتظر رہتے ہیں۔“ کرن نے اطمینان سے چائے کا گھونٹ بھرا۔ مسرت قدرے حیرت سے اسے دیکھنے لگی۔

”کیوں شہروں میں یہ سوغاتیں نہیں ملتیں۔“
 ”پیسے والی ڈیر پیسے پیسہ ہو تو ہر چیز دستیاب ہے۔ مگر جہاں بات پنڈ ٹوماؤ تھ والی ہو وہاں صرف حسرتیں ہیں۔“

”چھال۔“ وہ کچھ حیران ہوتی اس کی بات پر غور کرنے لگی تب ہی سارا چلی آئی۔ انہیں یوں اطمینان سے بیٹھا دیکھ کر بے چارگی سے بولی۔
 ”یہ سمجھ رہا ہوں نا بھی مصیبت ہی ہے۔“

”کیوں۔؟“ کرن نے بغیر نظروں کا زاویہ بدلے پوچھا۔
 ”ایسی عیاشی ہمیں تو کبھی نصیب نہ ہوئی۔“ اس نے ٹی وی اور چائے کی طرف اشارہ کیا۔
 ”اپنی ذات کے لیے تھوڑی بہت ڈنڈی مارنا انسان کا حق ہے۔“
 ”ہا۔۔۔ سارے حق تمہارے اور سارے فرائض ہمارے کھاتے میں لکھ دیے گئے ہیں۔“ وہ ٹھنڈی سانس بھرتی فلور کشن کھینچ کر وہیں بیٹھ گئی۔

”نیا کہاں ہے۔؟“
 ”کہیں رسالہ کھولے ہیرو ٹائٹل کی ترکیبیں ڈھونڈ رہی ہوگی۔“ کرن ہنس دی۔
 ”باجی! میں آپ کے لیے چائے بنا دوں۔“ مسرت نے آفر کی۔ یہاں کچن میں کھڑے ہو کر کام کرنے کا اپنا ہی مزا تھا۔

”اتنی گرمی میں چائے بے وقوف پیتے ہیں۔“
 ”تم ہمیں باجماعت بے وقوف قرار دے رہی ہو۔ ویسے میں دیکھ رہی ہوں ذمہ داریاں تم پر بوجھ بننے لگی ہیں۔“

”دل اوب گیا ہے روٹین ورک سے کوئی ایکٹیوٹی ہی نہیں۔“
 ”اب نہماری شادی ہو جانی چاہیے۔“ کرن نے فیصلہ کن لہجے میں کہا۔
 ”میرا بھی یہی خیال ہے۔“

مست کو ایک دم شفیق یاد آگیا۔ بجائے کیوں؟
 ”سنو! تم نے کہیں سچ سچ اس مولوی سے شادی کا پروگرام تو نہیں بنالیا۔“ کرن ڈرامہ چائے سب بھول گئی۔

”کیا حرج ہے؟ صراطِ مستقیم پر چلنے والا بندہ ہے۔ ہمیں بھی سدھار دے گا۔“ کرن کو وہ جی جان سے راضی نظر آئی۔

مست بھی متذبذب سی سارا کا چہرہ دیکھنے لگی جہاں انہی سکون ولا پروائی تھی۔

”لیکن“ کرن نے الجھ کر کچھ کہنا چاہا۔ پھر خاموش ہو گئی۔

سارا الجھوں میں اس کی الجھن پائی۔ اس گھر کی لڑکیاں کہیں نہ کہیں صدف کے خیالات سے متاثر ہونے لگی تھیں۔

”کرن! خواب دیکھو، لیکن خواب پرست مت بنو، زندگی کو حقیقت کے آئینے میں پرکھنا سیکھو۔ میں عام سے گھر کی عام سی لڑکی، کیسے محلوں کے خواب دیکھوں، محلوں میں رہنے والا شہزادہ، کسی شہزادی کا تمنائی نہ ہو گا۔ کوئی پرنس چارمنگ مجھ جیسی معمولی شکل کی لڑکی کا خواہش مند کیوں ہونے لگا۔ میں احساسِ کمتری میں زندگی نہیں گزارنا چاہتی۔ میں ایسے گھر جانا چاہتی ہوں۔ جہاں میری ضرورت ہو۔ کسی ایسے شخص کا ساتھ جس کی زندگی میں میرا اتنا تبدیلی کا باعث بنے جہاں ہم دونوں ایک دوسرے کے لیے لازم و ملزوم ہوں۔“ وہ سنجیدگی سے کہتی چلی گئی۔

”اچھی زندگی کی خواہش کرنا غلط ہے؟“

”خواہش کرنے اور خواہشوں کے گرداب میں الجھ کر وقت ضائع کرنے میں بہت فرق ہے۔“ سارا نے برجستہ جواب دیا۔ کرن فوراً ”اس کا اشارہ چاہتی“

”تمہارا مطلب ہے کہ صدف وقت ضائع کر رہی ہیں؟“

”آئیڈیل کہاں ملتے ہیں۔ کوئی بھی انسان خامیوں سے مبرا نہیں۔ صدف نے آئیڈیل کی تلاش میں کتنے اچھے اچھے رشتے گنوا دیے۔ پچا جان کتنا پریشان رہنے لگے ہیں۔ اسے احساس ہی نہیں۔ کہیں نہ کہیں تو کھپو و ماؤز کرنا پڑتا ہے۔ مگر چچی اور صدف اس کے لیے تیار نہیں۔ ان کی دیکھا دیکھی تباہ کا ذہن بھی ویسا ہی بن گیا ہے۔ مجھے تو ڈر ہے کہ ماؤز بھی اسی رستے پر نہ جا پڑے۔ ہمارے والدین کے فرائض پورے ہو جائیں۔ وہ سکھ کی نیند سوئیں۔ اس سے بڑھ کر ہمارے نزدیک کیا ہو سکتا ہے۔ بیٹیاں بہت بڑی ذمہ داری ہوتی ہیں۔ باقی زندگی تو عبارت ہی کو شش اور جدوجہد سے ہے۔ نصیب میں ہوا تو مولوی صاحب کے ساتھ ہی اچھی زندگی گزر جائے گی۔“

وہ آخر میں سنجیدگی سے گویا ہوئی۔

مست ان کی باتیں سمجھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ ان کی باتوں کے ساتھ اماں کی باتیں بھی گڈنڈ ہونے لگیں۔

نجانے کیوں؟

”توبہ۔ توبہ۔ آگ لگی ہے۔“ بے جی دروازہ بند کر کے ہانپتی کاپتتی لوٹیں تو موٹر سائیکل دھو تا عمیر اچھل کر کھڑا ہو گیا۔

”کہاں۔۔۔ کہاں۔۔۔؟“ ہاتھ میں پانی والا پائپ بندوق کی طرح تان لیا۔

”سبزی میں۔۔۔ ٹنڈے اور بھنڈیاں۔“

”افو۔“ وہ بھنا کر دوبارہ موٹر سائیکل کی طرف متوجہ ہو گیا۔ مسرت نے مسکراہٹ چھپانے کو چہرہ جھکا لیا۔ بے جی نے سبزی تخت پر رکھی۔

”بیٹی! کچن سے ٹوکری اور چھری تولادو۔“

”بے جی! خدا کے لیے رحم کریں۔ ٹنڈوں کا شور بہ اور بھنڈی کی بھیجا کھا کھا کر بیٹ میں سبزی کا کھیت آگ آیا ہے۔“ عمیر نے دہائی دی۔

”تو روز روز گوشت کہاں سے منگو اؤں۔“

وہ چڑ کر بولیں۔ مسرت نے کچن سے ٹوکری اور چھری ملا کر دی۔

”میں نے جاب اشارت کی۔ تو پہلی تنخواہ میں بکرا کٹوا کر فریز کر دوں گا۔“ اس نے بڑھک ماری۔

”تب کھا لینا کباب، کوٹھے،“ بھی تو وال سبزی مل جائے تو شکر کرو۔ تمہارے باپ کون ساڑی سی لگے

ہیں۔ اے مسرت! ساجد علی نے اس بار سبزی نہیں اگائی۔ وہ تو کہتا تھا۔ سبزی میں بڑا فائدہ ہے۔“

”جی فائدہ تو ہے پر محنت بڑی کرتا رہتی ہے۔ انسان گوڑے گوڑے کھپ جاتا ہے۔“

وہ شاپر سے ٹماٹر اور ہری مرچیں الگ کر رہی تھی۔ چار ٹماٹر پاؤ بھر ہری مرچیں۔ اے اپنے صحن میں رکھے ٹوکری بھر ٹماٹر اور مرچیں یاد آ گئیں۔ جو اماں آرام سے آس پڑوس میں بانٹ دیتی تھیں۔ سبزی نہ بھی ہو تب بھی ٹماٹر، ہری مرچیں اور پیاز تو ضرورت کے مطابق کاشت ہوتے ہی تھے۔

”ہاں۔۔۔ بغیر محنت کہاں کسی کو کچھ ملا ہے۔ پچھلی گرمیوں میں ساجد علی کئی بار سبزی دے گیا تھا۔ کیسی سہولت ہو گئی تھی۔“

”آپنی ایسی مرغیاں بھی ہوں گی۔“ عمیر نے اشتیاق سے پوچھا۔

”ہاں۔۔۔ دس گولڈن اور تین مصری۔“

”واہ! تو درجن بھر انڈے ہی منگوالیں۔“

”تو نے کیا بچے نکلاوے ہیں۔“ بے جی نے گھورا۔

”میں نے تو احتیاطاً“ کہا ہے۔ شاید گوشت کی طرح انڈوں پر بھی بین لگ جائے گا۔“ اس نے بایک چکاتے ہوئے لا پرواہی سے کہا تو بے جی چپ ہو گئیں۔

”کیا کروں۔۔۔ لڑکیاں بھی بیاہنی ہیں۔ یہ جو ٹوڑنہ کروں تو تولہ بھر سونا بھی نہ پہنا سکوں۔ تمہاری ماؤں کو فکر نہیں۔ سارا کچھ میرے ہی سر ہے۔“

”تو نہ بنائیں سونا۔ پیتل کے دوپرات جو رکھے ہیں آپ کے جیز کے۔“

”ہاں۔ ہاں۔ ہنوں کو ہیتل پہنا کر خست کرنا۔ تم سے یہی امید ہے۔“ تب ہی کال بیل نے بے جی کی زبان کو بریک لگا دیا۔

”اس شزاوی کے خنرے اٹھالے ہوں تو باہر دیکھ لینا اور تم کہاں دو گڑ گڑ کرتی پھر رہی ہو۔“ انہوں نے قریب سے گزرتی مانو کو پکڑ لیا۔ ”ہزار بار کہا ہے کہ یوں اور اور مت پھرا کرو۔ کتاب لے کر اسرار کے پاس ہی بیٹھ جایا کرو۔ خیر سے اور تو کسی کے پاس فرصت نہیں۔ وہ بھلا مانس انگریزی تو پڑھا دیتا ہے۔“

”مجھے نہیں اس سے پڑھنا۔ آتا جاتا خاک نہیں ہے۔ خواجواہ کے رعبہ۔“ مانو بسوری۔

”ہاں تو بڑی افلاطون ہے۔ یاد رکھ بارہویں کلاس کی طرح اس بار بھی انگریزی میں فیل ہوئی تو گھر بٹھالوں گی۔“

مست کے سامنے اس انکشاف پر مانو جیز ہوتی وہاں سے غائب ہوئی۔

”بے جی کچھ خواتین آئی ہیں۔“ عمیر نے اعلان کیا۔

”اے۔۔۔ وہی قطرے پلانے والی ہوں گی۔ کہہ دو ہمارے گھر کوئی بچہ نہیں۔ اس دن بھی آئی تھیں جان کو آگئیں۔ اب نہیں ہے بچہ تو کیا میں قطرے پی لوں۔“ انہوں نے تپ کر کہا۔ عمیر آنکھوں ہی آنکھوں میں کچھ عجیب و غریب اشارے کر رہا تھا۔

”تو نے یہ کیا کیا آنکھیں مٹکانا شروع کر دی ہیں۔ کیا آنکھ میں کچھ۔“ تب ہی زبان کو بریک لگ گئی۔ وہ کچھ حیران سی اندر آتی فروا اور اس کی ساس کو دیکھنے لگیں۔ جن مہمانوں کو بلانے میں صدف نے تھر تھلی مچا رکھی تھی۔ آج وہ چپ چاپ ہی چلے آئے اور صدف نے کوئی ذکر ہی نہیں کیا۔ بلکہ وہ معمول کے مطابق کھانا دانا کھا کر اپنے کمرے میں سونے جا چکی تھی۔

”اے سلام علیکم! معذرت چاہتے ہیں بتاتا ہے ہی چلے آئے۔“ فروا کی ساس نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ جہاں بے جی ان کی پذیرائی کو انھیں۔ وہیں مست نے جلدی سے نمائز تخت پر رکھے اور کھڑی ہو گئی۔

”حد کرتی ہیں بھین جی۔ آپ کا اپنا گھر ہے۔ جم جم آئے۔ مست بیٹی مہمانوں کو مہمان خانے میں لے جائے۔“ بے جی ان سے گلے ملیں۔ فروا کو پیار دیا۔ خود اپنی چپل تلاشنے لگیں۔ مست نے جلدی سے جھک کر تخت کے نیچے سے ان کے چپل نکالے۔ سیدھی ہوئی پھر ہکا بکا رہ گئی۔ مہمان خاتون تخت پر بیٹھ چکی تھیں۔ تخت پر نہیں نمائزوں پر۔

”میں تو بیس آپ کے پاس ہی بیٹھوں گی۔“

”ہاں۔ ہاں کیوں نہیں۔ یہ سبزی اٹھاؤ۔ مست۔ یہاں نمائز تھے۔“

”اب۔ نہیں ہیں۔“

”کیا بنانا۔؟“

”کیچھ۔“

فروا کی ساس کو ناگمانی کا احساس ہو گیا تھا۔ وہ اٹھنے کی کوشش میں بے حال ہو رہی تھیں۔ فروا نے سہارا دے کر کھڑا کیا۔ نیا آگنی تھی۔ آنکھیں پھاڑے تخت پر بنے نمائروں کے کچھ مرکھ دیکھ رہی تھی۔
 ”آنکھیں نہ پھاٹو۔ جا کر خالہ کی قمیص دھلاؤ۔“ بے جی نے جھنجلا کر ڈانٹا۔ فروا مسکراہٹ دیا تو ساس کو نیا کی معیت میں واش روم لے گئی۔ مسرت نے جلدی جلدی تخت پوش سمیٹا۔
 ”جاؤ صدف کو بتاؤ۔ اس کی سکھی آئی ہیں۔“ بے جی خود ڈرائنگ روم میں چلی گئیں۔ جسے وہ کبھی بیٹھک کہتی تھیں۔ تو کبھی مہمان خانہ۔

مسرت جلدی سے صدف کے کمرے کی طرف بھاگی۔ بند دروازے پر ہلکی سی دستک دی۔
 ”ہیں۔“ کچھ توقف کے بعد صدف کی آواز آئی۔ گویا وہ سوئی نہیں تھی۔ کمرے کی نیم تاریک فضا میں ٹھنڈک سی گھلی ملی تھی۔ فل اسپڈ سے چلتے پٹکے کی وجہ سے ریٹھی پردے سرسرا رہے تھے۔ اسٹیرپو پر ہلکی آواز میں کوئی انگریزی گانا بج رہا تھا۔ خود وہ بیڈ پر کسی مغرور شنراوی کی طرح نیم دراز تھی۔ ایسے خوابیدہ ماحول میں مسرت کی آنکھیں کھڑے کھڑے بند ہونے لگیں۔

”خیریت۔“ صدف کی آواز ابھری۔

”جی۔ آپ کی سہیلی آئی ہیں۔“

”کون۔؟“ صدف نے ریموٹ سے اسٹیرپو بند کیا۔

”وہی جن کی دعوت کی تھی۔“

”فروا۔؟“ صدف نے حیرت سے پوچھا۔ مسرت نے اثبات میں سر ہلادیا۔

”ساتھ کون ہے۔؟“

”ان کی ساس۔“

سلوٹیں کچھ اور گہری ہوئیں۔

”آتی ہوں۔“ دونوں آگے پیچھے ہی نیچے آئیں۔ نیا پر جوش سی بیٹھک سے نکلی تھی مسرت اسے دیکھ کر رک گئی۔ جبکہ صدف اندھ چلی گئی تھی۔

”کیا ہوا۔؟“ مسرت نے اس کا جوش دیکھ کر پوچھا۔ نیا نے زور سے اس کا ہاتھ دبایا۔

”رشتہ آیا ہے رشتہ۔“

اور اسے وہیں چھوڑ کر پچھلے صحن میں بھاگ گئی۔ جہاں ناصہ اور عالیہ بیٹھی تھیں۔

”امی جی۔ ارشتہ آیا ہے۔“

”شکر ہے۔ گھنٹے بھر سے انتظار کر رہی ہوں۔ عدیل بھی جا کر بیٹھ ہی جاتا ہے۔“

عالیہ نے جلدی جلدی چپل پہنی۔ سپاس پڑی نئی چادر اٹھا کر اوڑھنے لگیں۔

”آپ کہاں جا رہی ہیں۔؟“ نیا نے حیرت سے پوچھا۔

”رکشہ نہیں آیا۔ ذرا بازار تک جاری ہوں۔“
 ”بی جی! رکشہ نہیں۔ رشتہ آیا ہے۔ صدف کا۔“

”اس۔“ وہ ہکا بکا کھڑی رہ گئیں۔ مڑ کر ناصرو کو دیکھا، پھر بیٹی کو گھورا۔
 ”اب کیا خوابوں میں بھی رشتہ دیکھنے لگی ہو؟“

”وہ! آپ نے تو مجھے بالکل ہی پاگل سمجھ لیا ہے۔ فروا آئی ہے۔ اپنے جیٹھ کا رشتہ لے کر۔“
 دیورانی، جھٹانی نے ایک دوسرے کو دیکھا۔ پھر شتم پشتم ڈرائنگ روم کی طرف لپکیں۔ جہاں فروا کی
 ساس دو رنگ کے کپڑے پہنے اپنے سب سے بڑے بیٹے کا رشتہ پیش کر رہی تھیں۔ قیص غالباً ”بے جی کی
 تھی۔ انہیں جلدی اور جوش اتنا تھا کہ زیادہ تمہید بھی نہ باندھی تھی۔“

”مجھے تو یوں لگتا تھا کہ میں یہ حسرت دل میں لے کر قبر میں جاؤں گی۔ کسی طرح جانتا بھی نہ تھا۔ آج ذکر
 کیا تو میں فروا کو لے کر بھاگی چلی آئی۔ آپ کے گھر آنے سے مل کر ویسے بھی دل خوش ہو گیا تھا۔ ایک منٹ
 بھی سوچنے میں نہ لگا۔ بس آپ مایوس مت کیجئے گا۔ میرے بیٹے میں کوئی اخلاقی برائی نہیں۔ بہت
 فرما تیرا اور از مہ دار ہے۔ نہ سگریٹ پان نہ زیادہ دوست احباب، باقی جو معلومات آپ کو مانا چاہیں۔“ وہ
 ساری بات کر کے فٹھرنگا ہوں سے بے جی کو دیکھنے لگیں۔ فروا وہاں نہیں تھی۔ یقیناً صدف سے اپنے
 کمرے میں لے گئی تھی۔ بے جی کا بس نہ چلتا تھا کہ فوراً ”ہاں کہہ دیں۔ مگر ہائے بے بسی۔ انہوں نے
 عالیہ کی طرف دیکھا۔ وہ چپ تھیں۔ ظاہر ہے صدف سے مشورے کے بغیر وہ کہہ بھی کیا سکتی تھیں۔
 ”بھین جی! ہم سوچ کر باہمی مشورے سے ہی کچھ کہہ سکیں گے۔ یوں بھی بیٹیوں کے معاملے میں اتنی
 جلدی ٹھیک نہیں ہوتی۔“ بے جی نے برہماری سے کہا۔

”آپ اچھی طرح تسلی کر لیں۔“ انہوں نے جلدی سے کہا۔ ”۲۱ شاء اللہ آپ کی بیٹی کو وہاں کوئی
 تکلیف نہ ہوگی۔ بے شک فروا سے پوچھ لیجئے گا۔ اسی گھر میں رہتی ہے ماشاء اللہ خود مختار اور خوش باش
 ہے۔ میں تو یوں بھی بہوؤں کے معاملے میں زیادہ دخل اندازی نہیں کرتی۔“

پر کلف چائے کے بعد انہوں نے رخصت چاہی۔ تو صدف کمرے سے باہر نہیں آئی اور فروا سنجیدہ
 سی تھی۔

”لگتا ہے اللہ نے ہماری سہلی۔ بظاہر تو اس رشتے میں کوئی برائی نظر نہیں آتی۔ گھرانا بھی اچھا لگتا
 ہے۔ کھاتے پیتے لوگ ہیں۔ لڑکا بھی انجینئر ہے۔ اب اور تمہاری بیٹی کو کیا چاہیے ہو گا۔“ بے جی بے حد
 خوش تھیں۔ خوش تو عالیہ بھی تھیں مگر صدف کی وجہ سے معترض تھیں۔
 ”پوچھنا تو پڑے گا۔“ عالیہ نے چپکے سے کہا۔

”ہاں نا۔ پوچھیں گے۔ اب کے انکار نہیں کرے گی۔ آخر سہیلی رشتہ لائی ہے۔ کالج میں کوئی صلاح
 مشورہ کیا ہی ہو گا۔ بس رب یہ تینوں رشتے یکے کر دے تو میں تو سرخرو ہو جاؤں۔“ وہ ان کے جانے کے بعد
 ہلکی پھلکی سی ہونگئی تھیں۔

تب ہی مسرت بھاگی چلی آئی۔ اس کے ہاتھ میں کچھ تھا۔

”بے جی۔۔۔ مہمان چلے گئے؟“

”ہاں۔۔۔ ہاں۔۔۔ چلے گئے۔ میرا تو بس نہ چلتا تھا۔ ہاں کہہ کر مٹھائی کی ٹوکری ساتھ ہی بھیج دوں۔“

”توبہ ہے بے جی! اب میری بچیاں اتنی بھی بھاری نہیں کہ یوں جھٹ پٹ بغیر سوچے سمجھے ہاں کہہ دیں۔“ عالیہ کو برا لگا۔

”بس کرو، کون بغیر سوچے سمجھے ہاں کہہ رہا ہے۔ پوتی ہے میری، کسی جہنم میں تو دھکا نہیں دوں گی۔“ انہوں نے ناگوار سے کہا۔

”بے جی! مہمان۔۔۔“ اس سے قبل کہ دونوں کی بحث شروع ہو جاتی۔ مسرت بول اٹھی۔

”تو نے کیا مہمانوں کا اچار ڈالنا ہے۔“ وہ جھنجھلائیں۔

”وہ یہ چھوڑ گئی ہیں۔“ مسرت نے ہاتھ میں پکڑی چیز لہرائی۔

”ہائے میری نوی کور قیص۔“ بے جی نے دہائی دی۔

”مسرت کے ہاتھ میں فروا کی ساس کی قیص لہرا رہی تھی۔ وہ اسی دورنگ کے لباس میں چلی گئی تھیں۔“



”یہ نہیں ہو سکتا۔“ صدف نے بغیر لگی لپٹی رکھے صاف انکار کیا۔۔۔ تو ایک بار سب اہل خانہ چپ کے چپ رہ گئے۔ بے جی نے پہلی بار ریشمان ہو کر پوتی کی شکل دیکھی۔ گویا اس کا مسئلہ سمجھنے کی کوشش کر رہی ہوں۔ آج تک وہ رشتے اس لیے ٹھکراتی رہی کہ کم تعلیم یافتہ شخص سے شادی نہیں کروں گی۔ اب فروا کے جیٹھ کا رشتہ تو کوئی غیبی مدد ہی لگا تھا۔ انہیں یقین تھا کہ اب کے صدف انکار نہیں کر سکتے گی کہ رشتہ اس کے ”معیار“ کا تھا۔ تھوڑا سا شک یہ بھی تھا کہ اس میں صدف کی مرضی بھی شامل ہوگی کہ سہیلی اس سے مشورہ کیے بغیر تو اپنے سسرال والوں کو بھیجنے سے رہی جبکہ حقیقت یہی تھی کہ فروا نے اس کے ہزار ہا اعتراض کے باوجود اگر یہ کام کیا تو صرف اپنے جیٹھ کی حالت زار دیکھ کر۔ کہ انہیں اپنی عمر کے سنہری خوبصورت سال ضائع کرنے کے بعد اپنا آئیڈیل صدف کی صورت ملا تھا۔

”کیوں۔۔۔“ خود عالیہ کو اس رشتے میں کوئی خاص برائی نظر نہ آئی تھی۔

”مجھے نہیں پسند۔“ اس نے گہری سنجیدگی سے جواب دیا۔

”وجہ؟“ بے جی نے کمال ضبط سے کام لے کر وجہ پوچھی۔

”بس، نہیں پسند۔ ال منرو لوگ ہیں۔“

”کیا ہیں؟“ بے جی کے لیے کچھ نہ پڑا۔

”نیل مینوز تک نہیں آتے۔“ صدف نے مزید ناک چڑھائی۔

بے جی نے وضاحت طلب نگاہوں سے مریم کو دیکھا۔

”کھانے پینے کے آداب۔“ اس نے تشریح کی۔
 ”وہ کیا ناک سے کھا رہے تھے؟“

”موصوف سالن کی پلیٹ میں فرنی ڈالے بیٹھے تھے اور ساس صاحبہ ہاتھوں سے کھا رہی تھیں۔“
 ”کس کی ساس؟“ مانو نے چونک کر پوچھا۔

”فروا کی اور کس کی۔“ اس کی پیشانی پر سلوٹیں ابھریں۔

”میں سمجھی آپ کی ہونے والی ساس۔“ دلی دلی ہنسی ابھری۔

”جسٹ شٹ اپ۔ خبردار جو کسی نے مجھ سے اس رشتے کے بارے میں بات بھی کی ہو۔“ وہ جھٹکے سے انھی اور کھٹ کھٹ کرتی واک آؤٹ کر گئی۔
 ”تمہیں کس نے کہا تھا دخل دینے کو۔“

”میں تو۔۔۔“

”جاؤ دیکھو اسرار آگیا ہو گا اس کے لیے کھانا نکال دو۔“

”ہو نہ۔۔۔ میں کیوں نکالوں اس کھڑوس کے لیے کھانا۔“ اسرار کے لیے اس کا غصہ ابھی تک مدہم نہیں ہوا تھا۔ سوچیکے اوپر کھسک گئی۔

”تمہاری لڑکی کا دل غلٹ گیا ہے۔“ بے جی کو صدف کے انکار سے ٹھیک ٹھاک شاک لگا تھا۔

”جب اس کا دل نہیں تو کیوں مجبور کرتی ہیں۔“ عالیہ نے بچھے بچھے لہجے میں کہا۔

”کچھ عقل سے کام لو عالیہ! ہم کہاں کے رئیس ہیں۔ آج کل تو یوں ہی اچھے رشتوں کا کال پڑ گیا ہے۔ ایک بیٹا جو گھر سے دور اپنی جان کھپا رہا ہے۔ کھانے دانے کی کیسی تنگی دیکھ رہا ہے اس انتظار میں کہ بہنوں کا بوجھ کم ہو تو اپنا گھر سامنے کے بارے میں سوچے۔ گھر سے باہر سو مشکلیں، سو مصیبتیں ایسی جان کو چٹی رہتی ہیں۔ اس کا صبر مت آناؤ۔ کل کو اپنے بارے میں خود ہی سوچ لے گا کہ ماں کو تو پروا ہی نہیں۔ نواز جبار کی تنخواہوں میں تو گھر کی وال روٹی ہی بمشکل چلتی ہے۔ زندگی موت خدا کے ہاتھ جیسے جی اپنی ذمہ داریوں سے سبک دوش ہو جائیں۔ یہی سمجھ دار والدین کاوتیرہ ہے۔“

بے جی نے مکمل سنجیدگی سے عالیہ اور خاموش بیٹھے جبار کو سمجھایا۔

”اب کیا زبردستی کریں، جب نہیں مانتی۔“ عالیہ ان ماؤں میں سے تھیں جو اولاد کو کبھی غلط نہیں کہتیں۔

”برائی کیا ہے۔ پڑھا لکھا، سمجھ دار، برسر روزگار لڑکا، ایسی اچھی فیملی۔۔۔ اب چھری کانٹے سے کھانا نہیں کھایا تو انکار کر دے کوئی تک؟ ساری عمر اس جبار کو تو کانٹا پکڑنا نہیں آیا۔ کسی ہوٹل کا بیروں والو۔ کم از کم چھری کانٹا پکڑنا تو آتا ہو گا۔“

بے جی چڑ گئیں۔ انہیں جمل کا پرنزل سو جان سے پسند تھا۔ اس کی ماں پر پہلے ہی فریفتہ تھیں۔ ان سے ملنے کے بعد بار بار کہتی تھیں۔

”کیسی مسادہ مزاج اور نیک اطوار کی عورت ہے۔“
 ”جبار احمد! تمہاری بیٹیوں کے دماغ سا تو اس آسمان پر ہیں، انہیں زمین پر اتار دینا چھتاؤ گے۔“
 ”تم صدف سے بات تو کرو۔“ انکار کی کوئی معقول وجہ بھی تو ہو۔“ جبار نے بیوی سے کہا۔ رشتہ انہیں
 بھی پسند تھا!

”سے پسند نہیں۔“ عالیہ نے جزم ہو کر کہا۔
 ”لولہ لنگڑا ہے یا اندھا کانا۔“ بے جی نے چمک کر پوچھا۔
 ”جیتا نہیں۔ آپ کے سامنے ہی انکار کر کے گئی ہے۔“ عالیہ نے دامن چھڑایا۔
 ”دیکھو جبار احمد!“ بے جی نے سنجیدگی سے بیٹے کو دیکھا۔ ”یہ آخری بار ہے اس کے بعد تم دونوں جانو
 اور تمہاری اولاد میں نے ہاتھ اٹھالیا اور تا صرہ۔“ انہوں نے خاموش تماشائی بنی بڑی ہمو کو مخاطب کیا۔
 ”تم اور نواز تیار رہنا، اتوار کو ہم دونوں رشتے دیکھنے جا رہے ہیں، کرن اور سارا کے لیے تمہیں کوئی
 اعتراض تو نہیں؟“

”نہیں اماں!“ تا صرہ بول کھلائیں۔
 ”لڑکیوں کی تصویریں میں نے بھجوائی تھیں۔ دونوں گھروں سے مثبت جواب ملا ہے۔ لڑکوں کی
 تصویریں رکھی ہیں۔ تم نے دیکھ لیں، نواز کو بھی دکھالینا۔ باقی بات چیت اور رہن سہن کا اندازہ ملنے جلنے
 سے ہو جائے گا۔ اگلی اتوار کو انہیں بلا لیں گے لڑکیوں سے بھی پوچھ لینا بعد میں نہ اعتراض کریں۔“
 ”نہیں بے جی! وہ بھلا کیوں اعتراض کریں گی۔“
 ”خربوزے کو دیکھ کر خربوزہ رنگ پکڑتا ہے۔“ انہوں نے عالیہ پر ایک تیز نظر ڈالی۔ وہ کلس کو ہاں سے
 اٹھ گئیں۔

”تم بھی تیار رہنا، ساتھ جانا ہے۔“ انہوں نے خاموش بیٹھے سے کہا تو وہ ”جی“ کہہ کر کھڑے
 ہو گئے۔

”کاشٹھ کا الو، بیوی کا غلام۔“ وہ پیچھے بڑبڑاتی رہ گئیں۔ تب ہی اسرار چلا آیا۔
 ”بے جی! آج کیا سب کا روزہ ہے؟“
 ”کیوں؟“ انہوں نے حیرت سے پوچھا پھر چونکیں۔ ”تم نے ابھی تک کھانا نہیں کھایا۔“ اسرار نے بے
 چارگی سے نفی میں گردن ہلائی۔
 ”لو سنو، دن کدھر کو گیا اور بچہ بچارہ ابھی تک بھوکا پیاسا بیٹھا ہے۔ ایک سے بڑھ کر ایک شکمی لڑکیاں
 ہیں عالیہ کی۔ مانو۔ اری او مانو۔“
 ”بے جی! میں نکال دیتی ہوں۔“ مریم جلدی سے کھڑی ہو گئی۔

”مجھے یقین نہیں آتا کہ تم نے جمل بھائی کو انکار کیوں کر دیا۔“

بیپسی کا گھونٹ بھر کر فروا نے کچھ تاسف سے کہا تو صدف کی صبح پیشانی پر شکنیں ابھر آئیں۔ وہ صبح سے فروا کے ساتھ ڈھنگ سے بات ہی نہیں کر رہی تھی۔ اب بھی فروا اور فروزاں اسے فری پریڈ کی وجہ سے زبردستی کھینچ کر کینٹین لے آئیں۔ کالج کی کینٹین کے عقب میں یہ چھوٹا سا باغیچہ لیکچرارز کے لیے مخصوص تھا۔ وہ سایہ دار درختوں کی چھایا میں کرسیوں پر بیٹھی تھیں۔ کینٹین کا چھوٹا کچھ لمحے قبل ہی ان کے سامنے گرما گرم سموے، رائیے کے ساتھ رکھ گیا تھا جبکہ شاہی کباب انجم گھر سے بنا کر لائی تھی۔

”انکار کر دیا۔“ انجم کی چیخ نما آواز نکلی۔ ”ہائے ظالم۔ یہ تم نے کیا کیا۔ کچھ ہم سے کہا ہوتا، کچھ ہم سے سنا ہوتا اور کچھ نہیں تو مشورہ ہی طلب کیا ہوتا۔“

”انجم! ایک مشورہ مانو گی۔“ صدف نے سنجیدگی سے اسے دیکھا۔

”کو۔“ وہ ہمہ تن گوش ہوئی۔

”کم بولا کرو۔“

”نیکلی کا تو زمانہ ہی نہیں۔“ انجم ہر امان گئی۔

”صدف! جمل بھائی بے حد نفیس انسان ہیں۔“ فروا اپنے جھٹھ کا مقدمہ لڑنے کے لیے بالکل تیار تھی۔ ”مجھے اس گھر میں گئے ابھی زیادہ دن نہیں ہوئے لیکن میں تمہیں ان کے بارے میں۔“

”فروا! پہلی بات، تمہیں اپنے سسرال والوں کو مجھ سے مشورہ کیے بغیر اس مقصد کے ساتھ میرے گھر نہیں بھیجنا چاہیے تھا۔ دوسری بات کہ وہ مجھے بالکل پسند نہیں۔“

صدف نے صاف گوئی سے کہا۔ ”وہ یقیناً اچھے انسان ہوں گے مگر میرے مطلب کے نہیں ہیں۔“

”صدف! وہ کہتے ہیں کہ انہیں اک طویل انتظار کے بعد اپنی آئیڈیل لڑکی نظر آئی ہے۔“

”لیکن وہ میرے آئیڈیل کے پاسنگ بھی نہیں۔“ صدف نے برحسہ کہا۔

”ان کی پر سنالٹی کی وجہ سے انکار کر رہی ہو۔“ فروزاں نے اندازہ لگایا۔

”ہاں۔۔۔ لائف پارٹنر ایسا تو ہو کہ کسی سے متعارف کرواتے ہوئے فخر کا احساس ہونے کا احساس کمتری کا۔“

”ظاہر پر مت جاؤ۔“ ناجیہ نے ان کی گفتگو میں شامل ہوتے ہوئے کہا۔ وہ ابھی ابھی پریڈ لے کر آرہی تھی۔ اس کی شادی کو کچھ ہی ماہ گزرے تھے۔

”یہ تم کہہ رہی ہو، تم نے دانیال کا انتخاب اس کی پرکشش شخصیت کی بنا پر ہی کیا تھا۔ باوجود اس کی معمولی جاب کے۔“ صدف نے طنزاً کہا۔

”میں نے کسی ایک مقام پر تو سمجھو تا کیا، تم تو آئیڈیل ازم کا شکار ہو۔ جاب اعلیٰ پر سنالٹی زبردست گھر شاندار۔ اپنی شرائط میں تھوڑی کمی کو صدف لی لی۔“

”آخر مجھ میں کس چیز کی کمی ہے جو میں سمجھو تا کروں۔“ صدف نے تنک کر کہا۔ ناجیہ نے اسے بغور

دیکھا اور مسکرا دی۔

”کسی چیز کی نہیں، لیکن لوگ جب ”کیاں“ گنوا نا شروع کرتے ہیں تو دو کوڑی کا کر کے رکھ دیتے ہیں۔“
”بہر حال میں کسی ایسے شخص کے ساتھ شادی نہیں کر سکتی جس کا مذاق میری فریڈ زبھری محفل میں اڑا چکی ہوں۔“ صدف کے دو ٹوک لہجے پر سب ایک دوسرے کو دیکھ کر رہ گئیں۔ پھر انجم نے کھنکار کر گلا صاف کیا۔

”فرو! تم اپنے جیٹھ کی توجہ کا رخ میری طرف کیوں نہیں موڑ دیتیں۔“
”ضروبے۔ مگر وہ کہتے ہیں، میری زندگی میں اگر کوئی لڑکی آئی تو وہ صدف کے سوا کوئی اور نہ ہوگی۔“ فرو نے پھینکی سی مسکراہٹ کے ساتھ بتایا۔
”وہ پہلی نظر کی محبت۔“ انجم نے ہونٹ سکڑے جبکہ صدف نے ایک ناگوار سی نگاہ اس پر ڈالی اور اٹھ کر چلی گئی۔



دونوں گھروں میں رشتوں کی بات چیت خوش اسلوبی سے پروان چڑھی۔ بے جی بہت خوش تھیں۔
”ارے بھی فون دو، میں زارا اور سدرہ کو بتاؤں۔“ جیسے ہی مگنی بلکہ مگنیوں کے دن و تاریخ طے ہوئے، ویسے ہی گھر میں تیاریاں شروع ہو گئی تھیں۔
مرت نے فون لا کر ان کے قریب رکھا۔

”یہ باقی لڑکیاں کہاں غائب ہیں۔ یہ پاس ہی ڈائری پڑی ہوگی ان میں سے نمبر ڈھونڈو۔“
وہ سعادت مندی سے نمبر ڈھونڈ کر ملاتی رہی۔ بے جی نے دونوں کو اس کے سسرال والوں سمیت بلوایا تھا۔

”لیکن کون شش کرنا، اکیلی ہی چلی آؤ۔ ہم نے کوئی دھوم دھڑکانیں کرنا۔ بس ہلکی پھلکی سی رسم ہونا ہے۔“ آخر میں دبی زبان میں تاکید کی۔ مرت نے بمشکل ہنسی روکی۔
”ہاں خواجواہ کے خرچے میں تو ویسے ہی اس مگنی کے خلاف ہوں۔ خاندانی لوگوں میں تو زبان ہی سب کچھ ہوتی ہے۔“

دونوں گھروں میں فون کر کے ریسپور مرت کو تھما دیا۔ اس نے ابھی کریڈل پر ڈالا ہی تھا کہ وہ دوبارہ بج اٹھا۔ بے جی ایک دم اچھل پڑیں۔

”ہنٹے۔ کیا ہی صور اسرافیل ہو گا۔“

مرت نے ریسپور اٹھا کر ان کی طرف بڑھایا۔

”ہاں۔ ہاں ساجد علی کیسے ہو؟“

”شکر ہے اللہ کا۔“

”ہاں، یہاں پاس ہی بیٹھی ہے۔“ تھوڑی دیر بات کرنے کے بعد انہوں نے ریسیور مسرت کی طرف بڑھا دیا۔ ”تمہارا باپ ہے۔“

”جی ابو جی! السلام علیکم۔“

”تو آتو سہی، تیرے گوڈے گئے توڑ کر گھر میں بٹھاؤں گی۔“ وہ اچھل ہی پڑی۔ ریسیور اماں کی طرف منتقل ہو گیا تھا۔ مسرت نے بوکھلا کر بے جی کو دیکھا، وہ اسی کی طرف متوجہ تھیں۔ اس کی بوکھلاہٹ میں مزید اضافہ ہو گیا۔

”جی اماں۔۔۔ جی۔۔۔ میں خیریت سے ہوں۔“

”تیری خیریت اسی میں ہے کہ تو دو دن کے اندر راندر گھر آجا۔“

”سب ٹھیک ٹھاک ہیں، سہاں جی، میرا بھی دل لگ گیا ہے۔“

”تیرے دل کو حلال کر کے رکھ دوں گی۔ ایسی بے شرم لڑکی ہے، ہفتے کا کہہ کر گئی تھی اب مہینہ ہونے کو آیا، واپسی کا نام ہی نہیں۔ یہ بھی خیال نہیں کہ بوڑھی ماں اکیلی ہڈیاں گھسار رہی ہوگی، وہیں مری ہوئی ہے۔ نہ باپ کو پروا ہے نہ بیٹی کو۔ زمانہ منہ بھر بھریا تیں کرنے والا اور ان کے سیرپائے ختم نہیں ہوتے۔ شفیق کو بھیج رہی ہوں، اس کے ساتھ فوراً واپس آؤ۔“ اماں نے اس کے اچھی طرح لتے لیے۔ مسرت گھبرا گئی۔

”نہیں، نہیں، اماں! اس کو مت بھیجیں، ابھی تو۔۔۔“

وہ سارا اور کرن کی گفتگو تک یہاں رکنا چاہتی تھی۔ یہ بھی سچ تھا کہ اتنی ساری لڑکیوں میں اس کا دل آرام سے لگ گیا تھا۔ ابا کا فون اکثر آجاتا تھا مگر انہوں نے کبھی اس سے واپسی کا نہ کہا تھا۔ شاید وہ چاہتے تھے کہ مسرت اچھی طرح حسرت نکال لے اب اماں نے ایک دم ہی توپ داغ دی۔

”ادھر، مجھے دو۔“ بے جی نے اشارہ کیا۔ پھر ادھر ادھر کی باتوں کے بعد انہوں نے خود ہی روک دیا۔

”ہفتے بھر میں دونوں لڑکیوں کو انگوٹھی پہنانے آرہے ہیں۔ بس تب تک رکنے دو پھر بے شک لے جانا۔“

کماں روز روز نکلتا ہوتا ہے۔

اماں دوسری طرف سے مبارکباد دے رہی تھیں۔

”ہاں بیٹیاں، جتنی جلدی اپنے گھروں کی ہو جائیں اتنا ہی اچھا ہے۔ مسرت کی کہیں بات چلی؟“

اس سے قبل کہ اماں رشتہ کی تفصیل سنائے بیٹھ جاتیں۔ مسرت نے کریڈل دبا کر ہاتھ اٹھالیا۔

”لو۔۔۔ کٹ گیا۔“ بے جی چومکیں۔

”اماں کیا کہہ رہی تھیں؟“ مسرت نے ڈرتے ڈرتے پوچھا۔

”کچھ نہیں، روک دیا ہے۔ بھلا میرا کما ٹال سکتی تھی۔“ انہوں نے فخر سے کہا پھر مسکراتے ہوئے پوچھا۔ ”تمہارا بھی یہی دل تھا؟“

”جی۔۔۔“ وہ سر جھکا کر مسکرا دی۔

”ماں کا خیال رکھا کر، مائیں بڑی نعمت ہیں۔“

”رکھتی تو ہوں، پر ماں پھر بھی مجھ سے غفارتی ہیں۔ ہر وقت روک ٹوک۔“

”ہئے پاگل۔۔۔ مائیں نہ ٹوئیں تو تم جیسی بے عقلوں کو عقل کیسے آئے اب میں ناصرو کو لاکھ بے وقوف کہوں، پر اس نے بیٹیوں کی تربیت کیسی اچھی کی ہے۔ سب کی سب فرماں بردار، خدمت گزار اور عالیہ کی لڑکیاں، اسی کی طرح کام چور اور خود پسند۔“

اسے تو صدف، نایاب اور مارہ میں بھی کوئی کمی نہ لگتی تھی، اس لیے چپ چاپ سنتی رہی پھر چپکے سے اٹھی۔

”ارے۔۔۔ ہاں حارث کو تو بتایا ہی نہیں۔ ذرا نمبر تو ڈھونڈ کر ملاؤ۔“

”یہ حارث بھائی بالکل ہی گھر نہیں آتے؟“ مسرت نے ڈائری کھولتے ہوئے پوچھا۔

”میں نے دو مہینے میں چکر لگا لیتا ہے۔“ پچھرویس کاٹ رہا ہے اور ماں کو فکر ہی نہیں۔“

دوسری طرف بیل جا رہی تھی وہ بے جی کو پکڑا کر خود پچھلے صحن میں نکل آئی۔ اس کا ذہن اماں میں اٹکا تھا، وہ یقیناً اس سے غماہوں کی۔

مسرت کا جی چاہا، وہ منگنی چھوڑ چھاڑ چلی جائے مگر اب اماں منع کر چکی تھیں۔ وہ کچھ اداس اداس د جا رہا پائی پر بیٹھ گئی۔



”گول گپے کرارے۔“

وہ اپنی جگہ سے اچھل پڑی پھر ایک دم سنبھل کر نوٹ بک پر جھک گئی۔ چور نظروں سے اسرار کو دیکھا، وہ کسی کتاب میں گم تھا۔ وہ جلدی جلدی اٹے سیدھے جملے لکھنے لگی۔ اسے فوراً ”سری لکھ کر چیک کروانا“ تھی۔ گول گپے والے کے جانے سے پہلے پہلے۔

لیکن اسرار اس کا چوکنا بھانپ گیا تھا۔ اسے خبر تھی کہ مانو کو اب کس بات کی جلدی ہے۔

”چیک کر لو۔“

”رکھو۔“ اسرار نے کتاب سے نظریں ہٹائے بغیر کہا۔ مانو نے توری چڑھا کر کاپی میز پر پٹی۔ وہ کتاب

میں مگن رہا۔

”اب دیکھ بھی لو۔“ مانو نے چڑ کر اونچی آواز میں کہا۔

اس نے انگلی سے ایک منٹ کا اشارہ کیا اور صفحہ پلٹ کر پھر سے پڑھنے لگا۔ مانو نے دانت کچکا پچکائے۔

اگر بے جی کا ڈرنہ ہو تا تو اب تک جا چکی ہوتی۔ ایک تو وہ تھا بھی ان کا لاڈلا۔

”گول گپے۔“

”میں پانی پی کر آتی ہوں۔“
 ”رکھو۔“ اس نے انگلی سے گویا ”ہینڈ زاپ“ کیا۔ ساتھ ہی انگلی کا رخ پانی کی بھری ہوئی بوتل کی طرف کر لیا۔ جو وہ ایک منٹ قبل فریج سے نکال کر لایا تھا۔
 ”یہ زیادہ ٹھنڈا ہے اور میرا گلا خراب ہے۔“
 ”ابھی دو منٹ میں کم ٹھنڈا ہوا جائے گا تب پی لیتا۔“ اس نے کتاب ایک طرف رکھ کر کاپی اٹھائی۔
 ”تب تک پیاسی مری جاؤں۔“
 ”دو منٹ میں نہیں مری گی۔“ وہ انتہاک سے اس کی لکھی سمی پڑھ رہا تھا جو اس نے دوسری بار لکھی تھی۔
 ”بد تمیز۔ کتنا آہستہ آہستہ پڑھ رہا ہے۔ وہ چلا جائے گا۔“

”تمہارا دھیان کدھر ہوتا ہے۔“ اسرار نے کاپی اس کے سامنے رکھی۔ جگہ جگہ لال پین سے لکیریں کھینچی تھیں۔ ”دوسری بار بھی وہی غلطیاں۔“
 ”تم دیکھتے ہی غلط ہو۔“
 ”بے جی۔“ اسرار نے صدا لگائی۔
 ”اب کیا مصیبت ہے؟“
 ”دوبارہ یاد کرو اور لکھو۔“
 مانو کی آنکھوں میں پانی سا بھر آیا۔
 ”ارے۔“ اسرار نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیسی عجیب لڑکی ہو۔ گول گپوں کے لیے روری ہو؟“
 ”میں گول گپوں کے لیے نہیں روری۔“ وہ جج اٹھی۔
 ”تب ٹھیک ہے یاد کرو۔“ اسرار آرام سے کہہ کر باہر نکل گیا۔ مانو نے جلتے کلسے کتاب اٹھائی۔
 تھوڑی دیر کے بعد اسرار واپس آیا تو ہاتھ میں گول گپوں کی بھری ہوئی پلیٹ تھی جو اس نے عین نیبل کے درمیان رکھ دی۔ مانو نے خوشگوار حیرت سے اسرار کو دیکھا۔
 ”نہیں اس کی ضرورت نہیں تھی۔“

”میں واقعی۔ غالباً تمہارا گلا خراب ہے اس لیے میں اپنے لیے لایا ہوں۔“
 اسرار نے اطمینان سے پلیٹ اپنی طرف کھسکائی اور کھینچائی میں ڈبو ڈبو کر کھانے لگا۔
 ”تم انتہائی کینے انسان ہو۔“ وہ سر تپا سلگ اٹھی۔
 ”تعریف کا شکریہ۔“

”مجھے تم سے نہیں پڑھنا۔“ وہ جھٹکے سے کھڑی ہوئی۔
 ”بے جی کو بتاؤ۔“ اسرار نے اپنا شغل جاری رکھا۔

”بتا دوں گی۔“ وہ تن فن کرتی باہر نکلی۔ اونگھتی ہوئی بے جی فوراً ”ہو شیار ہوئیں۔“
 ”پڑھ آئیں۔“

”جی۔“
 ”کیسا نیک بچہ ہے، کہنے لگا، بے جی! آج مانو نے بہت دل لگا کر پڑھا ہے۔ اسے انعام میں گول گپے کھلاؤں گا اور تم ہر وقت اس کے پیچھے پڑی رہتی ہو۔“
 ”وہ نیک بچہ سارے گول گپے خود کھوٹا۔“
 ”مانو! اب کیا تمہارے جھوٹے برتن بھی میں اٹھاؤں گا۔“ سرار خالی پلیٹ اٹھائے باہر آیا۔
 ”اے اللہ نہ کرے۔ تم کیوں اٹھاؤ۔ اور تم۔ ذرا تمیز ہے۔ کٹو پلیٹ۔“ بے جی نے اسے بری طرح گھورا۔
 ”بے جی۔“ مانو نے احتجاجاً ”کچھ کہنا چاہا۔ اسرار نے دوستانہ انداز میں پلیٹ اس کے ہاتھ میں تھما دی۔

”بری بات، بڑے کچھ کہہ دیں تو زیادہ غصہ نہیں کرتے۔ یہ لو اور دھو کر رکھنا۔“
 ”تمہاری جو شمی پلیٹ دھوئی ہے میری جوتی۔“ وہ پلیٹ واپس اس کے ہاتھ پہ مار کر چلی گئی۔ بے جی کا منہ کھلے کا کھلا رہ گیا۔
 ”دیکھو، دیکھو ذرا اس لڑکی کی جرات، نہ شرم نہ لحاظ۔ یہ عالیہ کی لڑکیاں تو بالکل ہی منہ زور ہوتی جا رہی ہیں۔ بلاناظر اس کی ماں کو۔“
 ”کوئی بات نہیں بے جی! میں نے برا نہیں مانا۔“
 ”وہ تو تمہاری اچھائی ہے، پران کو بھی اگلے گھر جانا ہے یا نہیں۔ تب کیا شوہر کے سامنے بھی یونہی برتن پٹے گی کہ تمہارے جوٹھے نہیں دھوئے جاتے۔“
 ”بیل ہو رہی ہے، میں دیکھتا ہوں۔“ اسرار نے کھسک جانا مناسب سمجھا۔ بیل واقعی ہو رہی تھی اور آنے والا حادثہ تھا ان کا بڑا پوتا۔

بے جی سب بھول بھال اس کے واری صدقے ہونے لگیں۔
 وہ سارا اور کرن کی منگنیوں میں شرکت کرنے آیا تھا۔
 اس سے اگلی شام زارا اور سدرہ بھی اپنے اپنے بچوں کے ساتھ آگئیں۔



دونوں بھتیجیوں کے رشتے اچھی جگہ طے ہو گئے۔ جہاں نواز اور ناصرہ ہلکے پھلکے ہو گئے، وہیں جبار احمد بے چین سے ہو گئے۔ کوٹ پر کوٹ بدلتے دیکھ کر عالیہ پوچھ بیٹھیں۔

”کیا بات ہے نیند نہیں آرہی؟“

انہوں نے گویا سوئے ہوئے شیر کو جگا دیا۔

”دیکھتے ہی دیکھتے نواز کی چاروں لڑکیاں ٹھکانے لگ گئیں بس اک مریم رہ گئی ہے۔ تم اور تمہاری اولاد کے آدرش اتنے اونچے نہ ہوتے تو آج ہم بھی چین کی نیند سوتے مگر تم جیسی عاقبت نااندیش عورت جس کی بیوی ہو، اس کے نصیب میں نیند کہاں؟ جیسی خود، ویسی ہی اولاد۔ سب کچھ اماں پر چھوڑا ہوتا تو آج میری بیٹی کی مگنی ہو رہی ہوتی۔“

وہ دونوں ہاتھ مسل رہے تھے۔

”اس مولوی کے ساتھ جو چند ہزار کما رہا ہے یا بجلی کے عکے کے ملازم کے ساتھ۔“ انہوں نے طنز کے ساتھ کہا۔ جلی بھنی تو خود بھی تھیں۔ اپنے جلاپے کو ان رشتوں میں نقص نکال نکال کر چھپا رہی تھیں۔

”یوں بھی مگنی ہوئی ہے۔ ہزار روپیہ ہاتھ پر رکھ دیا۔ چلو رسم ہو گئی، جان چھوٹی، میری نازوں پٹی بچیاں، ہزاروں ارمان۔ یوں کیسے دھکا دے دوں۔“

”دکھاؤ اچھچھوڑے لوگ کرتے ہیں۔ وضع داری میں زبان ہی سب کچھ ہوتی ہے۔ وہ لوگ یوں بھی شریعت پر چلنے والے ہیں۔ ہماری لڑکیاں دنیا سے انوکھی نہیں، سر پکڑ کر روو گی۔“ وہ الٹ پڑے۔

”کبھی کوئی اچھا جملہ بھی بول لیا کریں، جیسی ماں کی زبان ویسی بیٹی کی۔“

جبار احمد کچھ لمحے تاسف سے بیوی کو دیکھتے رہے پھر آہستگی سے بولے۔

”میں آج تک سمجھتا رہا کہ اماں جلدی کرتی ہیں، آج احساس ہوا، ہم نے دیر کر دی۔“

عالیہ نے مزید ان کی جلی کئی سینے کے بجائے باہر نکل جانا مناسب سمجھا۔ سارا کے کمرے سے لڑکیوں کے منہ بولنے کی آوازیں آرہی تھیں۔ لاؤنج میں لڑکوں نے محفل سجا رکھی تھی۔

وہ کچن میں آگئیں۔ سٹے سٹائے کچن میں اگر بکھراوا تھا تو چائے کے سامان کا۔ یقیناً لڑکیوں کے جانے کے بعد لڑکوں نے خود چائے بنائی تھی۔ ایک طرف مٹھائی کی ٹوکری کھلی پڑی تھی۔ وہ بے دلی سے چیزیں سیٹھنے لگیں۔ لڑکوں کے قہقہے اور آوازیں کچن میں واضح سنائی دے رہے تھے۔

”حارث بھیا! اب آپ ہی کچھ سوچیں۔ کب تک ہو ٹلنگ کریں گے۔“ سررا چھیڑ رہا تھا۔

”یار! ہم تو تیار ہیں۔ اب۔۔۔“ اس نے دانستہ فقرہ ادا دھورا چھوڑا۔

”پھر بیٹھے انتظار کرتے رہیں میں نے تو امی سے صاف کہہ دینا ہے۔ سارا آپنی اور کرن کی بعد میری

باری ہے۔“ عدیل بولا۔

”میں پہلے بیروں پر تو کھڑے ہو جاؤ۔“

”ایک آدھ سال کی بات ہے۔“

عالیہ کچھ اور کس گئیں۔

”اس کو بہت جلدی ہے۔ امی کا کیا ہے لے آئیں گی، کسی چھوٹے موٹے گھر کی لڑکی۔“
 ساری رات ان کی جلتے کڑھتے گزر گئی۔ صبح انہوں نے پہلا کام صغریٰ کو فون کرنے کا کیا۔
 ”تمہارے پاس کوئی ڈھنگ کا رشتہ ہے یا نہیں یا میں کسی اور سے بات کروں۔“
 صغریٰ بوکھلا گئیں۔

”میں نے تو بہت سے رشتے بتائے اب۔“

”ان سے بات کی، جن کا ڈیفنس میں آٹھ کنال کا بنگلہ ہے۔“ انہوں نے بات کاٹی۔
 ”ہاں کی تھی، تک چڑھے لوگ ہیں۔ کتنے تھے ہمارے پاس بہترے رشتے ہیں۔ سوچ کر بتائیں گے۔ سچی
 بات ہے بی بی! وہ لوگ میرے دل کو نہیں لگے۔ بڑے شیخی خور ہیں۔ رشتے ناتے اپنے جیسے لوگوں میں اچھے
 رہتے ہیں۔ لڑکی خوش رہتی ہے۔“

صغریٰ بی بی نے ہمدردی کے ساتھ سمجھایا۔

”صغریٰ! نصیب تھیں کرنے کو میری ساس کافی ہیں۔ تم کسی طرح ان لوگوں کو لے آؤ، میری صدف میں
 کس چیز کی کمی ہے۔“

”اچھا دیکھتی ہوں۔“ وہ کچھ متذبذب تھیں۔ عالیہ نے بے حد تاکید کے ساتھ فون بند کیا۔ وہ کمر کس کر
 میدان میں اتری تھیں۔

”اب میں کر کے دکھاؤں گی۔“

”میں انداز نہ تھا، صرف اپنی عقل پر بھروسہ کرنے والے کبھی بکھار منہ کے بل گرتے ہیں۔“



آخر صغریٰ ان آٹھ کنال والوں کو گھرانے میں کامیاب ہو ہی گئیں۔ ان کے چھوٹے سے گھر میں گویا
 بھونچال آگیا تھا۔ عالیہ تو یوں گھبرائی تھیں گویا بم دھماکہ ہونے والا ہو۔ کسی کو ادھر دوڑا رہی تھیں تو کسی کو
 ادھر۔ سامان کو ادھر ادھر کر کے سیٹنگ تبدیل کرنے کی کوشش کی جا رہی تھی۔

ملازمہ کے ساتھ ساتھ لڑکیوں کی بھی شامت آگئی۔ صدف کو خاص تاکید کی کہ کالج سے چھٹی کرے
 مگر اس نے بے نیازی سے کہہ دیا کہ جلدی آجائے گی۔ بے جی نے اپنی لا تعلقی برقرار رکھی۔ مہمانوں کا
 حدود اربعہ سننے کے بعد بھی کوئی تبصرہ نہ کیا۔

”سچ بتانا۔ یہ مہمان صرف دیکھنے آرہے ہیں یا بارات لائیں گے۔“ سارا نے بے حد تھک کر سوال
 کیا۔

”اللہ کرے بارات ہی لے آئیں۔“ کرن نے ہانپتے ہوئے سیدھا ہونے کی کوشش کی مگر کمر میں شاید
 چک پڑ گئی تھی۔ سو دونوں ہاتھ صوفے پر رکھ رکھائے کرتے لگی۔ وہ کب سے یہ صوفہ اکیلی ہی

کھسکانے کی کوشش کر رہی تھی۔ تب ہی دروازے سے جو شکل برآمد ہوئی، اسے پہچاننے میں تھوڑی دقت ہوئی۔

”کچھ دے دلا کر رخصت کرو۔“

”کیوں۔“ نیا نے سر پر منڈھا دوپٹہ اور کندھے سے ڈنڈا اتارا۔ اس کے بال حسب معمول گھونسلے کی طرح کھڑے تھے۔

”میں جالے اتارا تار کر آدمی رہ گئی ہوں۔“

”ارے، یہ تو اپنی نیا کی آواز ہے۔“

”موس۔“ وہ دھپ سے قالین پر بیٹھی۔

”جالے ڈنڈے سے اتارنے تھے، تم کیا سرے اتارنے لگی تھیں۔“ سارا نے اس کی لٹ سے الجھا جالا اتارا۔

”ہم جو مرضی کر لیں، اس گھر کو ڈیفنس کے بنگلے میں نہیں بدل سکتے۔“ کرن نے مایوسی سے کہا پھر کمر پر ہاتھ رکھتی قریب ہی بیٹھ گئی۔

”اسی لیے کہتے ہیں، پرواز اتنی ہی بھوجتی ہے کہ پر اجازت دیں۔“ سارا نے کہا۔

”ارے رہنے دو، ایک بار صدف آپ کی کارشتہ وہاں ہو جانے دو پھر ہمارے لیے بھی راہ کھل جائے گی۔“

نیا نے ہاتھ نچا کر کہا۔

”اس بات کی کیا گارنٹی ہے؟“ سارا ہنسی۔

”گارنٹی تو کسی بات کی نہیں۔ تم تو ہزار روپیہ ہاتھ میں لے کر خوش ہو گئیں۔ ہزار روپے میں آنا کیا

ہے۔ ایک سوٹ لینے جاؤ تو ڈھنگ کا نہ آئے۔ ساری عمر یونیورسٹیاں گے، کفایت شعاری کے سبق پڑھا پڑھا کر۔“

”اتنا پڑھا کس لیے ہے۔ میں بھی جاب کر لوں گی۔ لیکچرار تو ہو ہی جاؤں گی۔“ سارا نے لاپرواہی سے کہا۔

”کیسا چکنا گھڑا ہو، تم پر کسی بات کا اثر ہی نہیں ہوتا۔ وہ ایک روپیہ دے جاتے، تم تب بھی یونیورسٹی خوش ہوتیں۔“ نیا چڑ گئی۔

”بھئی، ہم اللہ کی رضا میں راضی رہنے والے مست ملنگ لوگ ہیں۔ تمہاری طرح سنہرے خواب اوڑھ کر نہیں سوتے۔ ہمارا بستر حقائق کی کھردری چادر، حقیقت پسندی کا تکیہ ہے۔ جو ہمیں ہمیشہ خوش اور مطمئن رکھتا ہے۔ جو ہمارے رب کی رضا، یہی ہماری زندگی کا موٹو ہے۔“

”کایو! مجھے پیاس لگی ہے۔ کوئی اللہ کی بندی پانی پلا دے۔“ ان کی باتوں سے آگے نہ بڑھائی۔

”اللہ کی بندیاں بھی تھکی ہوئی ہیں۔“ نیا نے آرام سے اس کی گود میں سر رکھا اور لیٹ گئی۔ سارا پردہ

اکا کر چلی تو چو گئی۔

”تم نے اسے گود کب لیا۔“

”دفع۔“ کرن نے ٹانگیں کھینچیں۔ نیا کاسر فرش سے ٹکرایا، وہ وہیں گچھا مچھا ہو گئی۔

”میں یہاں سے نہیں اٹھوں گی۔“

مریم اور ماترہ نے انہیں یوں بیٹھے دیکھا تو خود بھی پاؤں پسار لیے تھوڑی دیر کے بعد مسرت اسکوائش کا جگ بھر کر لے آئی۔

”جیو ہنسا۔ جیو۔ ہم تو گوڑے گوڑے تھک گئے تھے۔“ سب نے باجماعت نعرہ لگایا۔ مسرت کا منہ بن

کیا۔

”بے جی نے بھجوا یا ہے کہ لڑکیاں تھک گئی ہوں گی۔“ اس نے ٹرے درمیان میں رکھی۔

”خوش رہیں بے جی۔“

”لیکن بے جی کی خاموشی معنی خیز ہے۔“ مریم نے خیال آرائی کی مگر کسی نے تبصرہ نہیں کیا۔

”تمہارے سرال والوں کو بھی آج ہی بلا لیا ہوتا۔ کل پھر ہی کھڑا ک۔“

”سنو، یہ بجلی کے محکمہ والوں کے گھروں میں لوڈ شیڈنگ ہوتی ہے؟“ مریم نے سوال کیا۔

”نہیں، وہ منہ نہیں بستے ہیں۔ ہیں۔ یہاں تو الیاں ہونے لگی ہیں۔“ عدیل نے اثری دی۔

”ہاں۔ ہم نوا موجود ہیں۔ سوال کی کمی تھی۔ تم صبح سے کہاں غائب ہو۔“ سارا نے پوچھا۔

”ایک مہم پر نکلا تھا۔ بے جی کہاں ہیں؟“

”ظاہر ہے اپنے کمرے میں۔ وہاں نہیں تو پچھلے برآمدے میں۔“

وہ سر ہلاتا چلا گیا۔

”میں نے پوچھا تھا بجلی کے محکمہ۔“

”اے۔ ہٹاؤ بھی۔“ کرن نے کسی قدر بے زاری سے کہا۔ سارا نے بغور اس کے انداز دیکھے۔ وہ

کچھ اکھڑی اکھڑی سی نظر آتی تھی۔ ظاہر ہے کہیں نہ کہیں صدف کے زریں خیالات اثر کرنا ہی تھے۔

”ٹھیک ہو جائے گی۔“ اس نے سوچا اور پچھلے برآمدے میں چلی آئی، جہاں سدرہ اور زارا کے بچوں

نے اوڈھم مچا رکھا تھا۔ خوزہ دونوں ماں کے ساتھ ایک ہی چارپائی پر بیٹھی بقول عدیل، عمیر اپنے اپنے

سرال کی بدخونی میں مصروف تھیں۔

”یہ آپ لوگوں نے یہاں کیوں ڈیرہ جمار کھا ہے؟“ وہ کہتے ہوئے چارپائی کے ایک طرف نکلی، تراخی

آواز آئی اور وہ سب کی سب نیچے۔

”آ۔ آ۔“ کی آوازوں نے کھیلے بچوں کو متوجہ کیا۔ بجائے اپنی اپنی ماؤں کو اٹھانے کے سب نے

تالیاں پیسٹ پیسٹ کر مٹکڑا ڈالا۔

”ممنی! کتنا وزن بڑھا لیا ہے۔“ وہ خود ہی پکڑو عکڑ کر کھڑی ہوئیں۔ ماں کو سہارا دیا۔
”لو۔ مجھ پر خواہ مخواہ ہی۔“ وہ تجل سی ہو کر دوسری چارپائی بچھانے لگی۔
”سب کی سب ایک ہی چارپائی پر چڑھ جاتی ہیں۔ کما بھی تھا کہ دوسری بچھالو۔ ابھی بے جی نے دیکھ لیا تو پتا چلے گا۔“ ناصرو نے گھٹنا سہلاتے ہوئے بیٹیوں کو گھورا۔
”تو بس۔ امی آج بھی اپنی ساس سے اتنا ہی ڈرتی ہیں۔“ زارا انہی۔
”میں پوچھ رہی تھی، آپ لوگ اتنی گرمی میں یہاں کیوں بیٹھی ہیں۔“ وہ تینوں پھر سے ایک ہی چارپائی پر بیٹھ گئی تھیں جبکہ سارا نے گریز ہی کیا۔
”خیر اتنی بھی گرمی نہیں۔ دوسرے وہاں چچی کے ہائی فائی قسم کے مہمان آرہے ہیں۔ ہمارے بدتمیز بچوں نے کوئی بد مزگی کر دی تو چچی کا موڈ بہت دنوں تک خراب رہے گا۔“
سدرہ زار امنہ پھسواقع ہوئی تھیں۔
”یہ گھر صرف چچی کا تو نہیں ہے۔“ سارا کو برا لگا۔
”چھوڑو، وہ تو ابھی تک تمہاری ساس کے دیے ہزار روپے کا مذاق اڑا رہی ہیں۔“ ناصرو نے قدرے دل گرفتگی سے کہا۔
”امی! آپ بھی کن کی باتوں کو دل سے لگاتی ہیں۔ سارا کی ساس کتنی نرم اور شفیق خاتون ہیں اور توصیف۔۔۔ میرا تو دل خوش ہو گیا۔ ایسا حیا دار اور رکھ رکھاؤ والا نوجوان ہے۔“ زارا نے کہا تو سارا کو انہی آگئی۔
”تمہاری کیوں دندیاں نکل رہی ہیں۔“
”آپ کے حیا دار کہنے پر کسی پردے دار خاتون کا تصور ابھرتا ہے۔“
”پاکل ہو۔ ہماری کو تاہ نمی ہے کہ ہم نے حیا کو صرف لڑکیوں سے منسوب کر دیا ہے۔ حالانکہ یہ ہمارے پیارے نبی کریم صلی اللہ علیہ وسلم کی شخصیت کی ایک اہم خصوصیت گروانی جاتی ہے حیا عورت کا زیور ہے تو مرد کا وقار بھی ہے۔ پھر امی! کتنی سہولت ہو گئی ہے ہم بھی کسی بڑے کھڑاک سے بچ گئے۔
”ممنی پر فضول میں خرچ ہونے والا روپیہ سارا کی شادی پر کام آئے گا۔“ زارا نے رسائیت سے سمجھایا۔
”اور کیا۔۔۔ یہ آج ہی دیکھ لیں۔ رشتہ دیکھنے پر کیا کچھ ہو رہا ہے۔ ممنی شادی تک تو چچا جان دیوالیہ ہی ہو جائیں گے۔“ سدرہ ہنسی پھر سارا سے کہنے لگی۔ ”تم جا کر بچن دیکھ لو، ورنہ چچی کہیں گی، ہم سب جیلس ہو کر غائب ہیں۔ تھوڑی دیر میں ہمیں بھی آتی ہوں۔“
”امی! چچی نے حارث کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“ سدرہ نے سارا کے جانے کے بعد پوچھا۔
”تمہاری چچی کی رمز اللہ ہی جانے۔“ انہوں نے بے زاری سے کہا۔

”میں مریم کے بارے میں سوچ رہی تھی۔ گھر میں ہی رہ جائے تو کیا ہرج ہے۔“ فاختہ بیٹی کا منہ دیکھنے لگیں مگر زارا فوراً ہی بول اٹھی۔

”رہنے دو سدرہ! حارث کے جوڑ کی سارا اور کرن بھی تھیں۔ انہوں نے جب بات نہ کی تو مریم کے لیے خاک کریں گی۔ تمہیں کیا لگتا ہے، بے جی خواہ مخواہ سارا اور کرن کے رشتوں کے لیے بے تاب ہو رہی ہوں گی۔ انہوں نے کسی نہ کسی بہانے چچی کا عندیہ لے لیا ہو گا۔“

”اس طرح تو عدیل کا جو نامزہ کے ساتھ بنتا ہے۔“ ناصروہ کو دور کی سوچھی۔

”چھوڑیں۔ چچی بڑی اونچی ہواؤں میں ہیں، انہیں ساری عمر اپنے امیر کبیر میکے کا بڑا مان رہا ہے۔“ زارا نے کہا۔

”ان امیر میکے والوں نے کسی ایک کا بھی رشتہ نہیں پوچھا۔ چچی بتا نہیں کس دنیا میں رہتی ہیں۔ سسرال بھرا ہے میرا لڑکیوں سے۔ ڈھنگ کے رشتے ہی نہیں جڑتے۔“ سدرہ بے زاری سے گویا ہوئی۔

”اب بس کرو۔ لگتا ہے مہمان آگئے ہیں۔ میں جاتی ہوں، تم دونوں بھی آجاؤ۔ بچوں کو نامزہ یا مریم کے حوالے کرو۔“ ناصروہ کھڑی ہوئیں۔

”کوئی مرغیوں والا ڈربہ ہے تو اسی میں بند کر آتی ہوں۔“ سدرہ چڑکربولی تھی۔

مہمان اک لمبی گاڑی میں پوری سچ دھج سے آئے۔ ایک لمبا ادھیڑ عمر مرد، ٹوپس میں ملبوس اک موٹی بھدی عورت۔ جس نے ساڑھی اور بہت سا زور پھن رکھا تھا۔ بے حد قیمتی، کسی مہنگی بوتیک سے خریدا گیا جدید تراش خراش کاسوٹ پہنے اک لڑکی جس نے میک اپ کی پارلر سے کروایا تھا۔

عالیہ بوکھلائی پھر رہی تھیں۔ صدف ابھی تک نہیں آئی تھی۔ جبار احمد اور حارث کو ان کے پاس بٹھا کر وہ صدف کو فون پر فون کھڑکانے لگیں۔ بے جی لاؤنج میں بیٹھی خاموشی سے ان کی حرکات و سکنات دیکھ رہی تھیں۔ وہ ابھی تک مہمانوں سے بھی نہیں ملی تھیں لیکن یہاں بیٹھی ان کے ارشادات ضرور سن رہی تھیں کہ درمیان کی کھڑکی ان کی ہدایت پر عدیل نے کھولی تھی۔

مرد کے پاس اگر اپنی دولت کے قصے تھے تو عورت مسلسل ان رشتوں کی تفصیل سن رہی تھی جو گھر بیٹھے ان کے بیٹے کے لیے آرہے تھے۔ لڑکی نخوت بھرے انداز میں ناقدانہ نظموں سے گھر اور افراد خانہ کا جائزہ لے رہی تھی پھر اس نے اپنی باریک سی آواز میں پوچھا۔

”یہ اتنے سارے لوگ اتنے چھوٹے سے گھر میں کیسے رہتے ہیں؟ اتنی گرمی اور جس۔ اے سی بھی نہیں ہے۔“

انہوں نے اے سی ہال کمرے میں اس لیے لگوا یا تھا کہ افراد خانہ کو سہولت ہو۔

بھاری بھر کم مٹی اب اپنے گھر میں موجود اسپلٹ کی تعداد بتا رہی تھیں۔

تب ہی صدف آگئی۔ عالیہ لپک کر اس کے قریب آئیں۔

”کہا بھی تھا جلدی آنا اب جاؤ حلیہ ٹھیک کر کے آؤ۔“

”حلیے کو کیا ہوا، ٹھیک تو ہے۔“ صدف نے قدرے جھنجھلا کر کہا۔ اسے یوں روایتی لڑکیوں کی طرح بردھوے کے لیے جانا ہی عجیب محسوس ہوا۔ شادی سے متعلق اس کا تصور اس سے بالکل مختلف تھا۔ اس نے بیگ ایک طرف رکھا اور اپنے انبی اعتماد کے ساتھ مہمان خانے میں داخل ہوئی۔ عالیہ اس کے ساتھ تھیں۔ انہوں نے ہی تعارف کروایا۔ باقی لڑکیوں کو خاص تاکید تھی کہ اندر نہ آئیں۔ صدف نے ایک روایتی سا ہیلو کہا اور عین سامنے صوفے پر ٹانگ پر ٹانگ چڑھا کر بیٹھ گئی۔ ایک پل کو مہمان ٹھٹک سے گئے شاید آٹھ مرلے کے اس گھر میں ایسی پر اعتماد شخصیت کا خیال نہ تھا۔ جبار احمد اور حارث بہانے سے اٹھ گئے تاکہ صدف جھجک محسوس نہ کرے۔

”آپ نے میٹرک کس سن میں کیا؟“

لڑکی نے روایتی سا سوال کیا۔ صدف نے گردن موڑ کر اسے دیکھا اور دلنشیں انداز میں مسکرائی۔

”بہت سال ہوئے اب تو یاد بھی نہیں۔“

”بی اے تو یاد ہو گا۔“

”آپ سے ایک اُدھ سال بعد میں ہی کیا ہو گا۔“ صدف نے اطمینان سے جواب دیا۔ وہ جزیز ہو گئی تب ہی بے جی کی تشریف آوری ہوئی۔ عالیہ کا دل دھک دھک کرنے لگا۔ انہوں نے ایک دویار کہا تھا مگر بے جی نے چپ ہی سا دھلی نہ اقرار کیا، نہ انکار۔

”یہ صدف کی دوا دی ہیں۔“

عالیہ نے کہا۔ بے جی بہت اخلاق سے ملیں۔ بڑے رکھ رکھاؤ کے ساتھ ادھر ادھر کی باتیں کرنے لگیں۔ آج ان کے انداز روایتی نہ تھے۔ عالیہ مطمئن ہو کر چائے سرو کروانے لگیں۔

”سنا ہے آپ کا گھر بہت خوب صورت اور شاندار ہے۔“ بے جی ستائشی انداز میں کہہ رہی تھیں۔ عالیہ مسکرا دیں۔

”جی۔۔۔ دو کروڑ قیمت ہوگی۔ آپ کے پورے گھر جتنا تو لاؤنچ ہی ہے۔“ صاحب نے فخریہ انداز میں بتایا۔

”کتنّا کرایہ دیتے ہیں۔۔۔؟“ انہوں نے سادگی سے دریافت کیا۔

”تیس ہزار۔“ خاتون نے کتے کتے زبان لیوں تلے دیالی اور گڑبڑا کر شوہر کی طرف دیکھا۔

”ہمارا اپنا گھر ہے۔“

”اچھا۔۔۔ اچھا۔۔۔ مجھے ہی مغالطہ ہوا ہو گا۔“ بے جی نے معذرت خواہانہ انداز میں کہا۔ عالیہ نے ناگواری سے انہیں دیکھا۔ ”شروع ہو گئیں بڑی بی۔۔۔“

”گوال منڈی والا مکان کب بچھا۔۔۔؟“ بے جی نے معصومیت سے دریافت کیا۔ سب مہمانوں کے رنگ ایک دم اڑ گئے۔ مرد کو کھانسی آگئی۔ خاتون نے چائے کی پیالی منہ کو لگالی۔ گرم گرم چائے نے

ہونٹ جلا دیے۔ عالیہ نے صورت حال سنبھالنا چاہی۔ بے جی نے دو سرا وار کیا۔
”باقی بچوں کو بھی لے آتے۔“

”بے جی! انشاء ان کی اکلوتی بیٹی ہے۔“ عالیہ حواس باختہ ہوئیں۔
”اچھا باقی کے آٹھ کیا ادھار مانگے تھے۔“ وہ استہزائیہ انداز میں ہنسیں۔
”موا کی لکھا سی میں شدت آچکی تھی۔ لڑکی گھبرا کر ماں باپ کے چہرے دیکھنے لگی۔
”نا ہے آپ کا بڑا داماد آپ کے ساتھ ہی رہتا ہے۔“ بے جی کی پٹاری میں نجانے کیا کیا بند تھا۔
”مجھے لگتا ہے ان کی طبیعت خراب ہو رہی ہے۔“ خاتون تیزی سے انھیں اور شوہر کا بازو پکڑ لیا۔
”کیوں۔۔۔ ان کو دمہ ہے۔“

”ہم پھر حاضر ہو جائیں گے۔“ وہ ساڑھی کے پلوں میں الجھیں۔ لڑکی نے ماں کو سہارا۔
”زحمت مت کیجئے گا۔“ صدف اک جھٹکے سے کھڑی ہو گئی۔ عالیہ ہکا بکا اس صورت حال کو سمجھنے کی
کوشش ہی کرتی رہیں۔ مہمان گدھے کے سر سے سینک کی طرح غائب ہوئے۔ بے جی اطمینان سے
چائے پینے لگیں۔ باقی سب ایک دو سرے کا منہ دیکھ رہے تھے۔ جب تک جبار احمد واپس آئے۔ معاملہ
ہی الٹ چکا تھا۔

”مہمان کہاں گئے؟“ انہوں نے تعجب سے دریافت کیا۔
”اپنی ماں سے پوچھیں۔“ عالیہ نے غصے سے کہا اور باہر نکل گئیں۔
”کسی کو گھر بلانے سے قبل کچھ اتنا پتا بھی کروالیا کرتے ہیں۔ یہ نہیں کہ جو جس نے کہہ دیا اس پر
اعتماد کر لیا۔ ان کم ذات لوگوں میں بیٹی دینی تھی۔ دیکھا ایک پل میں غائب ہو گئے نا۔ کوٹھی کرائے کی،
گاڑی بھائی کی، اور پیسہ سارا جوانی کا، جو گھر داماد کا ٹھہ کا لونا سب ان پر لٹا رہا ہے۔ بیٹیاں ایسی بوجھ بھی
نہیں کہ انہیں یوں بے سوچے سمجھے پھینک دیا جائے۔ سارا! یہ سامان سمیٹو جو کچھ فریز ہو سکتا ہے۔
اسے فریز میں رکھو۔ کل آنے والے مہمانوں کے کام آئے گا۔“
انہوں نے بات ختم کی اور باقی چائے پینے لگیں۔ جیسے کچھ ہوا ہی نہیں۔ جبار احمد شرمندہ شرمندہ سے
باہر نکل گئے۔



”مجھے یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ تایا جان کی لڑکیوں میں کون سے لعل جڑے ہیں کہ دھڑا دھڑ سب کے
رشتے ہوتے چلے گئے۔ اور ایک آپ ہیں کہ ابھی تک صدف کی بات بھی طے نہیں کر سکیں۔“

عالیہ نے بیزار ی اور آکٹا ہٹ سے بیٹے کو دیکھا۔ جو اپنی پیننگ کرنے کے ساتھ ساتھ بڑبڑا رہا تھا۔
آن لائن کو بھی اس کے سسرال والے انکو ٹھی پہنا گئے تھے۔ حارث کو اب واپس جانا تھا۔
”اب میں کیا کروں۔ رشتے کیا آسمانوں سے ٹپک رہے ہیں۔“ وہ سخت آکٹائی ہوئی تھیں۔

”تایا کی لڑکیوں کے لیے آسمانوں سے ٹپکے ہیں۔“ حارث کے یوں کہنے پر وہ جزبر ہو گئیں۔
 ”اس دن اچھا بھلا رشتہ بے جی کی وجہ سے ہاتھوں سے نکل گیا۔“

”بس کریں امی! وہ اچھا بھلا رشتہ تھا؟ دعائیں دیں بے جی کو کہ بروقت پہنچا لیا۔ ورنہ کوئی بڑا نقصان ہو جاتا۔“

اس نے اٹیچی بند کیا اور باہر نکل گیا۔ عالیہ متھکر سی ہو گئیں۔ کچھ کچھ بیٹے کے تئیں بھی نظر آ رہے تھے۔ وہ زارا کا ہم عمر تھا۔ تین سال سے جا ب کر رہا تھا۔ شادی کی عمر بھی تھی اور ضرورت بھی۔ گھر سے باہر تھارنا آسان نہ تھا۔ مگر عالیہ کی سوچ وہی روایتی ماؤں والی تھی کہ پہلے بیٹیاں بیاہوں گی پھر مولادوں کی۔
 ”کیس آنے والی بیٹے کو مکھی ہٹا کر دیوار سے نہ چپکا دے۔“

کچھ وہ اکھڑا ہوا تھا، کچھ صدف ناراض، اس نے صاف کہہ دیا تھا۔ وہ آئندہ ایسے کسی ڈرامے کی حصہ دار نہ بنے گی۔ نہ اسے اس قسم کی اوٹ پٹانگ لوگوں کے سامنے آنے کے لیے کہا جائے۔ اگر انہیں زیادہ ہی جلدی ہے تو تایا ب کے بارے میں سوچ سکتی ہیں۔
 عالیہ کی نیند میں کمی اور فکروں میں اضافہ ہو گیا تھا۔

سدرہ اور زارا بھی ایک ہفتہ رک کر اپنے اپنے گھروں کو سدھار گئیں۔ ان سے پہلے ہی سجاد احمد مسرت کو لینے پہنچ گئے۔ وہ بہت سی یادیں دامن میں سمیٹے گاؤں واپس آ گئی۔



اماں نے اوپر اوپر سے بے حد ناراضی دکھائی۔ مگر وہ بھی مسرت تھی۔ گلے میں بازو ڈال منتیں چاچلو سی، انہیں منا کر ہی دم لیا۔ پھر جو ماں کے گھٹنے سے لگ کر شہر کی باتیں بتانے لگی تو کئی دن اماں کے کان کھائے۔ زبیر بھی آجاتا۔ کید کید کر پوچھتا۔

”تو نے جینا پاکستان دیکھا؟“

”نہیں۔“

”بادشاہی مسجد۔“

”نہیں۔“

”نار کلی۔“

اس نے پھر سے نفی میں سر ہلایا تو چڑ گیا۔

”تو تو نے دیکھا کیا ہے؟“

”گھومنے تو کہیں گئے ہی نہیں۔“ مسرت نے مایوسی سے سر ہلایا۔

”تو لاہور کیا کرنے گئی تھی۔ رشتہ ڈھونڈنے۔“

”شہر۔ میں بتاتی ہوں۔ کیا کرنے گئی تھی۔“ مسرت نے جوتی اٹھائی تو وہ بگٹ بھاگا۔

”ایسے مل جائے تو کیا حرج ہے۔“

”میں بتاتی ہوں۔“ پیچھے سے اماں نے دھمو کا جڑا۔ مسرت آگے کو لڑھک گئی۔

”تو بہ اماں۔ تو تو سرگوشی بھی سن لیتی ہے۔“

”سرگوشی۔۔۔ میں تو تیرے دل کے خیال تک جان لیتی ہوں۔۔۔“ اماں نے پرات اٹھائی تو مسرت نے ہاتھ سے رات لہلی۔

”تب بھی نہیں سمجھتی ہو۔“

”سب سمجھتی ہوں۔ تو پاگل ہے۔۔۔ اور میں تیری ماسی کوہاں کر رہی ہوں۔“

اماں حتیٰ لہجے میں کہہ کر اندر چلی گئیں۔ مسرت نے سارا غصہ آٹا گوندھنے میں نکالا۔ رات کو جب وہ ساجد علی کے ساتھ یہی بات کر رہی تھیں۔ وہ چپکے سے پاس جا کر کھڑی ہو گئی۔

”ابو جی! مجھے ایف اے کی کتابیں لادیں۔“

وہ دونوں اس کی طرف دیکھنے لگے۔

”مجھے پڑھنا ہے۔ ایف اے کے امتحان میں چھ ماہ رہتے ہیں۔۔۔ میں پرائیویٹ دوں گی۔ پھر تھراڈ ایر میں ایڈمیشن۔“

”دیکھا۔۔۔ میں نہ کہتی تھی۔۔۔ ساجد علی اسے شرمٹ بھیج۔۔۔ تو نے میری ایک نہ سنی۔۔۔ اب۔۔۔ اب دیکھ۔“

ساجد علی نے ہاتھ کے اشارے سے انہیں خاموش رہنے کا اشارہ کیا، خود ہم سا مسکرائے۔

”سچ کہہ رہی ہو؟“

”جی ابو جی! صدف باجی کہتی ہیں۔۔۔ میٹرک کر کے گھر بیٹھ جانا کوئی زندگی نہیں۔۔۔ مجھے آگے پڑھنا چاہیے تھا۔“ اس نے چور نظروں سے ماں کی طرف دیکھا۔ ان کا مزاج برہم تھا۔

”کون کون سے سیجیکٹ لوگی؟“

”ابو جی صدف باجی کے مشورے سے لوں گی۔“ وہ ان کے ان ڈائریکٹ اجازت دینے پر خوش ہو گئی۔

”ٹھیک ہے۔۔۔ لیکن اگر تمہاری اماں نے اجازت دی تو۔۔۔“

مسرت نے ہاتھی نگاہوں سے اماں کو دیکھا اور اماں نے بے بسی بھرے غصے سے شوہر کو۔۔۔ وہ شوہر کی رگ رگ سے واقف تھیں۔۔۔ انہوں نے مسرت کو اجازت دے دی تھی۔۔۔ اب وہ صرف ان کا بھرم رکھ رہے تھے۔۔۔ اور انہیں اپنا بھرم قائم رکھنا تھا۔

”ایک بات کان کھول کر سن لے۔۔۔ تو بھی اور تیرا باپ بھی۔۔۔ بھلے تو سولہ جماعتیں پڑھ لے۔ پر میں شفیق کے رشتے سے انکار نہیں کروں گی۔“

”اماں۔۔۔ میری سویٹ اماں۔“ اس کے لیے فی الحال پڑھائی کی اجازت اہم تھی۔ شفیق کے رشتے کو بعد میں دیکھا جاتا۔

وہ بھتے پانی میں پاؤں مارتے ہوئے قدرے اونچی آوازیں گنگنانے لگتی تو کبھی خاموش ہو کر درخت سے کچی پکی کیریاں توڑنے لگتی اور بھری دھپہ میں درختوں میں چھپی کوئل کی کوک سنتی۔ درختوں کی گھنٹی جھایا میں اب غنودگی سی جھانے لگی تھی۔

”کہاں رہ گئی ہو۔۔۔ فاطمہ! اب آ بھی جاؤ۔“

وہ آگئی۔ فاطمہ نے زیر کے ہاتھ پیغام بھجوایا تھا کہ وہ پہنچے۔ وہ بس ابھی آ رہی ہے کل فاطمہ کو شہر چلے جانا تھا۔

”گلتا ہے کہیں پھنس گئی ہے۔ اب نہیں آئے گی۔“ اس نے چھپاک سے پانی میں پیر مارا، پانی پر کسی کا عکس بن کر مٹا۔

مرست نے تیزی سے سراٹھایا۔

شفیق کو اپنے سامنے دیکھ کر دھک سے رہ گئی۔

”کس کا انتظار کر رہی ہو؟“ اس کی آواز نرم اور صاف تھی۔

”تمہارا نہیں کر رہی۔۔۔“ وہ کچھ پزل سی ہو کر دوپٹہ ٹھیک کرنے لگی۔ پٹہ پیچھے جو مرضی کہہ لے۔

ویسے وہ شفیق سے بدلتی تھی۔

”ایک دن کو گی۔“ وہ ہنس دیا۔

”میں کیوں کرنے لگی۔۔۔؟“ مرست تنک کر بولی۔

”تم رشتے سے انکار کر رہی ہو۔“ اس کے چہرے اور آنکھوں سے سنجیدگی ظاہر ہوئی۔ مرست کا جی چاہا

ما تھا پیٹ لے۔

(اماں کو بھی ڈھنڈورا پیٹنے کا شوق ہے کوئی اور بہانہ نہ کر سکتی تھیں۔)

”میں نے تو نہیں کیا۔“ وہ اس کے یوں براہ راست پوچھنے پر گڑبڑا گئی۔ اسے کیا معلوم تھا۔ وہ یوں

جواب دی کے لیے سامنے آجائے گا۔

”تو تمہاری طرف سے ہاں ہے۔“ وہ درخت سے ٹیک لگائے، دونوں ہاتھ سینے پر باندھے بغور اس کے

تاثرات جانچ رہا تھا اور اس کا یوں دیکھنا مرست کو پرل کر رہا تھا، وہ یہاں سے جانا چاہتی تھی۔ مگر جہاں اسے

اترنا تھا وہیں شفیق کھڑا تھا۔ مرست نے اپنی گھبراہٹ کو غصے میں چھپانے کی سعی کی۔

”تمہیں شرم نہیں آتی۔۔۔ مجھ سے یہ سب پوچھتے ہو۔“

”شرم کی کیا بات ہے۔ تم نے انکار کیا ہے۔۔۔ میں وجہ پوچھنے آیا ہوں۔“

مرست کی بے چین نگاہوں نے دور تلک فاطمہ کو کھوجا۔

”وہ ابھی دور ہے۔۔۔“

”کون۔۔۔؟“ مرست چونکی۔

”جس کا تم انتظار کر رہی ہو۔۔۔“ اس نے گھنے پتوں میں چھپی کیری توڑی اور پانی میں زور سے پھینک دی۔ پانی اچھل کر مسرت کے پیروں پر پڑا۔

”تمہیں کیسے پتا۔“

بالکل ویسے جیسے مجھے یہ پتا ہے کہ اس رشتے پر اعتراض صرف تمہیں ہے۔ ”وہ اطمینان سے گویا ہوا۔
”بھاشیق پچھے ہٹ جاؤ۔ میں نے اترنا ہے۔“

”اتر جاؤ۔“

”پانی میں اتروں۔۔۔ وہ چڑ گئی۔

”میں سنبھال لوں گا۔“ وہ ہولے سے ہنسا۔

”کیوں تنگ کرتے ہو۔“ وہ روہا سی ہو گئی۔

”تنگ تو تم خود ہو گئی۔ اپنی بے کار خواہشات کے ہاتھوں۔۔۔ یہ جو تمہارے دماغ میں کیرا رنگ رہا ہے۔ میں اچھی طرح جانتا ہوں۔۔۔ بے وقوفی مت کو۔۔۔ میں اور تم بہت اچھی زندگی گزار سکتے ہیں۔ تم پر کوئی پابندی نہ ہوگی۔ سیاہ کر دیا سفید۔ کبھی نہیں پوچھوں گا۔۔۔ رانی بن کر رہو گی۔ ساری خواہشیں پوری کرنا، ماں کی طبیعت تو تم جانتی ہو۔ کتنی سادہ بلکہ اللہ لوک ہیں۔ تمہیں کبھی کسی بات پر نہ ٹوکیں گی۔“ شفیق کے سادہ اور صاف لہجے نے اسے اسیر کر لیا۔ وہ کچھ لمحے گم سم سی رہی۔ پھر سر جھٹک کر بولی۔
”مجھے گاؤں میں نہیں رہنا۔“

”عجیب لڑکی ہو۔“ اس کا لہجہ بگڑا۔ ”اب میں تمہارے لیے شر تو شفٹ ہونے سے رہا۔ میرا تو سب کچھ یہیں ہے۔ گھر، زمینیں، خاندان، برادری اور تم نے کیا شر جا کر مل لگائی ہے۔“
”تمہیں کیا۔۔۔ تم اپنا رستہ بناؤ۔ میری راہ کیوں روکی ہے۔“ وہ غصے سے بولی۔
”میں نے۔۔۔“ اس نے اپنے سینے پر انگلی رکھ کر حیرت سے دیکھا۔ ”راہ تو تم نے میری روک رکھی ہے۔ کسی اور طرف دیکھنے ہی نہیں دیتی ہو۔“

”تم۔۔۔“ وہ جھنجھلائی۔

”خالہ بتا رہی تھیں۔ تم کالج میں ایڈمیشن لے رہی ہو؟“

”ہاں۔۔۔“

”واپسی کب تک ہوگی؟“

”چار سال بعد۔“ مسرت جل کر بولی۔

”میں انتظار کروں گا۔“

”اگر میں تب بھی نہ آئی؟“

”آنا تو میں ہے۔۔۔ کیونکہ درخت اپنی جڑوں سے مضبوط ہوتا ہے۔ اور تمہاری جڑیں یہاں ہیں۔ اسی مٹی، اس سرزمین اور اس دل میں۔۔۔ یہ شہر اور پڑھائی والا شوق بھی پورا کر لو۔“ شفیق نے تیتن سے

اپنی بات پوری کی۔
 ”کہہ چکے اب میرا رستہ چھوڑو۔“
 ”اوس میں اتار دوں۔“ اس نے شرارت سے بازو پھیلا یا۔
 ”مجھے رستہ نکالنا آتا ہے۔ تم مت چھوڑو۔“ اس نے پانی میں چھلانگ لگادی۔ جھپکا ہوا اور شفیق کو بھگو گیا۔

وہ ہنستے ہوئے پانی سے ابھری۔ پھر ٹھٹک گئی۔
 شفیق مسکرا رہا تھا۔ پھر اس کی مسکراہٹ کچھ اور گہری ہوئی۔
 مسرت کو لگا۔ وہ کھڑے کھڑے پانی میں جلنے لگی ہو۔
 ”کیسی بے وقوفی کی۔ اب لٹان کے پھینکے کپڑوں میں سامنے کیسے نکلوں۔“
 خود کو سمیٹتی، پھینکے دوپٹے کو پھیلائے کی سعی میں پھر سے پھسل جاتی۔ مگر شفیق نے بازو سے پکڑ کر سہارا دیا۔ پھر اس کا ہاتھ درخت کے تنے پر ٹکاتے ہوئے دھم سی سرگوشی کی۔
 ”اک۔ اک دن گن کر گزراؤں گا۔ جلدی آنا۔“
 سبز پتوں میں دم سا دھسے ہوئے اس سرگوشی کو سنبھالا اور بتے پانی کے حوالے کر دیا۔ بتے پانی اس کے گرد دائرے بنانے لگے۔
 کوئل کی کوک میں تیزی آگئی۔
 وہ گم گم کھڑی اسے جاتا دیکھ رہی تھی۔



عالیہ دانستہ کنی بار اپنے بھائی کے گھر گئیں۔ شاید ان ہی کے ذہن میں کوئی بات ہو۔ اشارتاً ”لڑکیوں کے رشتوں کا ذکر بھی چھیڑا۔“
 ”ہاں بھی کوئی مناسب رشتہ دیکھ کر ہاں کر دو صدف کی تو عمر بھی نکلی جا رہی ہے۔“ بھابھی نے آرام سے کہا۔ عالیہ کو تاؤ ہی تو آگیا۔
 ”کچھ زیادہ عمر تو نہیں۔ اپنے علی کی ہم عمر ہے۔“ انہوں نے مٹھلے بھتیجے کا نام لیا۔
 ”لڑکوں کی عمر کون دیکھتا ہے۔ علی تو ویسے بھی کہتا ہے۔ پسند کی شادی کروں گا۔“ بھابھی تو گویا بات ہی ختم کر دی۔

”تم کسی رشتہ کروانے والی سے بات کرو۔“ بھابھی کے مشورے پر وہ دل موسس کر رہ گئیں۔ مگر جو پہلی وچو لن عالیہ کو ملی وہ ان کی بھابھی ہی کہ بھیجی ہوئی تھی۔ دو پار کی جاننے والی تھی۔
 ”بہت اچھے اچھے رشتے کروائے ہیں۔ کو تو بھجوا دوں۔“ انہوں نے فون کر کے پوچھا۔
 ”بھجوا دیں۔“ عالیہ نے کچھ بے زاری سے جواب دیا۔ سمجھ تو گئی تھیں کہ بھابھی اس خطرے کی گھنٹی کو بجنے سے پہلے ہی ہٹا دینا چاہتی تھیں۔ وچو لن کو انہوں نے اس وقت بلوایا۔ جب بے جی اپنے

کسی عزیز کی عیادت کے لیے گئی تھیں۔

”ہائے اللہ عالیہ آپا! تم نے مجھے اب بلوایا۔“ اس نے اپنے کلمے پیٹ لیے۔ بھاری جھٹ سافلی رگت بڑے بڑے ہاتھ پاؤں جہاں بیٹھتی خوب پھیل کر بیٹھتی۔ پھر اٹھنے کا نام بھی نہ لیتی۔

”ایسے۔ ایسے رشتے۔ ایسے ایسے لڑکے۔ کوئی ڈاکٹر کوئی انجینئر وڈے وڈے افسر کہاں کہاں کھا دیے۔ پہلے کیوں نہ بتایا کہ ادھر اپنی بیچیاں جوان ہیں۔ اب تک تو ساری کی ساری بیایاں جاتیں۔“

”مجھے کیا معلوم تھا۔ وہ تو مجھ بھی نے بتایا کہ تم نے بھی یہ کام شروع کر دیا ہے۔“ عالیہ نے بے زاری سے جواب دیا۔

”حالات۔ شوہر تین سال پہلے مزر گیا۔ ایک بیٹا کمانے جو گا تھا۔ مشین میں بازو آگیا۔ بے کار ہو کر بستر پر آڑا ہے۔ ہمیں تو کھانے کے لالے۔“ وہ منہ پر دوپٹہ رکھ کر سسکتے لگی۔ بھاری جھٹ یوں ہچکولے کھانے لگا جیسے پرانا انجن اشارت ہونے سے پہلے کھاتا ہے۔ عالیہ نے اب کے قدرے ہمدردی سے اسے دیکھا۔

”نہت کرو ناہید! اللہ کوئی نہ کوئی سبب بنا ہی دیتا ہے۔“

”سرکاسائیں نہ رہے تو عورت یونہی دھکے کھاتی ہے۔ اب ساری باری پھرتی ہوں۔ آپ جیسوں کے کام ہو جائیں تو میرا بھی بھلا ہو جاتا ہے مگر آپا تم نے پہلے کیوں نہ بلایا۔ خدا کی قسم ایسے ایسے رشتے ہاتھ سے نکل گئے۔“ وہ سسکیاں روک کر سابقہ ٹون میں واپس آگئی تب ہی نیا ہاتھ میں شربت کا گلاس لیے چلی آئی۔

”ناہید باجی! جو نکل گئے ان کی فکر چھوڑیں۔ جو ہیں ان کی بات کریں۔“

عالیہ نے اسے بری طرح گھورا۔

”تم یہاں کیا کر رہی ہو۔ جاؤ کچن میں۔ سارا کا ہاتھ بناؤ۔“

مگر وہ ڈھٹائی سے وہیں جم گئی۔

”میں اپنی بیٹی کو ایسی ویسی جگہ تھوڑی بیاہوں گی۔ دیکھنا کیسا امیر کبیر گھرانہ ڈھونڈتی ہوں۔ ایسی پیاری لڑکیاں ہیں۔“

”کی تو کوئی نہیں۔ پڑھی لکھی خوش شکل لڑکیاں ہیں۔ صدف کی تو تنخواہ ہی کافی ہے۔ بس نصیب میں ہی چکر ہے۔“ عالیہ نے آہستگی سے کہا۔

”کوئی چکر نہیں ہے۔ میں کل ہی ایک دو گھروں میں بات چلاتی ہوں۔“ اس نے شربت کا گلاس ختم کر کے نیا کو تھمایا۔

”باجی کے لیے چائے بنا لاؤ۔“ عالیہ نے نیا کو ٹالا۔ انہیں ناہید سے رشتوں کی تفصیل معلوم کرنا تھی۔ وہ چائے بنانے کچن میں آگئی۔ جہاں سارا دوپہر کا کھانا بنا رہی تھی۔

”سائلن تقریباً“ تیار ہے۔ تم کہاں عتاب ہو۔ آنا گوندھ لو۔ روٹی پکا لو۔“ بے جی نے کاموں کی تقسیم کر دی تھی۔ دوپہر کا کھانا سارا اور نیا کے ذمے رات کا کرن اور عالیہ بنا لیتی تھیں۔ ناشتہ ناصرہ اور لڑکیاں

مل جل کر کھلتی تھیں۔

اس نے چائے کا پانی رکھا تو سارا پوچھے بتا رہا نہ سکی۔

”اس وقت کس کے لیے بتا رہی ہو؟“

”اسی کی خاص الخاص مہمان ہیں۔“

اس نے پلیٹ میں بسکٹ نکالے۔ فرق میں مٹھائی کے ڈبے میں پانچ کھوئے والی گلاب جامنیں پڑی تھیں۔ وہ بھی نکال لیں۔

”خیر تو ہے۔ ناہید بی بی ایسی مہمان تو نہیں کہ اتنی خاطر مدارت کی جائے۔“

”ہیں۔ تم ناہید باجی کو جانتی ہو۔؟“ نیا چوگی۔

”بچہ! ہمیں سب بتا ہوتا ہے۔“ سارا نے ہاتھ اٹھا کر کہا۔

”بے جی کی صحیح جانچیں ہو۔“

”وہ تو ہوں۔ چائے پلا دو۔ کھانے کے لیے نہ روکنا۔“ سارا نے ہنڈیا میں بچہ چلایا۔

”ویسے بڑی غریب نواز بنتی ہو۔“ نیا نے طنز کیا۔ سارا نے زیادہ پروا نہیں کی۔ اسے افسوس تھا۔ چچی

اب رشتے کو لانے کے لیے ہزاروں روپے ان عورتوں پر ضائع کر رہی تھی۔ نیا چائے لے کر چلی گئی۔ ناہید نے سارے بسکٹ گلاب جامنیں ہضم کیں۔ چائے پی۔

”گھر سے صرف ایک گلاس لسی کا پی کر نکلی تھی۔ یہ وقت ہونے کو آیا۔ پیٹ میں چوہے دوڑ رہے تھے اب آنکھیں کھلی ہیں۔“

”ناہید باجی! آپ کھانا کھا کر جائیے گا۔“ نیا خواجواہ ریشہ معطلی ہو رہی تھی۔

عالیہ جربز ہو گئیں۔ وہ بے جی کے آنے سے پہلے ناہید کو چلتا کرنا چاہتی تھیں۔ ”جیتی رہو رب اچھا نصیب کرے۔ بڑے دل والی لڑکی ہے۔“ ناہید خوش ہو کر بولی۔ نیا گھبرا اٹھی۔

”نہیں نہیں بیماری کوئی نہیں ہے مجھے۔ بالکل نارمل سائز کا دل ہے۔“

”ہاں۔ کیسی معصوم لڑکی ہے۔“

عالیہ اٹھ کر کچن میں چلی گئیں۔ جلدی جلدی روٹیاں بنا کر کھانا کھلایا۔ ہزار روپیہ مٹھی میں دیا۔ وہ خوش خوش جلد آنے کا وعدہ کر کے چلی گئی۔

”خود مت آنا۔ پہلے فون کر لیتا۔ جب کہوں تب گھر آنا۔“ عالیہ نے تاکید کی۔

”اتنی سی میری بھی لڑکی ہے۔ کوئی پرانے کپڑے ہوئے تو وہ بھی نکال رکھنا۔“ ناہید نے جاتے جاتے

کہا۔ اس کے جانے کے کچھ ہی دیر بعد بے جی اور تاصووا پس آ گئیں۔

عالیہ نے شکرا دیا۔ ناہید جا چکی تھی۔ سورنہ خواجواہ ساس کے سوالوں کا جواب دینا پڑتا۔

”تو یہ تو یہ! کیسی ہلا کی گرمی ہے۔“ انہوں نے چادر اتار کر تخت پر رکھی۔

”اندرا آجائیں۔ اسے سی چلا دوں۔“

”نہ بھی ادھر ہی ٹھیک ہوں، ٹھنڈا پانی پلا دو۔“ وہ وہیں بیٹھ گئیں۔ نیا پانی لے آئی۔ عالیہ نے پکچھا چلا

دیا۔

”یہ فردوس کی لڑکی یہاں کیا کرنے آئی تھی؟“ انہوں نے اچانک سوال کیا۔

”توبہ ہے۔ ان کی بھی چار چار آنکھیں ہیں۔“

عالیہ ان کے سوال پر سخت بد مزاج ہوئیں۔ یقیناً انہوں نے ناہید کو گھر سے نکلتے دیکھ لیا تھا۔

”پتا نہیں۔ یونہی ملنے چلی آئی۔ آپ کا پوچھ رہی تھی۔“ انہوں نے گول مول جواب دیا۔

”سننا ہے رشتے تو شے کروا دیتی ہے۔“ بے جی کالجہ سرسری سا تھا۔

”توبہ! ان سے تو کوئی بات چھپی نہیں رہتی۔“ انہوں نے جل کر سوچا۔

”ہوں۔۔۔ کروا دیتی ہے۔“

”تم سے کتنے میسے ٹھک لیے؟“

”ولادہ جوان ہو گئی۔ پر آپ نے ابھی تک بیویوں کو بے وقوف ہی سمجھ رکھا ہے۔“ عالیہ نے تپ کر

کہا۔

”عالیہ بی بی! میں تمہاری رگ رگ سے واقف ہوں۔“ بے جی نے طنز کیا تو عالیہ نے اٹھ جانا ہی

مناسب سمجھا۔ وہ فی الحال ان سے بحث کرنا نہیں چاہتی تھیں۔



بے جی کو معلوم تھا کہ کس جگہ کس فرد کو آگے کرنا ہے۔ شاید اسی لیے وہ سب آج تک اکٹھے رہ رہے

تھے۔ رشتہ طے ہونے تک وہ ہر بات میں پیش پیش تھیں۔ اب جیز کی تیاری میں ناصرہ اور لڑکیوں کو فری

ہینڈ دے رکھا تھا۔ خود آرام سے ایک طرف ہو گئیں۔

”مجھے کیا پتا آج کل کے فیشنوں کا۔ لڑکیوں کو ساتھ لے لیا کرو۔ جنہوں نے برتا ہے اشیاء بھی ان کی

پسند کی ہونی چاہئیں۔ زیور، کپڑا، برتن اپنی اپنی پسند سے لے لیں۔“

”میں تو کہتی ہوں دونوں کو ایک جیسا۔“

”اچھا۔ اس کو لال رنگ پسند ہے۔ اس کو نیلا۔ اس کو چو کو ر پلیٹ اچھی لگتی ہے، اس کو گول۔ کوئی

عقل سے کام بھی لیا کرو۔ پیسوں کا حساب ایک سار رکھو۔ باقی ان کی مرضی۔“ بے جی نے گھور کر دیکھا تو

پاس بیٹھی سارا افس دی۔

”بے جی! ہمیں یہی باتیں تو آپ کا گرویدہ کیے ہوئے ہیں۔ ہر کسی کی خوشی کا خیال رکھتی ہیں۔“

”ہر کسی کو خوش کہاں رکھا جاسکتا ہے۔ بس یہی خیال رکھتی ہوں کہ کسی کی حق تلفی نہ ہو۔ اسی لیے تو

سب کو جوڑے بیٹھی ہوں۔ سب کو اپنا اپنا حصہ ملتا رہے تو اعتراض کرنے کی گنجائش ہی نہیں رہتی۔

بہر حال تیاریاں شروع کر دو۔ اس سال کے آخر میں ان شاء اللہ دونوں شادیاں کر دیں گے۔ اگرچہ دونوں

کے سرال والوں نے کوئی مطالبہ نہیں کیا۔ پھر بھی بیٹیوں کو دینا تو سب ہی کچھ پڑے گا۔“

بے جی اور ناصرہ مزید مشوروں میں لگ گئیں۔ کیا کچھ لے چکے ہیں۔ کیا کچھ لینا ہے۔ سرال والوں کو

کیا کیا دینا ہے۔ سارا بور ہو کر اٹھ گئی۔
 نایاب بالکونی میں کھڑی تھی۔
 ”تم کیا کر رہی ہو؟“

”اپنے شہزادے کا انتظار۔“

سارا نے ذرا سا جھک کر پہلے گلی میں جھانکا۔ پھر سامنے والے تین منزلہ چوبارے کو دیکھا۔
 ”چوبارے والے شیخ صاحب کی پہلے ہی تین بیویاں ہیں۔ گلی میں اس وقت یا سبزی والا گزرتا ہے یا
 ردی بیچنے والا۔ تمہاری نیت کس پر خراب ہوئی ہے؟“
 جواباً ”نایاب نے اسے کھا جانے والی نظروں سے گھورا۔
 ”خود تو متنی کروالی۔ اب باتیں تو بناؤ گی۔“
 ”تم بھی کروا سکتی تھیں۔“ سارا نے ترنت جواب دیا۔
 ”ہونہ۔!“

”اچھا۔ زیادہ دل پر نہ لو۔ تمہارا وقت بھی آہی جائے گا۔“ سارا نے تسلی دینے والے انداز میں اس
 کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”اے۔“ نایاب نے اس کا ہاتھ جھٹک کر خشمگین نگاہوں سے اسے گھورا۔ ”تم اپنے آپ کو سمجھتی
 کیا ہو۔ جب میری مٹکی ہوگی اور جہاں ہوگی۔ تم دیکھتی رہ جاؤ گی۔“
 ”مجھے اس دن کا شدت سے انتظار ہے ڈیر۔“ سارا نے ہمدردی سے کہا۔ ”اب آجاؤ۔ دوپہر کے
 کھانے کا کچھ کر لیں۔“

دونوں پلٹیں۔ پھر ٹھٹک کر رکیں۔ صدف کے کمرے کا دروازہ کھلا تھا اور وہ فون پکڑے کہہ رہی تھی۔
 ”آپ کو میرا نمبر کہاں سے ملا۔؟“

”ظاہر ہے۔ اپنی بھالی سے۔“

”آپ کو مجھے فون نہیں کرنا چاہیے تھا۔“ صدف کی خوب صورت پیشانی پر سلوٹیں پڑ گئیں۔
 ”کسی کی جان گئی۔ آپ کی ادا تھری۔ اب کیا جان لینے والے سے یہ بھی نہ پوچھوں کہ کیوں۔ صدف
 جی۔ کیوں کیا آپ نے ایسا۔؟“

”دیکھیے مسٹر! آپ مجھے کسی بات کے لیے مجبور نہیں کر سکتے۔ آپ نے پر پوزل بھجوا دیا۔ میں نے
 انکار کر دیا۔ ڈیٹس اس۔ اب آپ کیا چاہتے ہیں۔“ دونوں نے چونک کر ایک دوسرے کو دیکھا۔
 ”یہ تو پوچھنے کے لیے فون کیا ہے۔ جس ہستی کے انتظار میں میں نے زندگی کے قیمتی ماہ و سال
 گنوائے۔ چرے کی شادابی، آنکھوں کی چمک اور سر کے بال گنوائے، وہ مجھے فی الفور انکار کیسے کر سکتی
 ہے۔“ اس کے لہجے میں حد درجہ بے جا ہارگی تھی۔

”تو کیا اس کے لیے دس بیس لاکھ کا کوئی مضمون لکھنا پڑے گا۔“ صدف نے تنگ کر کہا۔
 ”صدف! آپ سمجھنے کی کوشش نہیں کر رہیں۔“

”بہتر ہے آپ سمجھ جائیں۔ بار بار میرے گھر کے چکر لگانے سے کچھ نہ ہوگا۔ میرا فیصلہ نہیں بدلے گا۔ اس لیے پلیز، آئندہ مجھ سے رابطہ کرنے کی کوشش مت کیجئے گا۔ آج بھی صرف اس لیے بات کر لی کہ ایک تو آپ فروا کے جیٹھ ہیں۔ دوسرے میں آپ کی خوش فہمی دور کرنا چاہتی تھی۔“ صدف کا لہجہ بالکل بے لگ تھا۔

”لیکن میں پھر بھی آپ کا منتظر رہوں گا۔“ جمل نے مدھم اور ٹھوس لہجے میں کہا۔ ”کہ میرے تو سارے رستے آپ تک آکر رک گئے ہیں۔ زندگی کی آخری سانس تک انتظار کروں گا۔ جب بھی ضرورت محسوس ہوئی ایک آواز دے دیجئے گا۔“

”اسٹوپڈ۔“ صدف جل کر رابطہ منقطع کرتے ہوئے مڑی وہ دونوں جو دروازے کے بیچوں بیچ کان لگائے صدف کے ہر جملے سے دوسرے طرف کے جملے کا اندازہ لگا رہی تھیں۔ کھسیا کر نیچے بھاگیں۔

”ال مہنؤث۔“ صدف نے دھاڑ سے دروازہ بند کر دیا۔
سارا نے نیچے جا کر ساری بات بے جی کو بتائی تھی۔ وہ تاسف سے سر ہلانے لگیں۔
”ایسے قدردان بار بار نہیں ملتے یہ لڑکی پچھتائے گی۔“

تاہید پانچویں دن دوبارہ آمو جوہ ہوئی۔ بے جی نہا رہی تھیں۔ عالیہ جلدی سے اسے اپنے کمرے میں لے گئیں۔

”بے جی کے سامنے کچھ کہنے کی ضرورت نہیں۔ خواہ مخواہ سو سو نقص نکال دیتی ہیں۔“
”ٹھیک ہے پہلے ٹھنڈا اٹھار شربت پلواؤ۔ پھر خوش خبری سناؤں گی۔“ وہ اپنا بھاری جھنڈا سنبھالتی بیڈ پر براجمان ہوئی۔ بیڈ پچارہ چوں چاں کر کے رہ گیا۔ نایاب فالسے کا شربت جگ بھر کر بنا لائی۔ اور وہیں براجمان ہو گئی۔

”بڑی ہی اچھی فیملی ہے۔ ساری کی ساری باہر۔ یہاں صرف لڑکے کی بہن رہتی ہے۔ ویسے تو یہاں بھی ان کی دودھ کو ٹھیاں ہیں لیکن وہ کہتے ہیں کہ لڑکی کو ساتھ ہی لے جائیں گے۔ بڑے والے کی ممکن بھی یہیں کی ہے۔ صرف مفتی میں ہی چار سیٹ چڑھائے۔ جیز ویبیز کا انہیں کوئی لالچ نہیں، کہتے ہیں ہمارے پاس اللہ کا دیا بہت کچھ ہے۔ بس نیک شریف لڑکیاں چاہئیں۔ میں نے تو لڑکے کی بہن سے بات بھی کر لی ہے۔ سن کر بہت خوش ہوئی پر یہ تو بتاؤ بڑی کی بات کرنی ہے یا منجھلی کی۔“

نایاب نے بے چینی سے پہلو بدل کہاں کو دیکھا۔

”دونوں کی تصویریں لے جاؤ۔ کسی کی بھی ہو جائے۔“

نیا مایوس سی ہوئی۔ بھلا صدف کے سامنے اس کی وال کہاں ملنا تھی۔ تب ہی صدف چلی آئی۔

”کامروالی نے آنا چھوڑ دیا ہے کیا؟ کتنے دنوں سے میرے کمرے کی صفائی نہیں ہوئی۔“

”گولی مارو صفائی کو، یہاں بیٹھو یہ تاہید ہے۔ اس کے پاس۔“ عالیہ نے اسے پاس بٹھانا چاہا۔ صدف نے

تیزی سے بازو چھڑایا اور ناگواری سے ناہید کو دیکھا۔
 ”ایکسکوز می ای! مجھے آپ کے کسی ڈرامے کا حصہ دار نہیں بننا۔ آپ نیا کی کریں اور
 پلیز۔ میرے کمرے کی صفائی کروادیں۔“
 وہ اس دن سے ہی اکھڑی ہوئی تھی۔
 ”چلو کوئی بات نہیں۔ کیا بڑی کیا چھوٹی۔ جو بھی ٹھکانے لگے۔“ عالیہ کو شرمندہ ہوتا دیکھ کر ناہید نے
 تسلی دی۔

”ٹھیک ہے۔ تم ان لوگوں سے بات کر کے جلدی بتاؤ۔“ عالیہ نے قدرے بچھے بچھے لہجے میں کہا۔ وہ دل
 سے چاہتی تھیں کہ پہلے صدف کی ہو۔
 ”وہ تو راضی ہی ہیں۔ کو تو اتوار کو لے آؤں۔“ اس نے ہتھیلی پر سرسوں جمائی۔ عالیہ کو اس سے بھی
 زیادہ جلدی تھی۔ فوراً ”مان گئیں۔“
 ”چھاسا انتظام کر لیتا۔“
 ”ظاہر ہے کسی گھسیارے کے گھر تو نہیں لاؤ گی۔“
 ناہید نے باقی ماندہ شرمٹ حلق میں اندھیلے۔
 ”وہ کچھ کپڑے شہڑے۔“

نایاب نے پہلے ہی نکال رکھے تھے۔ فوراً ”گھڑا اٹھالائی۔ مارے جوش کے اچھے اچھے کپڑے بھی رکھ
 دیے۔ وہ بھی جن پر اتنے عرصے سے مائے کی نظر تھی۔
 ”میں نے کہا۔ وہاں کنواں کھدوانے لگی ہو۔“ بے جی کی گونج دار آواز کمرے کے اندر تک آئی تو تینوں
 ہڑبڑا گئیں۔

”جاؤ۔ پہلے ان کو سلام کرلو۔ پر رشتے کی بات نہ کرنا۔ میں خود ہی بتا دوں گی۔“ ناہید باہر نکل آئی۔ بے
 جی تخت پر بیٹھی تھیں۔ مریم ان کے بالوں میں تیل لگا کر کنگھی کر رہی تھی۔
 ”خیر ہے۔ سو رانی تو کسی کو پانی کا مھونٹ نہ پوچھیں۔ تمہیں کیوں کھنسنے سے لگائے بیٹھی ہیں۔“ بے جی
 نے مشکوک نگاہوں سے اسے دیکھا۔

”آپ نہ رہی تھیں تو میں اندر آیا عالیہ کے پاس بیٹھ گئی۔“ ناہید ان کے پاس تخت پر بیٹھ گئی۔ بے جی
 اس سے گاؤں کے بارے میں پوچھنے لگیں۔

”عصرہ ہوا گاؤں چھوڑ کر شہر آگئے تھے۔ اب تو گاؤں جانا ہی نہیں ہوتا۔“
 تھوڑی دیر بیٹھنے کے بعد وہ عالیہ کے کمرے میں گھڑا اٹھانے گئی تو چپکے سے کہنے لگی۔
 ”آپا! کچھ پیسے دے دو۔ میاں کی دالانی ہے۔ ڈاکٹر نے کئی ٹیسٹ لکھ دیے ہیں۔“
 عالیہ نے فٹ سے دو ہزار لاکر اس کے ہاتھ پر رکھ دیے۔ وہ روپے گریبان میں اڑے کپڑوں کی گھڑی
 پر اٹھانے دعائیں دیتی چلی گئی۔
 ”خون کرونا کہ کتنے بچے آئیں گے۔ میں چائے کھانے کا بندوبست کر رکھوں گی۔“

عالیہ نے اسے جاتے جاتے تاکید کی۔ عالیہ نے رات کو کھانے کے بعد سب سے ذکر کیا تو بے جی بے اختیار ٹوک بیٹھیں۔

”اے سہیلی جلدی۔ کچھ پوچھ پڑتاں ہی کروالی ہوتی۔ پھر ہار والوں کا کیا بھروسہ۔“ انہوں نے بیٹے کو دیکھا وہ بیوی کو دیکھنے لگے۔

”سب ہو جائے گا۔ پہلے مل تولیں۔“ عالیہ نے بے نیازی سے کہا تو بے جی غصے سے خاموش ہو گئیں۔



اتوار کا دن تھا اور صبح سے گھر میں گھما گھمی تھی۔ حسب عادت عالیہ کا جوش دیدنی تھا۔ نیا کل ہی فیشل پیڈی کیور، مینی کیور کروا چکی تھی۔ بے جی چپ نہیں لیکن جب عمو ڈھیر سارے پیکری کے لوازمات اٹھائے آیا تو انہوں نے بے اختیار ٹوکا۔

”اے کوفون کر کے پوچھ تولو۔ کتنے مہمان ہیں؟ کس وقت آئیں گے؟“

فکر تو عالیہ کو بھی تھی کہ ناہید نے کچھ بتایا ہی نہ تھا۔ یہ نہ ہو کہ ان کا ارادہ بدل گیا ہو۔ یا آج وہ نہ آسکتے ہوں۔ اسی ڈر سے انہوں نے کھانے کا انتظام نہ کیا تھا۔ اگرچہ دو دن قبل ناہید کا فون آیا تو اس نے بتایا تھا کہ وہ مہمانوں کو لے کر ضرور آئے گی۔

”واہ بھئی واہ! آج تو لگتا ہے میدان مار رہی لوگی۔“ کرن نے نیا کو سراہا۔ جو بے بی پنک سوٹ میں نچل میک اپ اور ہلکی پھلکی جیولری کے ساتھ بڑی اچھی لگ رہی تھی۔

”بس دعا کرو۔ ایک بار میرا رشتہ ہو جائے۔ دیکھنا مانو کا بھی وہیں کرواؤں گی۔“ وہ اترا کر بولی۔ اس کے لہجے میں اپنے آپ سے مطمئن ہو جانے کا تاثر نمایاں تھا۔

”یارا! پہلے اپنا تو طے کروالو۔“ سارا نے سرسری انداز میں کہا تو نیا نے گھور کر اسے دیکھا۔

”تم جیلس ہی ہوتی رہنا۔“

سارا ہکا بکا رہ گئی۔ نیا کہہ کر ہر نکل گئی۔

”یہ تو کچھ زیادہ ہی ہواؤں میں ہے۔“ سارا نے حیرت سے کرن کو دیکھا جو نجانے کس سوچ میں تھی۔

”تم کہاں ہو۔۔۔؟“ اس نے کرن کو ہلایا۔

”سارا! اگر یہ رشتہ طے ہو گیا۔۔۔“

”اچھی بات ہے۔“

”ہماری دفعہ بے جی نے کچھ زیادہ جلدی تو نہیں کر دی۔“ کرن نے جھنجھلا کر کہا۔ سارا نے اسے غور سے دیکھا اور مسکرا دی۔

”یہ تو نصیبوں کی بات ہے۔ لیکن مجھے یقین ہے ایک وقت آئے گا کہ ہم ان کے فیصلے کو سراہ رہے ہوں گے۔“

”پتا نہیں۔“ وہ آہستگی سے کہہ کر ہر نکل گئی۔ جہاں صغریٰ اک مرغی بغل میں دبے خراماں خراماں

چلی آ رہی تھی۔

”اس صغریٰ بی۔ یہ مرغی کہاں سے تھیالی۔“ بے جی نے ناک پر انگلی رکھ کر پوچھا۔ جواباً صغریٰ نے مرغی بچھی۔ خود تخت پر افسردہ دولہا کی صورت بنا کر بیٹھ گئی۔ مرغی کے پاؤں بندھے تھے نیچے گری پر پھڑپھڑانے اور کٹ کٹ کٹا کر کے سارا صحن سر پر اٹھالیا۔

”تم نے کیوں سوکھے کر لیے جیسا منہ بنا رکھا ہے۔“ مرغی گھسٹی ہوئی تخت کے نیچے گھس گئی تو بے جی نے پوچھا۔ صغریٰ نے بے حد چڑ کر جواب دیا۔

”یہ مرغی نہیں۔ نمبرداروں کی وہ ”میج“ ہے جو شادی ہوتے ہوتے مرغی بن گئی۔“
”ہیں۔“ مارے تجسس کے کرن تخت کے نیچے گھس گئی۔ مگر وہ یقیناً مرغی ہی تھی۔ جبکہ صغریٰ انہیں نمبرداروں کا قصہ سنانے لگی۔ جنہوں نے وعدہ کیا تھا کہ اگر ان کے بیٹے کا رشتہ کروادے تو اسے بھیجیں دے گا۔

”ایسی معمولی شکل کا لڑکا ہاتھی کا ہاتھی، کیسی خوب صورت پڑھی لکھی لڑکی ڈھونڈ کر دی۔ آج ان کا وعدہ یاد دلایا تو مرغی تھادی کہ اس منگائی کے دور میں مرغی کا شور بہ پورا اور دعائیں دو۔“
”جوڑو بڑا اچھا ملایا تھا۔ لڑکی کی آہ لگی ہے۔“ کرن بڑبڑاتی۔

”اچھا مبر کرو۔ کچھ لوگ ہوتے ہی تھوڑل کے ہیں۔ حق داروں کا حق رکھنا سخت گناہ ہے۔ پر لوگ نہیں سمجھتے۔ یہ تم مرغی کا ایک سرے کرتی رہو گی۔ جاؤ جا کر شرموت بنا لاؤ۔“

”انہوں نے نیچے جھکی کرن کی کمر پر دھپ رسید کی۔ وہ بلبلاتی ہوئی کچن میں جا گھسی۔
دن سارا انتظار میں گزر گیا۔ مہمانوں کو نہیں آنا تھا نہ آئے نیا کرے میں جا گھسی۔ عالیہ کھیانی سی ہو کر پھر رہی تھیں۔ انہیں ناہید پر سخت غصہ تھا۔ آخر صغریٰ کی مدد لینا پڑی۔ اسے پورا پتا سمجھا کر بھیجا۔ وہ ڈیڑھ گھنٹے کے بعد ہانپتی کانپتی لوٹی۔

”یہ تو سارا پتائی غلط ہے۔“

”لوہ۔ کر گئی ہاتھ فردوس کی لڑکی۔ ارے کتنے ٹھگ گئی اور وہ گٹھڑ میں کیا کیا تھا۔“ بے جی سر پر ہاتھ مار کر رہ گئیں۔

”فردوس کی لڑکی ناہید ہے؟ وہ کہاں سے مل گئی۔ ایک نمبر کی ٹھگ عورت ہے۔ ہٹا کٹا خاوند، مشنڈے لڑکے، میاں کیا کرنے آئی تھی؟ صغریٰ نے ایک سانس میں معلومات دینے کے ساتھ ساتھ سوال کیا۔

”ہماری بہو رانی سے پوچھو۔“ بے جی نے طنزاً کہا۔ بہو رانی اس کے سوا کیا کر سکتی تھیں کہ اپنی شرمندگی چھپانے کو کمرے میں جا گھیں۔ ابھی تو جبار صاحب کی باتیں بھی سننا تھیں اور نیا کالس نہ چلتا تھا کہ کبھی کمرے سے باہر نہ نکلے۔



یہ وہ موسم تھا جب دن سلگتے اور راتیں ٹھنڈی ہو جاتیں۔ یونہی سلگتے دنوں میں کالی گھٹائیں اٹھتیں اور

زمین کے جلتے جلتے سینے پر چھاجوں چھاج برس جاتیں۔ ندی نالے منہ زور ہو چلے تھے۔ تریوز اور خربوزے کے کھیت اجڑ چڑ گئے تھے۔ کسان گندم کی کٹائی کے بعد کپاس کی بوائی سے فارغ ہو چکے تھے۔ کہیں کہیں دھان کی فصل بوئی جا رہی تھی۔ آم کے درختوں میں چھپی کوئل اک تو اترے کو کتی جاتی۔ اب وقت بدل رہا تھا۔ سندھ ناریاں باغوں میں جھولے ڈال کر سادان کے گھٹ نہیں گاتی تھیں۔ مگر وہ دونوں آج بھی آم کے عمر سیدہ درخت کی تنیدہ کمر پر سوار چھپ چھپ پانی میں پاؤں مارتی باتوں میں مگن تھیں۔ کوئی دیکھنے والا نہ تھا کہ ان کنوارے گندمی رنگت والے پیروں سے پانی میں کیسے رنگ پھوٹتے تھے۔ لمبی لمبی گھاس کناروں سے جھکتی اور ان بھیکے پیروں کو چوم لیتی۔

”تم نے بہت اچھا کیا۔ جو پڑھنے کا فیصلہ کر لیا۔“ فاطمہ نے کہا۔

”یہ سب باجی صدف کی وجہ سے ہوا ہے۔ انہوں نے بہت زور دیا۔ میں کیا بتاؤں فاطمہ! وہ کتنی پیاری ہیں۔ اتنی پر اعتماد۔ مجال ہے کہ کوئی ان پر اپنی مرضی مسلط کر سکے۔ کتنے مزے اور آرام سے انہوں نے ان سارے رشتوں سے انکار کیا۔ جو انہیں پسند نہیں تھے۔“

”بس تم اسی وجہ سے ان سے متاثر ہو گئیں۔“ فاطمہ نے اپنے ماتھے پر ہاتھ مارا۔

”جی نہیں۔ ان میں اور بھی بہت خوبیاں ہیں۔“ مسرت نے کھسیانی ہو کر کہا۔

اچھا یہ بتاؤ۔ شہر والے کیسے لگے۔ اپنے خوابوں جیسے؟“

”نہیں۔ خوابوں اور بیوی ڈراموں جیسے تو نہیں لیکن اچھے لگے۔“ اس نے سوچتے ہوئے جواب دیا۔

”کوئی ہیرو ملا؟“ فاطمہ نے کندھے سے کندھا ٹکرایا۔

”ہیرو تو نہیں لیکن لڑکے اچھے ہیں۔“ اسے عدیل کی شرارتی آنکھیں یاد آئیں۔

”اوہ۔ لیکن خیال سے شفیق کو پتا چلا تو کھلا دبا دے گا۔“

”خواہ مخواہ وہ کیا میرا ماما لگتا ہے۔“ مسرت نے تنک کر کہا۔

”ماما تو نہیں۔ کچھ اور ضرور لگتا ہے۔“ فاطمہ ہنسی۔

”دیکھ فاطمہ! اگر مجھے اس حوالے سے تنک کیا تو بہت برا ہو گا۔“ اس نے دھمکی دی۔

”اچھا چھوڑو۔ یہ بتاؤ کہ مسیحی کون کون سے لوگ۔ تیاری کیسی کرنی ہے۔؟“

دونوں یہی باتیں ڈمکس کرنے لگیں۔ ہلکی ہلکی ہوا چل رہی تھی۔ کبھی کبھی کوئی پکا ہوا آم ٹپ سے پانی میں گر جاتا۔ وہ فاطمہ کو سب کے بارے میں تفصیل سے بتا رہی تھی جب نگاہیں سامنے اٹھیں۔ وہ ہڑبڑا کر چھلانگ لگا کر اترتی۔

”فاطمہ! میں جا رہی ہوں۔“

”اے! کیا آندھی آ رہی ہے۔؟“

”یہی سمجھ لو۔“ وہ فوراً ہی مخالف سمت بھاگ لی۔ تب ہی فاطمہ کو کھیتوں کے درمیان سے اس طرف

آتا شفیق نظر آیا تو مسکرا کر خود بھی اتر آئی۔ شفیق قریب آگیا۔

”کیسی ہو فاطمہ؟“ اکیلی بیٹھی ہو؟“ کھل کھر کے کٹن کے کرتا شلوار میں ملبوس شاید ابھی نما کر آیا

تھا کہ بال اب بھی گیلے تھے۔

”بھائی شفیق! تم نے دیکھ تو لیا ہے۔ وہ تمہیں دیکھ کر بھاگ گئی۔“ فاطمہ نے اپنا دپٹہ درست کیا۔

”ہا۔۔۔ ہا۔۔۔ اتنا ڈرتی ہے۔“ اس نے مونچھیں سنواریں۔

”تو کم ڈراؤ۔ پہلے بھی تم سے ڈر کر شہر بھاگ گئی تھی۔“ فاطمہ مسکرائی۔

”مجھ سے بھاگ کر کہاں جائے گی۔“ شفیق زیر لب بڑبڑایا۔ پھر پوچھنے لگا۔

”کیا کہہ رہی تھی۔۔۔؟“

”کچھ خاص نہیں۔“

”وہ شہر والا خناس دماغ سے نکلا یا نہیں؟“

”نکل جائے گا بھائی۔ تمہیں کس بات کی جلدی ہے۔“ شفیق نے غور سے فاطمہ کو دیکھا۔

”تم اس کی اکلوتی سہیلی ہو فاطمہ! کوئی اور بات تو نہیں۔۔۔؟“

فاطمہ نے قدرے ناراضی سے اسے دیکھا اور صاف گوئی سے بولی۔

”بھائی! اگر تمہیں کوئی شک ہے تو رہنے دو۔ شک رشتوں کی ساری خوبصورتی گناتتا ہے۔ وہ ابھی نا

سمجھ ہے۔ نادان ہے۔ یہاں کی پابندیوں سے گھبرا کر شر کو راہ فرار سمجھتی ہے۔ لیکن اتنی بھی کم عقل

نہیں۔ وہاں کے مسئلے مسائل دیکھے گی تب ہی اپنی زمین کی قدر ہوگی۔ انتظار کر سکتے ہو تو ٹھیک ہے۔“

فاطمہ کے ٹھوس لہجے کو شفیق نے ستانی انداز میں سنا اور مسکرا دیا۔

”تم تو بچ بچ استانی بن گئی ہو۔ تھوڑا سبق اپنی سہیلی کو بھی پڑھا دو۔“

”تم فکر نہ کرو بھائی۔ سبق وہ کوئی بھی پڑھے۔ نتیجہ تمہارے حق میں ہی ہوگا۔“



”اچھا تو تمہیں پڑھنا ہے۔“ سر تپا جائزہ لیا گیا۔ سینے سے کتاب لگاؤ۔ وہ اپنی جگہ کسمسا کر رہ گئی۔

”گھر بھرا ہے لڑکیوں سے اور پڑھنے کے لیے بھیج دیا ان مسئلوں کے پاس۔ آخر بے جی کو ہوا کیا۔۔۔؟

حالانکہ بے جی نے کہا تھا وہ انوکھے ساتھ مل کر اسرار سے پڑھ لے سائیں وقت پر دعا دے گئی۔ وہ پڑھنے

کے شوق میں خود ہی چلی آئی۔ کیا معلوم تھا کہ یہاں عدیل اور عمیر بھی موجود ہیں۔

”اچھا ایسا کرو۔ فرق تمہیں آم پڑے ہیں۔ دو بلکہ تین ٹکڑے قسم کے آم نکال لاؤ۔ وہ کیا ہے کہ بھوکے

پیٹ پڑھایا نہیں جائے گا۔“ عدیل نے بے چاری سی شکل بنا کر کہا۔

”جی اچھا۔“ وہ مڑی۔

”کتاب چھوڑ جاؤ۔ میں تب تک جائزہ لے لوں۔“

”فہرہ! تم سے پڑھنا کس نے ہے۔؟“ وہ کڑھتی ہوئی فرق سے آم نکال لائی۔ ساتھ میں چھری اور اک

بڑی پلیٹ بھی تھی۔

”جیو بہنا۔“ عمیر نے فوراً ”آم قابو میں کیے۔“

”یار! اب تم لوگ جاؤ۔“ یا سر نے ملتی انداز میں کہا۔
 ”یوں تم ہم سے زیادہ ماسٹر ہو۔“ عدیل نے گھور کر دیکھا۔ پھر مسرت کی طرف متوجہ ہوا۔
 ”بیٹھو۔“

”میں پھر پڑھ لوں گی۔“ وہ منمنائی۔
 ”ابھی نہیں تو کبھی نہیں۔ بیٹھ جاؤ۔“ اس نے گھر کر کہا۔ وہ گھبرا کر صوفے کے کنارے ٹک گئی۔
 ”A. B. C. آتی ہے؟“

”جی۔“ مسرت نے حیرت سے اسے دیکھا۔
 ”یہ جواب تھا یا استفسار؟“ عدیل نے ساتھیوں سے پوچھا۔ یا سر نے دانت پیسے جبکہ آم کاٹنے
 عمیر نے کندھے اچکائے۔

”آخر اتنے عرصے سے پڑھائی چھوڑ رکھی ہے۔ بھول بھی سکتی ہے۔“
 ”آتی ہے۔“
 ”لکھ کر دکھاؤ۔“

مسرت کو غصہ تو بہت آیا۔ مگر جلدی جلدی لکھ کر سامنے رکھ دیا۔
 ”واہ تمہاری لکھائی تو زبردست ہے۔“ عدیل نے بے اختیار سراہا۔
 ”Tenses آتے ہیں۔“

”آتے تو تھے۔“ مسرت کچھ تذبذب سے بولی۔
 ”ہناؤ یہ کون سا Tense ہے۔“ مجھے تم سے محبت ہے۔“
 مسرت ہکا بکا رہ گئی۔ ہتھیلیوں میں پسینہ اتر آیا۔
 ”بھائی! تم تو ڈائریکٹ ان ڈائریکٹ سکھانے لگے۔ ان ڈائریکٹ چھوڑ کر ڈائریکٹ ڈارنگ بے جی کو پتا
 چلا تو ہمیں سمجھ ہو جاؤ گے۔“ عمیر نے قہقہہ لگایا۔
 ”تم دونوں یہاں سے دفع ہو جاؤ۔ میں مزید تمہاری شرارتوں کا حصہ دار نہیں بن سکتا۔ میری ریپوٹیشن
 کا معاملہ ہے۔“

یا سر نے دانت پیس کر کہا۔ اس سے قبل ہی مسرت واک آؤٹ کر گئی۔ کس ذوق و شوق سے یہاں
 پرچوں کی تیاری کے لیے آئی تھی۔ سارا گھرداری میں مصروف نایاب اور کرن ٹوگوا خود بھی مرکب کر
 پاس ہوتی رہی تھیں، کچھ آتا جانا ہی نہ تھا۔ مرمم اور فائزہ کو کالج سے فرصت نہیں۔ باقی رہ گئیں لیکچرار
 صاحبہ۔ یوں فر فر انگریزی بولتیں کہ سر سے دوفٹ اوپر سے گزرتی۔ وہ ہونفوں کی طرح ان کا چہرہ دیکھتی
 رہتی۔

”اس سے تو اچھا تھا۔ فاطمہ سے پوچھ تاچھ کر تیاری کر لیتی۔“
 ”سب کے سب چنورے۔ بے دید۔ اپنا اپنا حصہ کھا کر بھی چین نہیں۔ نواز اور جبار کے لیے فریج
 میں آم رکھوائے تھے۔ اب پوچھتی ہوں تو ایک بھی نہیں۔ سب کے سب چٹ کر گئے۔ پیٹ ہے یا

کنوئیں۔ ”بے جی مسلسل بزدلاری تھیں۔ وہ کان پلٹ کر چپکے سے اوپر چلی آئی۔
 بجلی بند تھی۔ سب اپنے کمروں کے دروازے کھولے۔ ہاتھ کی پنکھیاں گھماتی بجلی والوں کو کوس رہی
 تھیں۔ نیا نے اپنے گھونسلہ بالوں کو عین چوٹی پر جوڑا بنا کر سمیٹا تھا۔ کرن اور مریم دوپٹے اتارے۔ قیصر
 کے بازو اوپر تک چڑھائے۔ ”جان نکل رہی ہے“ کی تکرار کر رہی تھیں۔ مانو کیونکہ انھی ابھی نما کر آئی
 تھی۔ اس لیے قدرے سکون میں تھی۔

”آپ لوگ بھی نہالو۔“ غلطی سے مانو نے مشورہ دیا۔
 ”ساراپانی تو تم نے ختم کر دیا۔ گویا مانو نہیں بھینسیں نمائی ہوں۔ پوری ٹنگی خالی ہو گئی۔“ نایاب اس پر
 چڑھ دوڑی۔

”مونو۔ گاؤں میں بھی بجلی بند ہوتی ہے۔“ مریم نے بے زاری سے پوچھا۔
 ”نہیں اس کا گاؤں کسی اور سیارے پر واقع ہے۔“ نیا سچ انکارے چباری تھی۔
 ”وہاں تو بجلی آتی ہی نہیں لیکن گاؤں کی شامیں کھلے صحنوں کی وجہ سے ٹھنڈی اور خوشگوار ہوتی
 ہیں۔“ مسرت نے بتایا۔ اسے سچ اپنے آنگن میں پھیلا بکائن کا درخت اور نیچے چھٹی چارپائی بہت یاد
 آ رہی تھی۔

”اب اس سات مرے کے گھر میں کھلے صحن کہاں سے آئیں۔ یہ دو داغ کے صحن۔ رات دن سے
 بھی زیادہ عذاب میں گزارتی ہے۔“ کرن بے حد بے زاری سے بولی۔
 ”پتا ہے یا سر رات کو کس جیلے میں سوتا ہے۔“ مریم کو اچانک کچھ یاد آیا۔
 ”بنیان اور دھوتی میں۔“
 ”ارے نہیں۔“

”خدا کی قسم میں نے خود اسے اس حلیمے میں دکھا ہے۔“
 لائٹ بند ہونے پر میں بالکونی میں نکل آئی۔ وہ نیچے صحن میں ٹہل رہا تھا۔ مجھ پر نظر پڑی تو غراپ سے
 اندر۔“

”ویسے گرمی میں یہ حلیمہ آئیڈیل ہے۔“
 ”تم بھی سلوا لو۔“
 ”کیا بنیان یاد دھوتی؟“

”بے فکر رہو۔ دونوں سلی سلائی مل جائیں گی۔“
 ایک دو سرے کے ساتھ ہنسی مذاق میں گرمی کا احساس کافور ہونے لگا۔
 ”تم نہیں ہنس رہیں۔“ مریم نے مسرت کو ٹھوکا دیا۔

”اس میں ہنسنے والی کوئی بات ہی نہیں۔ گاؤں میں یہ لباس عام نظر آتا ہے۔“ اس نے لاپرواہی سے
 جواب دیا۔ مسرت کا قیام یہاں مستقل نہ تھا۔ وہ اکثر تیاری کے سلسلے میں دس پندرہ دن آکر رہ جاتی۔ لیکن

اس کی زیادہ تر تیاری غاطمہ کی مدد سے ہو رہی تھی۔

وہ جاتی سرویوں اور بھری بہار کے دن تھے۔ جب سارا کی شادی کی تاریخ طے ہوئی۔ ارادہ تو دو شادیاں اٹھنے کرنے کا تھا۔ مگر کرن کے سسرال میں کچھ مسئلہ ہونے کی بنا پر کرن کی شادی اگلے سال تک التوا میں پڑ گئی۔ بے جی نے مسرت کو پہلے ہی بلوایا تھا کہ تیاری کے ساتھ ساتھ شادی میں بھی بھرپور انداز میں شریک ہو سکے۔

”ساجد علی! مجھے تیری بیٹی بہت پسند ہے۔ بڑی بھولی اور سعادت مند۔“
 ”کوئی! یہ بات جا کر اماں کو ضرور بتانا۔“ مسرت نے چپکے سے باپ کے کان میں چپکے سے کہا۔
 ”اللہ اس کا نقص کیا کسی بہت ہی اچھی جگہ پر رکھ لے۔“ بے جی اپنی دھن میں کہہ رہی تھیں۔ ”کوئی برادری میں اس کا جوڑ کا نہیں ہے۔ بڑے مسئلے ہیں ساجد علی! خاندانی لوگ تو ملتے ہی نہیں۔ بس کچھڑی پکی ہوئی ہے۔ شرافت، خاندان، گروار، ناپنے کا کوئی پیمانہ ہی نہیں رہا۔ بس پیسہ ہونا چاہیے۔“
 ساجد علی بے جی کو شفیق کے بارے میں بتاتے بتاتے رک گئے۔
 ”بے جی! ابھی پڑھ لے۔“

”پڑھاؤں بھی اچھی چیز ہے۔ پر تاؤں زیادہ پڑھنے سے لڑکیاں بد دماغ بھی ہو جاتی ہیں۔ یہ اپنے۔“
 وہ جبار کی لڑکیاں کہتے کہتے رگ گئیں۔ ان کا ساری زندگی یہی اصول رہا تھا کہ گھر کی بات باہر نہیں لہنی۔ خواہ کتنا ہی قریبی عزیز کیوں نہ ہو۔
 ”اچھا، جو اللہ کی مرضی۔“ انہوں نے مختصر لفظوں میں بات ختم کر دی۔

سانے کھڑی موصوفہ کو دیکھ کر ایک بار تو عمیر کا دل زور سے سٹی بجانے کو چاہا۔ تیز سرخ رنگ کا بے حد فٹنگ والا سوٹ، ہمرنگ اونچی ایڑی والے سینڈل، فل میک اپ، ہاتھ، گلے کانوں میں آرٹیفیشل ہیولری، بغل میں دیا بڑا سا پرس، چھوٹا سا دوپٹہ سر کے گرد لپیٹا تھا۔ آنکھوں پر سیاہ گلاسز۔ ہونٹوں کا کٹاؤ۔
 آپ اسٹک کی مدد سے کچھ زیادہ ہی نمایاں کیا گیا تھا۔
 ”یہ جبار صاحب کا گھر ہے؟“

”جی۔“
 ”مجھے عالیہ بیگم سے ملنا ہے۔“ خاصی پر اعتماد شخصیت تھی۔
 ”اندر آ جائیں۔“ وہ کچھ حیران کچھ پریشان انہیں بے جی کے پاس لے آیا۔
 ”سبحان اللہ۔“ عمیر کے بتانے پر کہ وہ چاچی سے ملنے آئی ہیں۔ بے جی کے منہ سے بے اختیار نکلا۔

”میرا نام رفعت آرا ہے۔“
 ”لگتا تو نہیں۔“ بے جی کے منہ سے نکلا۔ ”بہر حال بیٹھو۔“
 وہ ان کے پاس نزاکت و تکلف سے بیٹھ گئیں۔

”مجھے عالیہ صاحبہ سے ملنا ہے۔ دراصل میں بیچ میکنگ کرتی ہوں۔“ نہ آنکھوں سے گلاسز الگ ہوئے نہ بغل سے پرس۔
 ”تمہاری عمر تو نہیں۔ بہر حال کرکٹ بیچ یا ہاکی۔“
 ”اف۔“

”بے جی۔ رشتے کرواتے ہیں۔“ عمیر ان کے کان میں گھسا۔
 ”اچھا۔ وچولن ہو۔“ بے جی نے زور سے کہا۔ وہ اچھل پڑیں۔
 ”واٹ۔ آپ میری انسلٹ کر رہی ہیں۔“
 ”کیا کر رہی ہوں۔؟“

”بے عرتی۔“ ترجمہ کرنے کے لیے عمیر موجود تھا۔
 ”ارے میں نے کیا اس لال لال پری کو ڈانگ مار دی ہے۔“ بے جی کو تاؤ آ گیا۔ تب ہی بیڑھیوں سے عالیہ افسانہ خیراں اتریں اور لال پری کو لے کر ڈراننگ روم میں چلی گئیں۔ ناصرو بھی مہمان کی آمد کا سن کر آگئیں۔ کہ لڑکیاں تو ساری بازار گئی تھیں۔
 ”وہ کچھ عجیب و غریب سی چیز آئی ہیں۔ پوچھ لو کیا کھاتی پیتی ہے۔“ بے جی نے بے زاری سے کہا۔ عالیہ کو ایسی فیشن ایبل وچولن کسی جاننے والی کے توسط سے ملی تھی۔ سنا تھا خاصے ہائی اسٹینڈرڈ کے رشتے کرواتے تھیں۔ فون پر بات چیت ہوئی۔ عالیہ چپکے سے اس کی ابتدائی پانچ ہزار فیس بھی ادا کر آئی تھیں۔
 ”یہ خاتون کون ہیں۔؟“ ڈراننگ روم کی ٹھنڈی فضا میں بھی انہیں گلاسز اتارنا یاد نہ آیا۔
 ”میری ساس ہیں۔“

”ساس ہی لگتی ہیں۔“ انہوں نے منہ بتایا۔

”چائے پیئیں گی یا ٹھنڈا۔؟“
 ”دو نوں۔“ انہوں نے کمال بے تکلفی سے کہا۔ ”آپ کو پتا ہے۔ میں یوں ہر کسی کے گھر نہیں جاتی۔ مگر آج آپ کا گھر بار اور لڑکی کو دیکھنے آئی ہوں۔ آخر میں نے دوسروں کو بھی کچھ بتانا ہوتا ہے۔“
 ”جی۔“ عالیہ اس فیشن ایبل وچولن سے خاصی متاثر ہوئیں۔ شرمٹ پلایا۔ چائے لوازمات کے ساتھ پیش کی۔

”رشتہ بہت اچھا ہے۔ بلکہ لڑکی پسند آگئی تو وہ کچھ زمین بھی اس کے نام کرنے کو تیار ہیں۔ گاؤں میں بھی گھر ہے۔ شہر میں بھی خاصی بڑی کوٹھی ہے۔ لڑکی شہر میں رہے گی۔ سرال کا کوئی جھنجٹ نہیں۔ لیکن لڑکے کی ایک ہی شرط ہے۔“

”وہ کیا...؟“ عالیہ نے دھڑکتے دل سے پوچھا۔

”ایک توڑکی ملازمت نہ کرتی ہو۔“

”اچھا۔“ عالیہ نے سوچا۔ صدف کا چانس تو گیا کہ وہ کسی صورت جاب چھوڑنے کو تیار نہ تھی۔
”دوسرے شادی فوراً ہوگی۔“

”اس کا تو مسئلہ نہیں۔ بس بات بن جائے۔“

”رفعت آرا نے ہاتھ ڈالا ہے تو بات بن کر رہے گی۔“

”طنزکیاں گھر پر نہ تھیں۔ عالیہ نے نایاب کی تصویریں دے دیں۔ جسے لے کر وہ باہر نکلیں تو بے جی کان
ادھر ہی لگائے بیٹھی تھیں۔“

”اچھا اماں جی۔ اللہ حافظ۔ آپ سے مل کر خوشی ہوئی۔“

”ہاں۔ ہاں مجھے بھی۔ بامشاء اللہ شادی کے اتنے سال بعد بھی فیشن خوب کرتی ہو۔ لگتا ہے کسی اچھے
خوش حال گھرانے میں بیباہی ہو۔“ پتا نہیں بے جی نے طنز کیا تھا یا یونہی کہا۔ وہ منہ لٹکا کر بولیں۔

”ابھی تو میری شادی نہیں ہوئی۔“

”ایس۔۔۔“ بے جی کا منہ کھل گیا۔ ”اے تو چلتے پھرتے کوئی اپنے لیے بھی بڑھونڈلو۔“

”اچھے رشتے ملنے آسان تھوڑی ہیں۔ آپ دعا کیجئے گا۔“

”واہ اللہ کی شان! خود کنواری اور دوسروں کے لیے بڑھونڈتی پھر رہی ہے۔“ اس کے جانے کے بعد
بے جی بڑبڑائیں۔ ”اس کی آنکھوں میں کوئی نقص تھا۔ کالے کھوپے ایک بار بھی نہ آتا رہے۔ اور پرس تو
گویا میخ کے ساتھ بغل میں ٹھوکا تھا۔ تمہیں بھی عالیہ کیسی کیسی چیزیں مل جاتی ہیں۔“

عالیہ جل کر اوپر چڑھ گئیں۔ تب ہی اسرار شکر قدی سے بھری پلیٹ لے آیا۔ جس پر کھانا ڈالا ہوا تھا۔
”بے جی شکر قدی کھائیں۔“

”لو۔ تم پر بھی مانو کا اثر ہو گیا۔“ وہ جویںنے لگی تھیں فوراً ”اٹھ کر بیٹھ گئیں۔“

”میں تو آپ کے لیے لایا تھا۔“

”پھر چکھ لیتی ہوں۔“ وہ معصوم سی شکل بنا کر بولیں۔

”دونوں چمکیں گے۔ میں دو چمچ لے کر آتا ہوں۔“ وہ کچن کی طرف بڑھ گیا۔



اتنی لمبی جیل پن کر کھڑی ہوئی تو دو قدم پر ہی پاؤں رہٹ گیا۔ اس نے بمشکل شیشے کے کیس کا آسرا لے
کر خود کو سنبھالا ساتھ ہی چور نظروں سے ادھر ادھر دیکھا کہ کوئی دیکھ تو نہیں رہا۔ مگر سب اپنی میچنگ
سینڈلوں کی تلاش میں مصروف تھیں۔ لیکن وہ کاؤنٹر بوائے جس نے مسکراہٹ چھپانے کی کوشش بھی
نہ کی تھی۔

”بد تمیز۔“ اس نے پاؤں جوتے کی قید سے آزاد کیا اور ایک طرف ہو کر بیٹھ گئی۔ سب فارغ ہوئیں تو اس کی طرف متوجہ ہوئیں۔

”سونو! تمہیں جوتا پسند نہیں آیا۔“

”اس کی ہیل بہت لمبی ہے۔“ وہ منمنائی۔

”تو کم ہیل والا دیکھ لو۔“

”نہیں چلیں۔ بعد میں لے لوں گی۔“ اسے لڑکے کی نگاہوں سے الجھن ہو رہی تھی۔ اپنی چپل پہن کر کھڑی ہو گئی۔ سب بچے منٹ کر کے باہر نکلیں۔

”باجی۔“ سونو سب سے پیچھے تھی۔ مڑ کر دیکھا تو وہی لڑکا آواز دیتے ہوئے کچھ کہہ رہا تھا۔ اس نے باہر کی طرف دوڑ لگا دی۔ اور سب سے آگے آگے چلنے لگی۔

”کیا ہوا۔ روکو تو۔“

”جلدی چلیں۔ وہ لڑکا پیچھے آ رہا ہے۔“ وہ توہنی کی طرح قہقہے بھر رہی تھی۔

”اے کون سا۔؟“ سب کے قدم رکے مڑیں۔ کرن نے باقاعدہ آستینیں چڑھالیں وہ دکان والا لڑکا بھاگتا آ رہا تھا۔

”باجی! آپ نے اسپید پکٹل۔ یہ جوتے۔“ اس کے ہاتھ میں زنانہ سینڈل تھیں۔

”کس کی ہیں۔؟“ موم نے پوچھا۔

”ان کی۔“ اس نے مسرت کی طرف اشارہ کیا۔

”خواتین! میں نے تو خریدی بھی نہیں۔“ وہ لڑنے مڑنے کو تیار ہو گئی۔

”باجی! میرے جوتے واپس کریں۔“

”تمہارا دماغ ٹھیک ہے۔ تم ہمیں چور سمجھ رہے ہو۔ ابھی بھرے بازار میں وہ جوتے لگاؤں گی کہ سرگنجا ہو جائے گا۔“ کرن کو تو ایسا موقع اللہ دے۔ لوگ مڑ مڑ کر دیکھنے لگے۔ لڑکے نے ہاتھ میں پکڑی سینڈل مسرت کے سامنے پھینکیں۔

”باجی۔ یہ زنانہ سینڈل میرے کسی کام کی نہیں۔ میری نہ بہن ہے نہ محبوبہ۔ آپ میرے چپل اتار دیں۔“

سب سمیت سونو کی نظریں فوراً اپنے پیروں تک گئیں۔ وہ دکان دار کے سیلپر بننے کھڑی تھی۔ اس نے سر اٹھا کر باقی سب کو دیکھنے کی کوشش نہیں کی۔ شرافت سے مروانہ سیلپر اتار کر اپنے پہن لیے۔ سب کی قہقہے کرتی ہنسی کچھ اور شرمندہ کر گئی۔

”سارا ایک عدد رتہ بھی سلوا لو۔“ نیا نے مشورہ دیا۔

”وہ بری میں آجائے گا۔“ اس نے بڑے اطمینان سے جواب دیا۔ تب ہی اک لمبی ترنگی مائی ان کے سروں پر آسوار ہوئی۔

”باجی۔ اللہ کے نام پر دس روپے دے دو۔“
 ”اوہ معاف کرو مائی۔“ مریم نے بے زاری سے ٹالا۔ مگر وہ اس کے بازو سے ہی الٹک گئی۔
 ”جیسی بریوں جیسی تمہاری صورتیں ہیں۔ اللہ ویسا ہی جوڑ بنائے۔ خوب صورت پیسے والا خوند دے۔
 بوٹے بھر بھر گھر سے نکلو۔“

سب ہی نے سرعت سے اپنے اپنے پرس کھول کر دس روپے عنایت کیے۔
 ”باجی! میں نے پائل بھی لینی ہے۔“ مسرت نے سارے ارمان اسی شادی پر نکالنے تھے۔
 ”ہاں مہندی پر سب پانزیب پہنیں گے۔“ نینا نے فوراً ”تائید کی۔ ڈھیر ساری شاپنگ کے بعد آئس کریم
 اور برگر کھائے۔ مسرت نے تو دہی بھلے بھی لیے۔ یوں بازار میں کھانے کا پہلا موقعہ تھا۔ اسے تو لگ رہا
 تھا۔ ہر کوئی اسی کو دیکھ رہا ہے۔
 گھر جا کر نیا کورفت آرا کی آمد کا پتا چلا۔

”اوہ۔ کیا تھا جو میں آج بازار نہ جاتی۔“ اسے افسوس ہوا۔
 ”فکر نہ کرو۔ تصویر دے دی ہے۔ کہہ رہی تھی۔ ایک دو دنوں میں مہمان کو لے کر آؤں گی۔ شادی کی
 ان لوگوں کو بھی جلدی ہے۔ میرا بس چتا تو سارا کے ساتھ تمہاری شادی کر کے سب کی زبانیں بند
 کر دیتی۔ خیر اب بھی بات بن جائے تو ہے۔ کہتے ہیں لڑکی کے نام زمین بھی کریں گے۔ جل بھنے گی تمہاری،
 تائی۔ ایسے ہی ٹپ ٹپ پونجیوں میں بیٹیاں پیا ہے جاری ہے۔“
 ”امی! پیٹھ سے نہ ہوں۔“ نینا نے خدشہ ظاہر کیا۔

”ساری عمر کے شرمیں رہے ہیں۔ اللہ کرے انہیں تم پسند آجاؤ۔ ایک تو صدف نے پریشان کر رکھا
 ہے۔ کسی رشتے پر مانتی ہی نہیں۔ اب کہتی ہے کوئی بی ایچ ڈی ملا تو ہی کروں گی۔“ نینا سے وہ دل کی ساری
 باتیں کہتی تھیں۔



”خچ لے۔ خچ لے میرے یا تو خچ لے۔“

”ایسا بازار سا گانا۔ دفع کرو۔“

فورا ”ڈیک بند ہوا۔ دوسرا گانا لگایا۔“

مہندی سے لکھ دو رہی ہاتھوں پہ مسکھو۔

”یہ ٹھیک ہے۔“

”خواتوا۔“

مشکل سے گانا سلکٹ ہوا تو اسٹیپس پر جھگڑا۔

”گیند کی طرح مڑھکتی ہو۔ کسی اسٹیپ کو فالو تو کرو۔“ کرن جھنجلائی۔

”ہاں تم تو شیماکمانی کی شاگرد رہ چکی ہو۔“ میا کو غصہ آگیا۔
 ”پھر بھی کوئی ارہم۔ تھوڑی نزاکت۔ تمہارا ڈانس دیکھ کر تو لگتا ہے بطن دھپ دھپ چل رہی ہے۔“

”دفع ہو۔ میں نہیں کر رہی۔ آئی کہیں سے مادھوری ڈکشت۔“
 نیابالکل ہی واک آؤٹ کر گئی۔ منہ پھلا کر ایک طرف بیٹھ گئی۔ جہاں مریم مشین رکھے نیابی کرتی ٹھیک کر رہی تھی۔ اس کے ارد گرد رنگ برنگے کپڑوں کا انبار تھا۔ کسی پر کرن لگنے والی تھی۔ کسی کی سلائی ٹھیک کرنے والی تھی۔ سارا کے جینز کے کپڑے ٹانگ کر سنبھالنے کا کام بھی جاری تھا۔

”سونو! تمہیں ڈانس آتا ہے؟“ نیابا کو خاطر میں نہ لاتے ہوئے کرن نے تپائی کرتی مسرت کو پکارا تو وہ بوکھلا گئی۔

”جی، تھوڑا بہت۔“
 ”بس پھر کھڑی ہو جاؤ۔ تمہاری ہانٹ بھی میرے ساتھ سوٹ کرے گی۔“ اس نے براہ راست نیابرا حملہ کیا۔ وہ تلملا گئی۔ کوئی ٹھکڑا جواب دینے ہی والی تھی کہ مریم نے اسے کرتی تھما دی۔
 ”لو۔ اب فننگ چیک کرو۔“

مسرت نے قمیص مانو کے سپرد کی کہ تپائی وہ کروے۔ خود کرن کے ساتھ جا کر کھڑی ہو گئی۔ اپنی صلاحیتیں دکھانے کا موقعہ جو مل رہا تھا۔ انوانا ڈی پن سے تپائی کرنے لگی۔
 ”آہ۔ مر گئی۔ پھنس گئی۔“ پردے کے پیچھے سے شورا اٹھا۔
 ”کیا ہوا۔؟“

”میری کرتی۔ ہائے میرا سانس۔“
 ”سب پردے کے پیچھے لپکیں۔ جہاں نیابا کرتی پھنسائے ہانپ رہی تھی۔ نہ اوپر نہ نیچے کھینچ کھاچ کر کرتی نیچے کی توبازو ہوا میں معلق تھے۔“

”میں مر گئی۔ احمق۔ اسے پہنانے کے بجائے اتار دیتیں۔“ وہ پردے کے پیچھے سے نکل آئی۔ کمرے میں موجود نفوس کی آنکھیں ابل ابل آئیں۔ شلووار پر کرتی پہنے دونوں بازو لہراتی کوئی عجیب و غریب مخلوق تھی۔
 ”اب اتاریں گے کیسے۔؟“ مریم نے تشویش سے اسے دیکھا۔
 ”یہ فننگ تھی یا میرا گلا گھونٹنے کا انتظام۔“

”یہ صائمہ کی کرتی تھی۔ میں کترینہ کیف کی سمجھ بیٹھی۔“
 اسی آدھ بکا میں کب وہ تین عدد خواتین ان کے سر پر اکھڑی ہوئیں۔ انہیں خبری نہ ہوئی۔
 ”السلام علیکم۔“

سب کی سب ایک بل کو ساکت ہوئیں۔

”آپ جلد ہی ہمارے گھر آئیے گا۔ ہمارے بھائی کی ویران زندگی میں نیا جیسی چلبلی لڑکی ہی ہمارا لاسکتی ہے۔“

ان کے جانے کے بعد نیانے خوب ہی لڑکیاں ڈالیں۔

”دیکھا ہمارے حسن کا شکار۔“



سارا کی شادی سادگی اور سہولت کے ساتھ منٹ گئی۔ نہ بارات میں زیادہ لوگ تھے۔ نہ جینز کا کوئی مطالبہ تھا۔ مندی کا بھی کوئی کھڑاک نہ تھا۔ لڑکیوں نے گھر میں ہی رسم کر لی۔ گاؤں سے ساجد علی اور جنت بی بی آئے۔ لیہ سے آسیہ پھوپھو اپنی بیماری کی وجہ سے نہ آ سکیں۔ اسرار تو پہلے ہی یہاں تھا۔ جنت تو مسرت کو دیکھ دیکھ کر ہولتی رہیں۔ اتنی ساری لڑکیوں میں بھی کتنی پیاری اور نمایاں لگ رہی تھی۔ جب مندی پر اس نے کرن کے ساتھ ڈانس کیا تو ان کی آنکھیں ابل پڑیں۔ جی تو چاہتا تھا ڈنڈالے کر دیں اس کی ٹانگیں تو ڈویں۔ سب کے سامنے باتیں سنائیں۔ نجانے کیسے ضبط کیا۔

بری میں بھی زیادہ شوشانہ تھی۔ مناسب سی بری تھی۔ عالیہ نے سو سو نقص نکالے۔ توصیف البتہ سب کو بے حد پسند آیا۔ ذہین آنکھوں والا خوش مزاج سادہ سادہ جوان تھا۔ چھوٹی سی داڑھی اس کے چہرے پر جمی رہی تھی۔

لوگوں نے اپنے اپنے ذہن کے مطابق باتیں کیں اور سارہ بیاہ کر اپنے چھوٹے سے گھر میں چلی گئی۔ شادی میں صدف کا خوب صورت پروقار انداز بہت سے لوگوں کو متوجہ کر گیا۔ مگر کوئی بھی صدف کے معیار پر پورا نہ اترتا۔ نایاب کو لوگ پسند کر گئے تھے۔ اس لیے عالیہ خاصی ہواؤں میں تھیں۔ ولیمہ اور چوٹھی کی دعوتوں کے بعد سارا اپنی سسرال کی دعوتوں میں مصروف ہوئی تو انہوں نے فوراً ”لڑکے والوں کے ہاں جانے کی ٹھان لی۔ مسرت کے پرچے سر پر تھے سو وہ گاؤں واپس نہیں گئی۔ یوں بھی اماں اور ابو جی سے تو مل ہی لی تھی۔ جنت اسے اس یقین کہ ساتھ کہ وہ کسی ایک پر بھی عمل نہ کرے گی، ڈھیروں نصیحتیں دے کر رخصت ہوئیں۔

یہی وہ وقت تھا جو مسرت کے خیالات میں تبدیلی کا پیش خیمہ بنا۔



”وہ لوگ ہمیں اطلاع دے کر آئے تھے؟ ہم بھی بغیر اطلاع کے جائیں گے۔“ یہ عالیہ کا فیصلہ تھا۔

”جو لڑکا گھر پر نہ ہوا تو؟“ بے جی نے اعتراض کیا۔

”نہوں کر کے بلوا لیں گے۔ اگر نہ ہوا تو ہم گھر بار تو دیکھ ہی لیں گے۔ اسی لیے تو آپ کے بیٹے کو ساتھ نہیں لے جا رہی۔ لڑکا پسند آ گیا تو بعد میں مود پکر لگائیں گے۔“

عالیہ سب کچھ خود ہی طے کر بیٹھی تھیں۔ گویا کسی اور کے مشورے کی ضرورت ہی نہیں۔ بے جی کو ان کی یہی باتیں بری لگتی تھیں لیکن انہوں نے بھی تہیہ کر لیا تھا کہ اس معاملے میں کچھ نہیں بولیں گی۔ عالیہ کو بے فکری یوں تھی کہ لڑکی تو پسند کی جا چکی تھی۔ عدیل انہیں لے کر جا رہا تھا۔

چھوٹا گھٹ کھلا تھا۔ وہ آرام سے اندر چلے گئے۔
”گھر تو اچھا ہے۔“ بے جی نے سناٹی نظروں سے سامنے پھیلی کوٹھی کو دیکھا۔ تو عالیہ کی گردن کچھ اور اڑ گئی۔ سارا کے تین چار کمروں والے گھر کے مقابلے میں تو یہ محل ہی تھا۔

”یہ کون ہیں۔“ عدیل کے متوجہ کرنے پر سب کی نگاہیں کوٹھی اور خوب صورت لان سے بھٹک کر ایک کونے میں گئیں۔ جمال گھاس پر کوئی پچاس پچپن سالہ فحش تہہ اور دھوٹی میں ملبوس کسرت کر رہا تھا۔

”چوکیدار ہو گا۔“ ناصرو نے خیال آرائی کی۔ بے جی نے تھکمانہ انداز میں پکارا۔

”چوکیدار! ادھر آؤ۔“

چوکیدار نے حیرت سے سر اٹھا کر آنے والوں کو دیکھا۔ پھر یونہی حیران سی صورت بنائے قریب آگیا۔

اس کی توندنیاں بھاڑ کر باہر آنے کو بے تاب تھی۔ عدیل کو بچپن میں سنی نظم یاد آگئی۔

”بابو جی کی توند تو دیکھو۔ جیسے تیل کا مٹکا کوئی۔“

”نہ تمہیں شرم نہیں آتی۔ گھر والے سب کچھ تم پر چھوڑ چھاڑے فکر ہو کر بیٹھے ہیں اور تم ہو کہ گھٹ کھلا چھوڑ کر بیٹھیں نکال رہے ہو۔ کوئی چور ڈاکو کھس آئے اور لوٹ کر چلتا بنے۔ ایسے بے بدید اور بد لحاظ ہیں آج کل کے نوکر۔ ہزاروں ڈکار جائیں گے اور وفاداری نام کو نہیں۔“

”آپ لوگ ہیں کون۔؟“ مارے غصے کے موصوف کے تھنے پھڑپھڑانے لگے۔

”اے۔۔۔ رفعت آرا نے بھیجا ہے۔ لڑکا دیکھنے آئے ہیں۔“ بے جی نے ہاتھ نچا کر کہا۔

چوکیدار کے چہرے کا رنگ پھیکا پڑ گیا۔ اس نے مڑ کر جلدی سے آواز لگائی۔

”فیضی۔ فیضی۔!“

اندر سے اک ملازم لڑکا بھاگتا ہوا آیا۔

”مہمانوں کو اندر لے جاؤ۔“ چوکیدار نے پینہ صاف کرتے ہوئے مرے مرے لہجے میں کہا۔

”اندر جا کر تمہاری شکایت لگاؤں گی۔“ بے جی نے مزید دھمکی دی۔

”بے جی! چھوڑیں ہمیں کیا۔ یہ ان کے گھر کا معاملہ ہے۔ نکما چوکیدار رکھیں یا سیانا۔“

ناصر نے عالیہ کی تیوری چڑھی دیکھ کر ہلکی آواز میں سمجھایا۔ بے جی سمجھی تھیں یا نہیں اثبات میں سر ضرور ہلادیا۔ اندر وہی تین خواتین تھیں۔ جن میں دو لڑکے کی بھابھیاں اور ایک بیٹی تھی۔ کچھ اور لوگ بھی تھے جن کا تعارف بعد میں کرایا۔ جن میں دو بہنیں اور باقی بیٹی جو غیور تھ۔ پہلے تو وہ انہیں دیکھ کر بوکھلا ہی گئے۔

”آپ۔ آپ نے بتایا ہی نہیں۔“

”ہم لوگ یہاں کسی سے ملنے آئے تھے۔ یاد آیا قریب ہی تو آپ کا گھر ہے۔“ ناصرو نے سہاؤ سے بات کی۔ ایک دم بھگدڑی مچ گئی۔ ایک پاس آکر بیٹھتا تو دوسرا اٹھ کر بھاگ جاتا۔ تھوڑی دیر کے بعد کولڈ ڈرنکس آگئیں۔

”بد سلیقہ لگتی ہیں۔ اچانک آنے والے دو مہمان نہیں سنبھالے جا رہے۔“ بے جی نے سرگوشی کی۔ باضابطہ گفتگو کا آغاز ہوا تو وہ چوکیدار معقول چلے میں بنا ٹھنڈا آکر بیٹھ گیا۔ بے جی کا منہ کھل گیا۔ اس سے قبل کہ وہ پوچھ لیتیں۔ عالیہ نے ٹھوکا دیا۔

”چپ کر جائیں رشتے دار ہوگا۔“

”تب ہی پر تکلف سی چائے آگئی ڈھیروں لوازمات کے ساتھ۔“

”آپ سب یہیں رہتے ہیں؟“

”یہ کوٹھی تو ہمارے دیور کے نام ہے۔ چھٹیوں میں بچوں کے ساتھ ہم بھی آجاتے ہیں۔“

”بھائی ہمارا اکیلا ہے ساری زندگی بہت کمایا۔ لاکھوں کا مالک ہے۔ بس اسی کمائی کے چکر میں شادی نہ کی۔“ اس کے بڑے بھائی بتا رہے تھے۔

”بہت مذمہ دار اور شریف انسان ہے۔ اس گھر میں جو بھی آئے گی خوش نصیب ہی ہوگی۔“

”چا چا جی! آپ کیا کرتے ہیں۔“ عدیل نے چپ بیٹھے شخص سے پوچھا۔ جسے وہ چوکیدار سمجھے تھے۔ اس نے بے چینی سے پہلو بدلا۔

”مختلف برنس ہیں کچھ زمینیں ہیں۔“

”بس جی۔ سب کچھ لڑکی کا ہی ہے۔ سارے بھائی الگ الگ کما کھا رہے ہیں۔ کوئی کسی پر بوجھ نہیں۔ یہ تو چھوٹے بھائی کے اکلا پے کی وجہ سے ہم آجاتے ہیں۔“

”چا چا جی! آپ بھی کچھ لیں۔“ عدیل نے بھری ٹرائی کی طرف اشارہ کیا۔

سب کھاپی رہے تھے۔ وہ بچارہ خالی چائے لیے بیٹھا تھا۔ اب کے سب نے چونک کر عدیل کو دیکھا۔ بے جی کپکپ کر خاندان برادری کے بارے میں پوچھتی رہیں۔ چائے کی ٹرائی خالی ہو کر واپس چلی گئی۔ ان سے زیادہ گھروالوں نے کھایا۔

”ٹوکڑ کا غالباً گھر پر نہیں ہے۔ ہو سکے تو فون کر کے بلوالیں۔“

بہت دیر کے بعد بھی لڑکے کی رونمائی نہ ہوئی تو عالیہ نے کہا۔ وسیع ڈرائنگ روم میں ایک دم خاموشی چھا گئی۔

پھر لڑکوں کی طرف سے ہلکی ہلکی جھنجھناہٹ اور دبلی دبلی ہنسی ابھری۔ پھر مروں میں سے ایک نے کھنکار کر کہا۔

”یہ میرے چھوٹے بھائی ہیں۔ ان ہی کے رشتے کی بات کر رہے تھے۔“

”کیا۔؟“ وہ سب اپنی اپنی جگہ اچھل پڑے۔ چوکیدار ہونق سا ہو کر انہیں دیکھ رہا تھا۔

”پھر کتنی ہیں“ بے جی سٹھیا گئی ہیں۔ اسی لیے کہتی ہوں۔ تھوڑی تحقیق، تھوڑی پوچھ پڑتال کر لیا کرو۔ ارے لڑکیاں کیا بھیڑ بکریاں ہیں جو ہر آئے گئے کے سامنے کھڑی ہوں۔ ان رشتے کو انے والیوں کا کیا۔ مٹھی بھر میسے چاہئیں۔ اوٹ پٹانگ رشتے دکھائیں گی۔ کسی کے دل پر کیا گزرتی ہے انہیں کیا؟ سب کچھ بتا دیا۔ بس اک یہی نہ بتایا کہ لڑکا باپ کی عمر کا ہے۔“

سب مارے جوش کے لڑکے کے بارے میں تفصیل سننے اکٹھی ہوئی تھیں۔ بے جی نے گھر آکر عالیہ کے خوب ہی لتے لیے۔

”اب مجھے کیا خبر تھی۔“

”تو خبر کھنی تھی۔ لڑکی کی تصویر دے دی۔ لڑکے کی نہیں منگوانی تھی؟ عالیہ! یہ تیری سگی بیٹیاں ہیں۔ ان کے جذبات سے اس طرح مت کھیل۔“

مرست نے نایاب کا تار یک پڑتا چہرہ دکھا۔ وہ تیزی سے اٹھ کر اوپر چلی گئی تھی۔
”تو تو خوش نصیب ہے جو گھر بیٹھے اتنا اچھا رشتہ مل گیا۔“ منجائے کیوں اسے اماں کی بات یاد آگئی تھی۔

”کیسے دودھ دی کی فراوانی ہوا کرتی تھی۔ آنے والے مسمانوں کو بھی بھر بھر جگ ٹھنڈے دودھ کے پلائے جاتے۔ یہ بازاری مشروب تو کہیں بعد میں شروع ہوئے۔ ہوتے بھی ہوں گے تو گھر میں نعمت ہی ایسی تھی کہ کبھی ضرورت ہی نہ پڑتی۔ اب تو خالص دودھ کا گھونٹ بھرنے کو ترس گئے ہیں۔ جو ان بچے ہیں۔ ایک ایک گلاس بھی نصیب نہیں ہوتا۔ پورا ہی نہیں پڑتا۔“

مرست بے جی کے سر میں تیل کی مالش کر رہی تھی۔ پاس ہی ناصرو دوپٹے پر کوشیے کی نیکل بنارہی تھیں۔

”ساجد علی کے گھر تو اب بھی اللہ کا بڑا فضل ہے۔“

”جی تائی! چار بیٹیاں۔ تین ساہیوال نسل کی گائیں۔ کٹے، کٹیاں ان سے الگ۔“ مرست نے فخر سے بتایا۔

”اللہ محنت کا پھل دیتا ہی ہے۔ ساجد علی اکیلا ہے پر ہمت والا ہے۔ بس کرپنچی! تھک جائے گی۔“

”بے جی! انہیں تھکوں گی۔“

”ہفتے کو کل تیرا پرچہ ہے۔ جا اب پڑھ لے۔ جس مقصد کے لیے آئی ہے اس پر نظر رکھ۔ اللہ تجھے ہر امتحان میں کامیاب کرے۔“

مست نے ان کے بال سمیٹ کر چٹیا بنائی۔ وہ یہاں بالکل بھی مہمانوں کی طرح نہیں رہتی تھی۔ اپنی پردھائی کے ساتھ ساتھ مقدور بھر سب کا ہاتھ بھی بٹاتی مینے بھرے اس نے مریم اور مارہ کے ساتھ اکیڈمی جو ان کئی تھی۔ یوں تیاری میں اور سولت ہو گئی۔ کنگھا سنبھال کر واش بیسن پر ہاتھ دھونے لگی۔
 ”میں تو کہتی ہوں ناصرہ! اگلے سال کرن کے ساتھ ساتھ عدیل کی شادی بھی کرویں۔“ بے جی نے کچھ سوچتے ہوئے کہا۔

”م بھی تعلیم مکمل کرے۔ پھر نوکری۔ ایک دو سال کمالے بے جی۔“

”ہاں۔ اچھا ہے اپنے پیروں پر کھڑا ہو جائے۔ بیوی کی سو ضرورتیں ہوتی ہیں۔ اللہ کوئی نیک اطوار بچی کا نصیب اس گھر میں کھولے۔ یہ اپنی مست بھی سلیقہ مند اور ہنس مکھ لڑکی ہے۔ عدیل کا رشتہ کرتے ہوئے اس کو ذہن میں رکھنا۔“ اگرچہ بے جی نے ہلکی آوازیں کہا تھا۔ مگر بات مست کے کانوں تک پہنچ گئی تھی۔ اس نے دانستہ دیر لگائی۔ وہ ناصرہ کا جواب سننا چاہتی تھی۔ مگر وہ کسی دھاگے میں الجھ گئی تھیں۔ وہ اندر چلی آئی۔ شام کو چارے چھ انہیں اکیڈمی جانا ہوتا تھا۔ اکیڈمی زیادہ دور بھی نہ تھی۔ تینوں پیدل ہی چلی جاتیں۔ اگرچہ گرمی میں اتنا سا چلنا بھی زہر لگتا تھا۔
 ”تمہاری تیاری تو ٹھیک ہے؟“ تینوں واپس آ رہی تھیں۔ آج مست کا اکیڈمی میں آخری دن تھا کہ دو دن کے بعد اس کا پہلا پرچہ تھا۔

”لگتا تو یہی ہے۔“ اس نے دوپٹے سے پسینہ صاف کیا۔ وہ مین روڈ چھوڑ کر اندر گلیوں سے ہو کر آتی تھیں۔

”سونو! تمہارا کوئی آئیڈیل ہے؟“ مریم فائل کا چھجا بنائے ہوئے تھی۔

”آئیڈیل؟“

”ہاں آخر تم نے کچھ تو سوچا ہو گا۔ کیسے شخص کے ساتھ تمہاری شادی ہونی چاہیے؟“
 ”شہر کا پڑھا لکھا خوب صورت نوجوان۔“ مست نے دل ہی دل میں سوچا۔ ساتھ ہی عدیل کا خیال آیا۔ لیکن اس کے اندر کوئی کیفیت نہ ابھری۔ بس یوں جیسے عام سی بات ہو۔

”نہیں۔ میں نے کچھ نہیں سوچا۔“

”تمہارے گاؤں میں کوئی نہیں ہے؟ کوئی بانکا بھیل۔“ مانو نے لقمہ دیا۔

مست کو شفیق یاد آیا مگر اس نے مسکرا کر نفی میں سر ہلا دیا۔ تب ہی اس کی نگاہ دائیں طرف گئی۔
 ”لو۔ وہ آج پھر کھڑا ہے۔“

”کہاں؟“

”وہ دانستہ کھوستا۔ کبخت۔“

”شہر جاؤ۔ آج اس کا پتا بھی کربھی لیتے ہیں۔“ مانو نے دانستہ پیس کر ادھر ادھر دیکھا۔ جھپٹ کر اک بڑا سا پتھر اٹھایا اور ان کے منع کرنے سے قبل ناگ کو بے مارا۔

نشانیہ ایسا تھا کہ اسے لگنے کے بجائے بس چھو کر گزر گیا۔ اگلے لمحے ان کی چیخیں نکل گئیں۔ وہ ان کے پیچھے آ رہا تھا۔ دگڑ۔ دگڑ۔ گلی ان کے قدموں کی دھمک سے گونج اٹھی۔ جب وہ گھر پہنچیں تو ایک کاپا بچہ نہیں تھا وہ سری کا دامن، مسرت کی دوڑا البتہ ان سے تیز تھی۔ کتا انہیں گھر تک چھوڑ کر گیا تھا۔ سامنے بے جی کے پاس بیٹھے شفیق کو دیکھ کر تینوں ٹھنک کر رکیں۔ مریم اور مائرہ تو فوراً "اوپر بھاگیں۔ جبکہ وہ رک گئی۔

"کیا بات ہے۔ ہوائیاں کیوں اڑی ہیں۔ سانس کیوں پھولی ہے۔" بے جی نے فوراً "تشویش سے پوچھا۔ جبکہ شفیق کی نگاہوں میں اسے دیکھ کر خوشگوار سا تاثر اُٹ آیا تھا۔

"ک۔ کچھ نہیں۔ السلام علیکم۔"

"و علیکم السلام۔ کیسی ہو۔؟"

"جی ٹھیک ہوں۔"

"پڑھائی کیسی جا رہی ہے۔ پرچے کیسے ہوئے ہیں۔؟" ایسے ہی دو چار سوالوں کے بعد وہ دوبارہ سے بے جی سے باتیں کرنے لگا۔

مسرت نے کچن میں جا کر پانی کے دو گلاس پئے۔ شفیق تھوڑی دیر ہی رکا۔ بے جی نے خاصی خاطر مدارات کی۔ مگر اصرار کے باوجود وہ رات کو نہ ٹھہرا۔

"خالہ نے کچھ چیزیں بھجوائی تھیں۔ وہ دینے آیا تھا۔ کچھ کپڑے ہیں۔ خالہ نے کہا تھا۔ پرچوں میں ضرورت ہوگی سلو الینا۔"

"اچھا۔" مسرت نے جلدی جلدی کپڑوں کا شمار کھولا۔ خوب صورت رنگوں اور پرنٹ والے لان کے چار سوٹ تھے۔

"پسند آئے۔؟" یہ سوٹ شفیق نے یہیں سے خریدے تھے۔ خالہ نے پیسے دینے چاہے مگر اس نے نہیں لیے تھے۔

"چلتا ہوں اور کسی چیز کی ضرورت ہوئی تو بتا دینا۔" وہ سب سے مل کر چلا گیا۔

"کیسا سلجھا ہوا لڑکا ہے۔ بات کر کے طبیعت خوش ہو گئی۔ میں نے جب دیکھا تو چھوٹا سا تھا۔ اسے مسرت۔ اس کی کہیں بات و ات طے ہے یا نہیں۔"

کپڑے دیکھتی مسرت نے ایک دم ٹھنک کر بے جی کو دیکھا۔ وہ خاصی متاثر لگ رہی تھیں۔

"پتا نہیں۔" مسرت نے آہستگی سے کہہ کر باہر والے دروازے کو دیکھا۔ اچانک ایسا احساس ہوا جیسے کوئی ہمت اپنا مل کر گیا ہو اور وہ اس سے اچھے طریقے سے ملی بھی نہیں۔

عمر صحن میں بھنگوا ڈال رہا تھا۔ اماں نے ہمت کچھ بھجوا دیا تھا۔ بادام کے شربت کی بوتلیں۔ سرسوں کے تیل کا کنستری۔ تربوز اور خربوزوں کی بوری۔ ڈھیر سارے نمائز اور سبزیاں۔

"عالیہ! ناصر! لڑکیا باہر نکلو! سلمان سمیٹو! دیکھو تو ساجد علی نے کیا کچھ بھجوا دیا ہے۔" بے جی خوش میں

کہہ رہی تھیں۔

”اپنا پہلے تو یہ تریز اور خربوزے کاٹ کر ٹھنڈے کرو۔ آج تو جی بھر کر کھائیں گے۔“
”تیل کا کنسرو اندر کرو۔ خواجواہ لوگ مانگنے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ بڑا مزگا ہے۔ مسرت! شام کو تمہارے نایا گھر آئے تو انہیں بادام کا شربت بنا کر دینا۔“
”لو۔ ہمیں کیا لڑتا ہے بادام کا شربت۔“

مسرت خاموشی سے سنتی رہی۔ وہ جانتی تھی۔ یہ ساری سوغاتیں شفیق کے کھیتوں کی ہیں۔
رات کو ٹھنڈا اٹھار تریز کھاتے ہوئے مریم اور مارہ نے اسے گھیر لیا۔
”تم تو کہتی تھیں۔ کوئی بانکا بجیلا نہیں۔ تو یہ کہاں سے نکلا۔؟“
”جہان نہیں۔ میں نے تو کبھی اسے اتنے غور سے دیکھا نہیں۔“ مسرت نے بے نیازی سے کہا۔
جی میں آیا کہ انہیں بتائے مگر چپ ہی رہی۔



وہ مسرت کا تیسرا پرچہ تھا۔ جب حارث گھر آیا۔ اس کی طبیعت خراب تھی اس لیے ایک دو چٹھیاں لے کر آیا تھا۔

”حارث! بچے بتا دلہ ادھر کوا لو۔ کب تک پردیس میں پڑے رہو گے۔ یہاں رہو گے تو باپ کو سہارا ہوگا۔“ بے جی نے ہمدردی سے کہا۔ انہیں تو اسے دیکھ دیکھ کر ہول اٹھ رہے تھے۔ کیا کمزور سا ہو رہا تھا۔

”تو کمری کا معاملہ ہے بے جی! بتا دلہ نہیں ہو سکتا۔“ وہ کینٹی دباتے ہوئے بولا۔ پھر ناصروہ سے پوچھنے لگا۔
”سارا اپنے گھر میں خوش ہے۔؟“

”شکر ہے اللہ کا“ خوش باش ہے۔“ وہ اطمینان بھرے انداز میں بولیں۔

”کرن کی کب تک کریں گے۔؟“ وہ اٹھ کر بیٹھ گیا۔ مریم نے واشنگ مشین لگا رکھی تھی۔ اب کپڑے نچوڑ نچوڑ کر پھیلا رہی تھی۔ حارث لا شعوری طور پر اسے دیکھنے لگا۔ کرن کے بعد اس کی باری تھی۔
”اللہ نے چاہا تو گرمیوں کے بعد۔“ بے جی نے بتایا۔ حارث کی نگاہیں بے اختیار ماں کی طرف اٹھیں۔ وہ ان کی نگاہوں کا مضمون سمجھتی تھیں۔ نظریں چراگئیں۔

”کسی اچھے ڈاکٹر سے علاج کرواؤ۔ یہ معدے کا مسئلہ کیوں ہو گیا ہے۔“ عالیہ نے بات بدلی۔
”بازاری کھانے کھا۔ کھا کہ اب معدہ بچا رہ گیا کرے۔ تمہیں تو پیٹے کی کوئی فکر ہی نہیں۔“ بے جی نے چڑ کر کہا۔

”تو کیا کروں میں ساتھ چلی جاؤں۔“ عالیہ کو غصہ آنے لگا۔

”تم کب تک اسے گود میں لیے بیٹھو گی۔ جوان بچہ ہے۔ شادی کو بیوی آکر سنبھالے۔“ بے جی نے دو ٹوک بات کی۔ عالیہ کو تاؤ آگیا۔

”کیسے کروں۔ تین تین جوان بیٹیوں کے ہوتے۔“

”اب بیٹیوں کے لیے تمہیں کوئی برنہ پسند آئے تو کیا بیٹے کو کنوارا بوڑھا کر دو گی۔“

”تمہیں بہت جلدی ہے شادی کی۔“ عالیہ کو حارث پر غصہ آنے لگا۔ جو بے جی کو بیٹھا دکھڑے سنا تا رہتا تھا۔

”جلدی۔ ارے اس کے ساتھ کے کئی کئی بچوں کے باپ بن گئے۔ کب تک بازار کی روٹی کھا کر پیٹ خراب کرتا رہے گا۔“

”حارث بیٹا! تمہارے لیے دلہہ بناؤں یا ساگودانہ؟“ مامو نے جھگڑا ختم کرنے کے لیے پوچھا۔

”کچھ بھی بتادیں۔“ وہ بے زار سا ہونے لگا۔ ”صدف کہاں ہے؟“

”سہیلی کی منگنی میں گئی ہے۔“ عالیہ نے تیوری چڑھا کر بتایا۔ آج صبیحہ کی منگنی تھی۔ صدف تو لڑکے

کی تصویر اور بایوڈیٹا سن کر ہی پریشان ہو گئی۔ وہ صبیحہ کا پھوپھی زاد تھا۔

”صبیحہ! تم نے کیا دیکھ کر اسے پسند کیا ہے؟“

”خود کو دیکھ کر۔“ وہ منگنی کی انگوٹھی پہنے مطمئن سی بیٹھی تھی۔

”کیا مطلب۔؟“

”بابا! آم کھاؤ پیر کیوں گنتی ہو۔“

”ان لوگوں نے صرف تمہاری نوکری کے لالچ میں یہ رشتہ کیا ہے۔ تاکہ ان کے سارے خاندان کو پال

سکو۔“

”جانتی ہوں۔“

”تب بھی۔“

”ہاں۔ تب بھی۔ مجھے غور سے دیکھو۔ اس ڈھائی من کی دھون کو کون بیاہنے آئے گا۔ امی میری وجہ

سے ہالی بلڈ پریشر کی مریضہ بن چکی ہیں۔ باپ ہے نہیں۔ بھائی اپنی اپنی دنیا میں لگن۔ میں کب تک ماں کا

صبر آزماؤں۔ نعیم آج جاہ لیس ہے ساری زندگی تو نہیں رہے گا۔ اس کی بہنیں بیاہنے والی ہیں۔ ساری

زندگی تو نہیں بیٹھی رہیں گی۔ انشاء اللہ سب ٹھیک ہو جائے گا۔ کچھ مشکلیں ہوئیں تو آسانیاں بھی ہوں

گی۔“

وہ آرام سے کہہ رہی تھی اور صدف کی سمجھ میں نہ آتا تھا کہ وہ غلط ہے یا یہ سب۔

”تم سناؤ۔ تمہارے نواز شریف کا کیا حال ہے؟“ صبیحہ نے موضوع بدلا۔

”پلیز۔ میرا تو مت کہو اور فروا اپنے جیٹھ کو سمجھاؤ۔ خواہ خواہ اپنی انرجی وقت اور پیسہ برباد نہ کرے۔ ہر

موقعہ پر کارڈ پھول اور تحفہ بھیجو دیتا ہے۔“

صدف کالجہ سراسر مذاق اڑانے والا تھا۔ فروا کو برا لگا۔ مگر وہ چپ رہی۔ نہ وہ صدف کو سمجھا سکتی تھی نہ اپنے جیٹھ کو۔

”میں اب چلتی ہوں۔ زیادہ لیٹ ہو گئی تو بے جی کو اختلاج ہونے لگے گا۔“ صدف اس محفل سے بور ہو گئی تھی۔ سو جلد ہی اٹھ گئی۔ گھر آئی تو عالیہ خاصی غصے میں تھیں۔
 ”بس سیلیوں کی مگنیاں کرواتی رہنا۔ اب کچھ اپنے بارے میں بھی سوچ لو۔“
 ”سوچ لیں گے جلدی کس بات کی ہے۔“ وہ پہلے ہی بے زار تھی۔
 ”مجھے نہیں۔ تمہارے بھائی کو جلدی ہے۔“

”می! ایک بات ہوئی ہے، آپ خواہنا۔“ حارث نے کمرے میں داخل ہوتے ہوئے ان کا جملہ سن لیا تھا۔ ”اس میں غصے والی کون سی بات ہے۔ ہر کوئی اپنی زندگی کے بارے میں فیصلہ کرنے کا اختیار رکھتا ہے۔“

”آپ حارث کی شادی کر دیں۔“ صدف نے جو لری اتارتے ہوئے کہا۔
 ”تم لوگوں کی عقل کیا گھاس چرنے چلی گئی ہے۔“ عالیہ نے سر پیٹ لیا۔ ”وہ کون لڑکی ہوگی جو تین تین ماسوں اور نندوں کی موجودگی میں یہاں رہنا پسند کرے گی۔“
 ”اسے کون سا یہاں رہنا ہے۔ حارث ساتھ ہی لے جائے گا۔“
 ”رہنا بھی پڑے تو میں نے لڑکی ہی وہ پسند کی ہے کہ مسئلہ ہی نہ ہو۔“ حارث کے منہ سے پھسلا۔ عالیہ حق رہ گئیں۔

”تم نے لڑکی پسند کی ہے؟“
 ”جی۔“ حارث نے سنجیدگی کے ساتھ اعتراف کیا۔ صدف نے خوشگوار حیرت کے ساتھ پوچھا۔
 ”کون؟“

”مریم۔“ حارث نے اطمینان بھرے لہجے میں بتایا۔
 ”کیا۔؟“ عالیہ چیخ اٹھیں۔ انہوں نے فوراً ”اٹھ کر دروازہ بند کر دیا۔“
 ”تمہیں اتنا اچھا خیال آ کیسے گیا۔؟“ صدف کہہ رہی تھی۔
 ”رے بس کرو تم دونوں۔ دماغ چل گیا ہے۔ خبردار جو یہ بات دوبارہ منہ سے نکلی۔“
 ”می! اس میں حرج کیا ہے۔ مریم گھر کی لڑکی ہے۔ آپ کے سارے خدشے تو اس کا نام سن کر ہی ختم ہو جانے چاہئیں۔“ صدف کو ماں کے رد عمل پر حیرت تھی۔ حارث خاموشی سے ماں کا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔

”میں نے کہا ختم کرو۔ ایسا ہو نہیں سکتا۔ ایک میرا بیٹا ہے۔ اسے کسی کھاتے پیتے گھر میں بیاہوں گی۔“
 ”یوں کہیں بیٹے کو کیش کروانا ہے۔“ حارث کے لہجے میں کسی قدر تلخی بس گئی۔ جواباً ”عالیہ نے اس کے خوب لتے لیے۔“

”ساری دنیا بیٹوں کو اچھے گھروں میں بیاہتی ہے۔ اگر میں تمہارے لیے کسی امیر گھرانے کی خوب صورت لڑکی لانا چاہتی ہوں تو اس میں تمہارا ہی بھلا ہے۔“

”ہاں جیسا بھلا آپ نے ان کے ساتھ کیا ہے۔“ وہ صدف کی طرف اشارہ کرتا اٹھ گیا۔ عالیہ کے تلوے پر لگی سر پر بھی حارث کو خوب سنائیں۔

مرست سمیت سب کو ہتا چل گیا کہ حارث شادی کرنا چاہتا ہے مگر عالیہ نہیں کر رہیں۔ جبار صاحب نے کچھ کہنا چاہا تو وہ چیخ اٹھیں۔

”مجھے اور میری بیٹیوں کو گھر سے نکال دو۔ پھر لے آنا ہو۔“

اب اس کے بعد وہ کیا کہتے۔ چپ چاپ بادام کا شربت پینے لگے۔ یہ کسی کو خبر نہ تھی کہ حارث کس سے شادی کرنا چاہتا ہے کہ وہ دوسرے دن ہی واپس چلا گیا تھا۔ بے جی جلتی کلکستی رہیں۔ مرست کے پیچہ ختم ہوئے تو وہ بھی گاؤں بھاگی کہ اتنے بہت سے دن رہنے کے بعد اداس ہو رہی تھی۔



دوپہر کو سوئی تو کھانے کے لیے بھی نہ اٹھی۔ رات کو خنت بی بی نے اٹھا کر دودھ کا گلاس پلایا۔ پی کر پھر سو گئی۔

”سوئے دے دو مہینوں کا رتبہ کھمبہ امتحان دینا معمولی بات نہیں۔“ ساجد علی نے ٹوکا۔

اس کی آنکھ اگلے دن صبح کھل گئی۔ واش روم سے نکلی تو وسیع صحن میں ٹھنڈی میٹھی ہوا چل رہی تھی۔ اس نے گہرے گہرے سانس لے کر آسمان کو دیکھا۔ جو رزق کی تلاش میں نکلے پرندوں کی چکاروں سے آباد ہو چکا تھا۔ ابھی ملگجاسا اجالا تھا۔ اس نے وضو کر کے آگن میں جائز نماز بچھا کر نماز پڑھی۔ دعا کے بعد اٹھی تو دڑبے میں مرغیاں کٹ کٹا رہی تھیں۔ اس نے آگے بڑھ کر دروازہ کھول دیا۔ وہ اک ریلے کی صورت میں نکلیں اور پر پھڑپھڑا کر صحن میں چکرانے لگیں۔

”بی بی! ملازم کنڈی کھڑا کر دودھ کی بالٹیاں رکھ گیا۔ مرست نے پہلی بار اتنا دودھ دیکھ کر ماشاء اللہ کہا

اور بالٹیاں ڈھانپ کر رکھ دیں۔ اماں مکھن نکال چکی تھیں۔ اس نے چولے پر چائے رکھی۔ تو ارد گرد گھروں کے بچے لسی لینے آئے لگے۔ مرست نے زندگی میں پہلی بار انہیں بغیر چائے لسی دی۔ چائے بننے تک اماں بھی آگئیں۔ وہی چائے کی ایک پیالی لیتی تھیں۔ وہ ماڑے سے آ رہی تھیں۔ اس لیے ہاتھ پاؤں دھو کر آگئیں۔ خود اس نے لیے اس نے بگ بھر کر میٹھی لسی کا بنایا۔

”اماں! میں تو ترس گئی تھی۔ اس لسی کے جگ کے لیے وہاں کبھی کبھار بناتے تو تھے مگر بس ایک ایک گلاس ہی جسے میں آتا تھا۔“

”جیسے ہی شوق تھا۔ یہاں کی نعمتوں سے منہ موڑ کر شہر جا کر رہنے کا۔“

”میں اس بار بہت اداس ہو گئی تھی۔“
 جنت بلی کو وہ تھوڑی بدلی ہوئی لگی۔ سنجیدہ ہو گئی تھی۔
 ”شاید زیادہ دن دوڑ رہی ہے۔ اس لیے لگ رہا ہے۔“ انہوں نے سوچا۔
 ”دوپہر کو ان کے ساتھ پلٹ کر لیٹ گئی۔ وہ چپٹی رہیں۔“
 ”بیچھے ہو جا۔ گرمی ہے۔ بجلی بند ہے۔“
 ”کہاں ہے گرمی، مجھے تو نہیں لگ رہی۔“ وہ مزے سے کہتی ٹس سے مس نہ ہوئی۔ جنت بلی کو حیرت تھی۔ وہ اس بار پچھلی بار کی طرح شہر کی باتیں نہ بتا رہی تھی۔
 ”آپ نے کپڑے بہت اچھے پیچھے۔“
 ”میں نے تو شفیق سے کہا تھا۔ اس پچارے نے مجھ سے پیسے بھی نہیں لیے۔“
 ”اچھا۔“ وہ چپ سی ہو گئی۔
 ”اس کی فصل خاصی ہوئی ہے گھر دوبارہ بنوا رہا ہے۔ شہر سے نقشہ بنوا کر لایا ہے۔ قیمتی چمکتا ہوا پتھر سارے گھر میں لگوا رہا ہے۔ ویسا تو نمبردار کے گھر بھی نہیں ہے۔“
 ”اچھا۔“ وہ نجانے کس سوچ میں تھی۔
 ”شام کو جا کر ماسی سے مل آنا۔“
 ”ہاں فاطمہ کی طرف بھی جاؤں گی۔“
 فاطمہ نے بی ایڈ کر لیا تھا۔ اب گھر بیٹھ کر جینز کی تیاری کے ساتھ ساتھ آنے والی ویکسینسز کا انتظار کر رہی تھی۔ مسرت نے اماں سے خوب سارا تیل لگوا یا شام کو نما کر پہلے خالہ زہنب کی طرف گئی۔ وہ اسے دیکھ کر نمال ہو گئی۔ شفیق گھر پر نہ تھا۔ آدھا گھر گرایا جا چکا تھا۔
 ”خالہ! آپ ہماری طرف آجائیں۔ یہاں کیسے رہیں گی؟“
 ”مجھے تو گزارا چل رہا ہے۔ نہ ہوا تو آجاؤں گی۔ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔
 ”اب بتا میری دھی رانی! کیا کھائے گی۔ شہر جا کر اتنا سامنہ نکال لیا ہے۔ میں نے شفیق سے کہا تو تھا۔ تریوز شہر سے کر آئے۔“
 ”دے گیا تھا تریوز اور خروڑے بھی۔ بلکہ بہت اچھا کیا وہاں تو ہر چیز اتنی منگنی ہے، سوچ سوچ کر خریدنا پڑتا ہے۔ اچھا خالہ! میں نے فاطمہ کی طرف جانا ہے۔“ رزلٹ تک کا عرصہ اس نے گاؤں میں بڑے آرام سے اماں سے لڑے بغیر گزارا تھا۔



وہ باہر نکلی تو زبیر آدھا دڑبے میں گھسا انڈے چرا رہا تھا۔
 ”ٹھہر جا۔“ اس نے پیچھے زوردار لالت مار کر اسے اندر کیا۔ ساتھ دڑبے کا دروازہ بند کر کے کنڈی

لگادی۔ وہ دہائی دینے لگا۔

”باجی! اللہ کے واسطے۔ اندر بہت بو ہے۔“

”اچھی بات ہے پہلے بو سونگھ، پھر اندر کھانا۔ اور میں بھاتی ہوں فاطمہ کو۔“ مسرت نے ڈرا دیا۔

خود پاپ لگا کر صحن میں چھڑکاؤ کرنے لگی۔ نین نے ایک دم تیش چھوڑی۔ پھر ٹھنڈی ہو گئی۔ سوندھی مٹی کی مہک چار سو پھیل گئی۔ وہ گنگناتے ہوئے کبھی کبھی پھوار خود پر بھی ڈال دیتی۔ زبیر اب دروازے کو دھکے لگا رہا تھا۔ کنڈی ڈھیلی تھی اک جھٹکے سے کھل گئی۔ وہ بگنٹ دروازے کی طرف بھاگ۔ مسرت اس کے پیچھے تھی۔ دروازہ کھول کر باہر نکلا تو شفیق سے ٹکرا گیا۔ وہ جو پوری رفتار سے بھاگ رہی تھی دروازہ پکڑ کر بمشکل خود کو روک پائی۔

”یہ کیا ہو رہا ہے؟“ زبیر اس کے ہاتھوں سے نکل گیا۔ وہ تیزی سے دروازے کی اوٹ میں ہو گئی۔ پانی ایک ہی جگہ بہہ کر دروازے کی سمت آنے لگا۔

”خالہ کہاں ہیں؟“

”بائے کی طرف گئی ہیں۔“ مسرت نے جھل سی ہو کر کہا۔

”کل گھر میں میلا دہے۔ خالہ کو تادینا اور خود صبح سے آکر اماں کا ہاتھ بٹا دینا۔ تمہیں اپنے آپ تو خیال آئے گا نہیں۔“

”توبہ! جل کھڑا نہ ہو تو۔“

”سن لیا؟“ شفیق نے انگلی سے دروازہ بجایا۔

”سن لیا ہے۔“ مسرت چڑکرولی۔

”تو اتنا جل بھن کس لیے رہی ہو؟“

”اپنے گھر میں کھڑی ہوں۔ اپنی مرضی سے جل بھن بھی نہیں سکتی۔“

”شہر جا کر کچھ زیادہ ہی زبان دراز ہو گئی ہو۔“ شفیق نے اس دروازے کو دھکا لگایا جس کی اوٹ میں وہ کھڑی تھی۔ دروازہ اس کے کندھے سے ٹکرایا۔

”کیا بات ہے؟“ مسرت ایک دم چیخی اس سے قبل کہ وہ بات بتاتا۔ عقب سے جنت بی بی آگئیں وہ انہیں پیغام دے کر چلا گیا۔

”ہونہ۔ میں تو کبھی نہ جاؤں صبح سے۔“

اس کے صبح سے جانے کی نوبت ہی نہ آئی۔ جنت بی بی اسے گھر پہ چھوڑ کر خود چلی گئیں۔ اس تاکید کے ساتھ کہ دوسرے کو تیار رہے۔ وہ لینے آجائیں گی۔ سنہ جانے کا تو سوال ہی نہ تھا۔ اس نے گھر کا کام سمیٹا، کپڑے بدل کر چھوٹی چھوٹی جھمکیاں پہن رہی تھی جس میں سوٹ کے ہم رنگ سبز رنگ جڑے تھے جب اماں آئیں۔ سبز دوپٹے کے بالے میں اس کی موہنی صورت اتنی پیاری لگ رہی تھی کہ اماں نے دل ہی دل

میں بلائیں لیں۔

”ہاں! ٹھیک ہے۔“

”ہاں دوپٹہ ٹھیک سے اوڑھ لے۔“

شفیق کے گھر کے اندر باہر کا رخا رخ تھا۔ دیکھیں پک رہی تھیں۔ باہر مردوں کا رخ تھا اندر عورتوں کا۔ مسرت گھر میں داخل ہوتے ہی ہکا بکا رہ گئی۔ خوب صورت گھٹا اطراف میں صحن درمیان میں لان۔ جس میں گھاس اور چند ایک پودے لگے تھے۔

”اے۔ اس میں تو جھولار کھنا چاہیے۔ وہ جو فلاں ڈرامے میں۔“ وہ بے ساختہ کہہ رہی تھی کہ اندر آتے شفیق پر نظر پڑ گئی تو منہ بنا کر بولی۔
”ہو نہ مجھے کیا۔“

وہ مسکراہٹ دیتا اندر چلا گیا۔ چمکتے ٹائلوں، کھلے کھلے روشن ہوا دار کمرے، چمکتے سفید ٹائلوں سے مزین ہاتھ دوم۔ مسرت نجانے کیوں چپ سی ہو گئی۔ اس دن اس نے پہلی بار فاطمہ سے عدیل کا ذکر کیا۔ بی بی کی بات بتائی۔

”اے۔ تو تم نے اپنی مرضی کا میدان مار لیا۔“ فاطمہ کا لہجہ بجھ سا گیا۔

”پتا نہیں۔“ وہ خود ابھی ہوئی تھی۔

”کیا مطلب۔“

”یہ محض ایک بات ہے۔ فاطمہ! شہر ویسے نہیں ہیں، جیسا کہ میں نے سوچا تھا۔“

”میں تم سے ہمیشہ کہا کرتی ہوں کہ ہر جگہ کے اپنے مسائل اپنی سہولتیں ہیں۔ جو چیزیں یہاں وافر ہیں انہیں شہر والے ترستے ہیں۔ جو سہولتیں انہیں میسر ہیں۔ ہمارے ہاں کم ہیں۔“
”ہوں۔“ وہ کسی گہری سوچ میں گم تھی۔

”مسرت۔۔۔ سوچ سمجھ کر فیصلہ کرنا۔“ فاطمہ نے کہا۔ ”تمہارا رزلٹ کب آ رہا ہے؟“

”آئے والا ہے۔“

”کاغذیں داخلہ لوگی؟“

”شاید۔“ وہ خود ہی متذبذب تھی۔

جس دن اس کا رزلٹ آیا۔ وہ دن ساجد علی کے لیے سب سے زیادہ خوشی کا دن تھا اس نے سیکنڈ ڈویژن میں ایف اے کر لیا تھا۔ خود اسے بھی یقین نہ آتا کہ انگریزی میں تھوڑی سی گڑبڑ کا خدشہ تھا۔ ساجد علی نے سارے گاؤں میں مٹھائی بانٹی۔ خالہ نہنمب نے اسے دو سوٹ لے کر دیے اور جنت۔۔۔ ان کا دل انجانے خدشوں سے لرزتا تھا۔

”اب وہ شہر جانے کی ضد کرے گی۔“

انہوں نے پچھلے دو ماہ جو وہ شہر میں گزار کر آئی تھی۔ نجانے کیسے گزارے تھے۔

جبکہ مسرت اڑی پھر رہی تھی۔

”ساجد علی۔۔۔“ کمرے کی بے حد خاموش فضا میں جنت کی آواز بہت آہستگی سے ابھری۔ کسی گہری سوچ میں ڈوبی آواز۔ ساجد علی نے چونک کر بیوی کو دیکھا۔ وہ کب سے دودھ کا خالی پیالہ ہاتھ میں لیے گم صم سی بیٹھی تھیں۔ ساجد علی کو کل سے ہلکا بخار تھا۔ اس وقت بھی وہ دودھ کے ساتھ دوالے کر چادر اوڑھے لیٹے تھے۔ جبکہ مسرت باہر برتن وغیرہ سمیٹ رہی تھی۔ اس سے قبل کہ وہ کچھ پوچھتے باہر کی کنڈی کھڑکی دروازے کے پاس مرغی کا ڈربہ بند کرتی مسرت نے اونچی آواز میں پوچھا۔

”کون۔۔۔؟“

”شفیق۔۔۔“

ایک پل کو مسرت ساکت سی ہوئی۔ پھر دوپٹہ پھیلاتے ہوئے دروازہ کھول دیا۔
 ”بوجی“ اور امی اندر ہیں۔ ”کہہ کر وہ رکی نہیں۔۔۔ ڈربے کے پاس جھک کر کنڈی لگانے لگی۔ کنڈی ڈھیلی تھی۔ بہت احتیاط سے لگانی پڑتی۔ سیدھی ہوئی تو دل دھک سے رہ گیا۔ وہ عین اس کے پاس کھڑا تھا۔ مسرت نے کتر کر ٹکنا چاہا۔ شفیق نے ڈربے پر ہاتھ رکھ کر رستہ روک دیا۔
 ”ک۔ کیا بات ہے۔۔۔؟“ وہ کونے میں سمٹ گئی اور سر اسیمگی سے اسے دیکھنے لگی۔ چاند اس کے عقب میں چھپ گیا تھا اور چاندنی کے غبار میں نمایاں وجود اس پر حاوی ہونے لگا۔
 ”مجھے رستہ دو۔۔۔“ مسرت کی آواز اسی لرزی۔

”تمہیں بتایا تھا، تمہارے رستے مجھ تک آتے ہیں۔“ مضبوط پر اعتماد لہجہ۔

دیوار پر بیٹھی ملی نے اپنی کانچ سی آنکھوں سے ان دونوں کو گھورا۔
 ”کیوں بھاگ رہی ہو۔“ وہ ایک قدم آگے بڑھا، یہ کئی قدم پیچھے ہٹی۔ پر نور چاندنی میں اٹھتی گرتی پلکوں کا نظارہ خوب تھا۔ اس سنجیدہ سے شخص کا دل خوا خواہ شرارت پر آمادہ تھا اور مسرت کا بس نہ چلتا تھا کہ مرغی کا ڈربہ کھلا ہوتا تو اسی میں گھس جاتی۔ شفیق نے دوپٹے سے جھانکتی لٹ کو انگلی سے ہٹانا چاہا۔ مسرت نے زور سے اس کے ہاتھ پر اپنا ہاتھ مارا۔ یہ بالکل غیر ارادی سی حرکت تھی۔ شفیق نے حیرت سے پہلے اپنے ہاتھ کو دیکھا۔ پھر منہ دیا۔ ”ہم دل میں اترتی کسی راز سے پردہ اٹھاتی ہسی۔“

”بڑی جی دار ہو۔“

”میں اماں کو آواز دوں گی۔“ مسرت کی گھبراہٹ کچھ کم ہوئی۔

”کیا کہو گی۔“

”تم مجھے چھیڑتے ہو۔“

شفیق کا قہقہہ بے ساختہ تھا۔ اس قہقہے کی آواز اندر تک گئی۔ جنت بی بی بے چین ہو کر باہر نکل آئیں۔

دروازہ تو بہت دیر ہوئی کھلا تھا۔ شفیق جلدی سے پلٹ کر سلام کرنے لگا۔
 ”وہ دڑبے کی کنڈی نہیں لگ رہی تھی۔ ہاتھوں میں تو بالکل ہی جان نہیں ہے۔ خالہ اسے کچھ کھانے کو نہیں دیتی ہو۔“

مسرت مسکراہٹ بابتی دوسرے کمرے میں گھس گئی۔
 ”ہاں ڈھیلی ہو گئی ہے۔ صبح ٹھیک کرواؤں گی۔“ جنت بھانجے کو لے کر اندر کمرے میں آگئیں۔
 ”آؤ جوان۔“ ساجد علی نے خوش دلی سے کہا۔

”آپ کی مزاج پر سی کے لیے آیا ہوں۔ اماں بتا رہی تھیں بخار ہے۔“ وہ ان کی پائنٹی کی طرف بیٹھ گیا۔
 ”یونہی معمولی سا ٹیپر کچ ہے۔“ انہیں جنت بی بی کا یہ بھانجا دل سے پسند تھا۔ سختی، خوش اخلاق، ہر قسم کی اخلاقی گراؤٹ سے دور۔ بزرگوں کا احترام کرنے والا جو اپنے کھیتوں میں کام کرنے والی مزدور لڑکیوں کی طرف آنکھ اٹھا کر بھی نہ دیکھتا تھا۔

”ستی! شفیق کے لیے چائے بنالا۔“ اماں نے وہیں سے آواز لگائی۔
 ”ہو نسہ میں کہیں بناؤں۔“ اس نے چارپائی پر لیٹ کر بانڈ آنکھوں پر رکھ لیا لیکن تھوڑی ہی دیر میں بانڈ نیچے تھا اور اماں خشک مین نگاہوں سے اسے گھور رہی تھیں۔
 ”کب سے بکواس کر رہی ہوں۔ آنکھوں کے ساتھ ساتھ کان بھی بند کر لیے ہیں۔ دیکھ رہی ہوں ستی! تو شہر جا کر کچھ زیادہ ہی مزاج دار ہو گئی ہے۔“

”افوہ۔ بنارہی ہوں اماں!“
 اسی ڈر سے کہ آواز شفیق تک نہ جائے وہ جلدی سے اٹھ کر باورچی خانے میں چلی گئی۔ جہاں سلنڈر گیس موجود تھی۔ جھنجلائے ہوئے انداز میں چولہا جلایا۔ کیتلی میں پانی ڈال کر رکھا۔ چینی پتی بے دریغ جھونکی دودھ برائے نام ڈالا۔ ذرا سا بال آٹے پر کپ میں انڈیل دی۔
 ”رہنے دو، کیوں اتنی مشقت کر رہی ہو۔“

مسرت گھبرا گئی۔ وہ دروازے کے درمیان کھڑا تھا۔
 ”کیوں گھبراتی ہو۔ میں صرف مبارکباد دینے آیا تھا۔“
 اس نے کرتے کی جیب میں ہاتھ ڈال کر چھوٹی سی مٹیلی ڈیہ نکالی اور جھک کر اس کے پاس رکھ دی۔
 ”پچھلے سال بنوائی تھیں۔ دینے کی نوبت اب آرہی ہے۔“

مسرت نے ذرا سادہ کیا۔ سونے کی چھوٹی چھوٹی بالیاں تھیں۔ جن میں تین سرخ رنگ جڑے تھے۔
 ”میں کل اماں کو بھیج رہا ہوں۔ بی اے، ایم اے، جو مرضی کرنا لیکن شادی کے بعد۔ دوسری بات میں چائے بہت اچھی پیتا ہوں۔ یہ بدلے سے بنی چائے تم خود ہی پی لے لینا۔“

وہ کہہ کر رکنا نہیں۔ باہر کا دروازہ کھلنے پھر بند ہونے کی آواز آئی۔ تب اس نے نظروں کا زاویہ بدل کر چائے کے کپ کو دیکھا۔ پھر ساتھ پڑی ڈیہ کو جس میں بالیاں جگمگا رہی تھیں۔ اس نے ہاتھ بڑھا کر ڈیہ

اٹھال۔

”جھنڈہ لگا دیا۔ ایک چائے کی پیالی بنانے میں۔ بچہ یونہی سوکھے منہ اٹھ گیا۔ اب کیا چلہ کاٹنے بیٹھ گئی ہے۔“

”ماں۔۔۔“ مسرت نے سراٹھا کر زور زور سے بولتی اماں کو دیکھا۔ پھر ڈیوہ اس کی طرف بڑھائی۔
”کیا ہے؟“ جنت نے ڈیوہ پکڑی۔

”وہ دے کر گیا ہے۔“ مسرت رخ بدل کر چینی پتی کے ڈبے اٹھانے لگی۔

”اے اچھا۔“ جنت بی بی ایکدم غائب دماغ سی ہو گئیں۔ مسرت نے چور نظروں سے ماں کو دیکھا۔ جو بالیاں ہی دیکھ کر جاری تھیں۔ پھر اک طویل سانس لے کر ڈیوہ واپس کرتے ہوئے بولیں۔
”سنبھال کر رکھ دے۔“

خود کمرے میں چلی گئیں۔ ساجد علی نے گم صم بیوی کو دیکھا۔

”کیا بات ہے جنت! چپ چاپ ہو؟“

”کچھ سوچ رہی تھی۔“ وہ اک طویل سانس لے کر بولیں۔

”خدا خیر کرے۔“ انہوں نے بغور بیوی کا چہرہ دیکھا۔

”ساجد علی! اسی اب شر جا کر داخلہ لینے کی ضد کرے گی۔“

”ہوں۔۔۔“

”میں نہیں چاہتی وہ جائے۔“ جنت نے دو ٹوک بات کی۔

”ہوں۔۔۔“

”زینب شادی کی بات کر رہی ہے۔“ وہ شوہر کا ذہن پڑھنے کی کوشش کر رہی تھیں۔

”اچھا۔“

”ساجد علی۔۔۔“

”جنت۔ مسرت کو میرے پاس بھیجو۔“

ان کے لہجے میں اک فیصلہ کن کیفیت تھی۔ جیسے وہ کسی نتیجے پر پہنچ گئے ہوں۔ جنت اٹھ کر دو سرے کمرے میں چلی گئیں۔ مسرت آئینے کے سامنے کھڑی بالیاں پہن کر دیکھ رہی تھی۔ ماں کو دیکھا تو جھجک کر اتارنے لگی۔

”پنہ رکھو۔“ ماں کے کہنے پر اس کے ہاتھ رک گئے۔ چھوٹی چھوٹی بالیاں اس کے چہرے پر کیسی بھلی لگ رہی تھیں۔

”جا کر اپنے باپ کی بات سن لو۔“

وہ ڈیوہ اوڑھتی چلی گئی۔ جنت بی بی تنکری اس کی چار پائی پر بیٹھ گئیں۔

ٹھیک ایک سال بعد کرن کی شادی بھی ہو گئی۔ ان ہی دنوں سارا نے اک مقامی کالج میں بطور لیکچرار اپنی جاب شروع کی۔ عالیہ کو پسنے کا موقع مل گیا۔
”کیوں گزارا نہیں ہوتا۔“

”جی چاچی! اس منگائی کے دور میں کہاں گزارا ہوتا ہے۔ پھر اتنا پڑھنے کا کیا فائدہ جو آڑے وقت میں میاں کا ساتھ نہ دے سکوں۔“ اس نے ساوگی سے جواب دیا۔

”سی لیے کہتی تھی۔ بیٹیوں کو کھاتے پیٹے کھرانے میں بیاہو۔ اب بچہ سنبھالو گی یا نوکری کرو گی۔“
”سب ہو جاتا ہے چاچی! آپ سے اک بات کرنا تھی۔“ سارا نے جھجکتے ہوئے کہا۔
”میرے رشتے کے دیور ہیں سبحان۔ ابھی نوکری تو کوئی خاص نہیں ہے۔ لیکن امید ہے کہ بہت جلد اچھی نوکری مل ہی جائے گی۔ خاصے پڑھے لکھے ہیں گھرانا بھی بہت اچھا ہے۔ انہوں نے نایاب اور صدف کو میری شادی میں دیکھا تھا۔ کہہ رہے تھے کہ میں بات کروں۔“
چچی کے متوقع رد عمل سے ڈرتے ہوئے اس نے بات مکمل کی۔

”نہ بھی۔ تم نے تو اتنا پڑھ لیا کہ ضرورت کے لیے نوکری کرنے چل دیں۔ میری نایاب کو تو کوئی شوق نہیں۔ رہ گئی صدف تو وہ کسی کی نہیں مانتی۔“ انہوں نے یہی سوچ کر کہ سارا کے سرال والے ہیں تو غریب ہی ہوں گے۔ چند جملوں میں بات ختم کر دی۔ سارا نے کچھ کہنا چاہا تو ناصرہ نے اشارے سے منع کر دیا۔

”آج آرہے ہیں نایاب کو دیکھنے۔ خاصے امیر ہیں۔ اللہ کرے بات بن جائے۔“
سارا نے دیکھا۔ نایاب کے اندر وہ جوش و خروش ماند پڑ گیا تھا۔ وہی فیشل، پیڈی کیور، معنی کیور۔ لیکن وہ بے حد بدلی سے تیار ہوئی۔

مہمان نو دولتوں والے کوفر کے ساتھ تشریف لائے۔ حسب معمول عالیہ جبار نے ان کی خاطر مدارات میں کوئی کسر نہ چھوڑی۔

”جاؤ چائے لے آؤ۔“ سارا نے کچن میں آکر نایاب سے کہا۔ اس نے فوراً ”ٹرے نہیں اٹھائی۔“
”نیا!“ سارا نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”سارا! امی سے کہہ دو کہ یہ آخری بار ہے۔ اس کے بعد کبھی نہیں۔“ نیا کے لمبے میں لرزش سی تھی۔
پھر وہ ٹرے اٹھا کر فوراً باہر نکلی۔ سارا کا دل خراب ہو گیا۔ بہت سی دعائیں کرتی وہ نیا کے پیچھے چلی آئی۔ وہ چائے سرو کر رہی تھی اور مہمان تو روری چڑھائے ایک دوسرے کو دیکھ رہے تھے۔ آج تو عالیہ بھی خاموش تھیں۔ حسب عادت بڑھ چڑھ کر بیٹی کی تعریفیں نہیں کر رہی تھیں۔

”چلیں۔“ ان میں سے ایک خاتون نے بے زاری سے کہا تو سب اٹھ کھڑے ہوئے۔ ان کے تیور ان کا جواب بتا رہے تھے۔ کوئی بھی انہیں رخصت کرنے نہیں گیا۔ اور وہ خاتون صحن میں ہی شروع ہو گئیں۔

”یہ کہاں بھیج دیا زیدہ آپا نے نہ علاقہ ڈھنگ کا نہ علاقے والے۔ میں نے سوچا شاید لڑکی ہی خوب صورت ہو۔ وہ بھی۔“

اس عورت کی آواز اندر تک آئی تھی۔ نیا کا چہرہ ایک دم پیلا پڑ گیا۔ وہ اٹھی اور بھاگتی ہوئی ڈرائنگ روم سے نکل گئی۔
سب اپنی اپنی جگہ گم صم بیٹھے رہ گئے۔



”امی! بہت بہت مبارک ہو۔ توصیف نے مقابلے کا امتحان پاس کر لیا ہے۔“
اس دن صبح ہی صبح سارا اور توصیف چلے آئے۔ زندگی انہی لوگوں کے لیے ہے جو مشکلوں پر قابو پانے کا حوصلہ رکھتے ہوں۔ توصیف کی تقرری ایرائے مجسمیٹ گوجرانوالہ ہو گئی۔ بے جی اور ناصروہ خدا کا شکر ادا کرتے نہ تھک سکتے۔ وہیں عالیہ کے سینے پر سانپ لوٹ جاتے۔ یہ ان کا غور تھا کہ بیٹیوں کا نصیب کہ ابھی تک کسی کی بات طے نہ کر سکیں۔ اسرار واپس چلا گیا۔ عدیل کی تعلیم مکمل ہو گئی۔ وہ آج کل جاب کی تلاش میں تھا۔

وقت ان کی زندگیوں کے مزید تین سال چرا کر گزر گیا۔

اس ساری پروجیکشن سے اگر کوئی حد سے زیادہ بے زار ہو اتو وہ حادثہ تھا۔ عالیہ کے پاس اسے ہلانے کا یہی طریقہ تھا کہ نت نئے رشتے اس کے لیے گنوا تیں۔ پھر کوئی نہ کوئی بھانہ بنا کر ٹال دیتیں۔ لیکن کب تک وہ ماں کے حیلے بھانے سمجھ رہا تھا۔ تب ہی ایک دن جب عالیہ نے بتایا کہ وہ کل اس کے لیے لڑکی دیکھنے جا رہی ہیں۔ تب اس نے بے حد ٹھنڈے لہجے میں کہا۔
”اس کی ضرورت نہیں امی۔“

”اے ضرورت کیوں نہیں۔ کیا میرے دل میں ارمان نہیں تمہارے سر پر سرود دیکھنے کا۔“

”ارمان نکالنے کا وقت اب گزر گیا امی۔ کیونکہ میں شادی کر چکا ہوں۔“

عالیہ کو غش آ گیا۔



نایاب کی حالت اور حادثہ کی شادی کی خبر نے سارے گھر کو پریشان کر دیا تھا۔ نیا نے اس کو کچھ زیادہ ہی دل پر لیا تھا۔ سارا سارا دن کمرے میں بند رہتی۔ کوئی کچھ کہہ دے تو غصے میں زور زور سے بولتی۔ چیزیں توڑتی۔ عالیہ کو تو دود بوجاب دیتی۔ اپنی سبکی اور زلت کا احساس چین نہ لینے دیتا۔ اسے لگتا۔ سب اسے ترس اور رحم کی نگاہوں سے دیکھتے ہیں۔ عالیہ سر پیٹ لیتیں۔

”میری کیا اپنی اولاد سے دشمنی تھی۔ اسی کا بھلا چاہا۔ مجھے کیا پتا تھا۔ یہ دن دیکھنے پڑیں گے۔“

بے جی انہیں دکھ سے دیکھ کر رہ جاتیں۔ بہت دل چاہتا انہیں چار چار سائیں کہ تمہاری ہٹ دھرمی اور جلد بازیوں نے یہ دن دکھایا ہے۔ مگر گھر میں پہلے ہی اتنی پریشانی تھی کہ وہ بمشکل خود کو کچھ کہنے سے روکتیں۔

نیا کو صدف پر رشک آتا۔ کم از کم وہ اس کی طرح بار بار تماشا نہ بنی تھی۔ اس کے پاس خود کو مصروف رکھنے کے لیے جاب کا آسرا تو تھا۔ آرام سے تیار شیر ہو کر کالج جاتی۔ واپسی پر وہی اس کا کمرہ اب تو اس نے سیکنڈ ہینڈ گاڑی بھی لے لی تھی۔ اب یہ تو کوئی اس کے دل سے پوچھتا جو سب کچھ سہہ کر خاموش بیٹھا تھا۔ اپنی نبض اٹا اور کراتے جذبات کو چھپائے بے نیازی سے خود میں مصروف تھی۔ کوئی ہنس کر کہہ دیتی۔

”صدف! اب اپنا راسٹ مین ڈھونڈ لو۔“ تو مسکرا کر ٹال جاتی۔

”یار! زندگی شادی کے بغیر بھی اچھی گزر رہی ہے۔“

ماہ نے اہم اے کر لیا تھا لیکن خود کو مصروف رکھنے کے لیے پچھلے تین سال سے کورسز پر کورسز کیے جا رہی تھی۔ اسے نیا کی حالت سے خوف آتا۔ اسے یقین تھا۔ وہ بہت جلد سائیکو کیس بن جائے گی۔ بے جی مریم کے رشتے کے لیے سرگرداں تھیں۔ مگر نچائے کیا بات تھی کہ اس کی بار تاخیر ہی ہوئی جا رہی تھی۔ چھٹی کلون تھا۔ سارا صبح سے آئی تھی۔ اس کے بچوں نے گھر کی خاموش فضا میں اودھم مچا رکھا تھا۔ اب کیا سوچا ہے بے جی؟“

سارا کو گھر کے ماحول سے وحشت سے ہوئی۔ چچی کے پورشن سے کوئی بھی ادھر آکر نہ بیٹھتا۔ بس رسمی سلام دعا، رسمی باتیں وہ محفلیں تو خواب و خیال ہی ہو گئی تھیں۔

”میں کیا کہہ سکتی ہوں۔“ انہوں نے اک سرد آہ بھری۔ ان کی نماز اور وظیفے میں اضافہ ہو گیا۔

”سب چچی کی غلط پروچ کا نتیجہ ہے۔ کیا کمی تھی ریحان بھائی میں۔ معمولی جاب ہے۔ میں بھی تو اسکول ماسٹر سے بیابھی تھی۔ نصیب میں ہو تو سب مل جاتا ہے۔ آج وہی ریحان بھائی اتنی اچھی پوسٹ پر ہیں۔ ایک ہی جست میں آسمان چھونے کی خواہش نے چچی کو زمین پر لا پٹا ہے۔ اب تو عقل کریں۔“

بے جی کے کمرے میں صرف وہی لوگ تھے۔ اسی لیے سارا کھل کر رہی۔

”مجھے تو بچا جان پر ترس آتا ہے۔ وقت سے پہلے ہی بوڑھے ہو گئے۔ جہاں بیٹھے ہوں وہیں سوچ میں ڈوب جاتے ہیں۔ ہمارے معاشرے میں تو لڑکیوں کے رشتوں کے مسائل کچھ زیادہ ہی سنگین ہو چکے ہیں۔ اوپر سے یہ بے لگام خواہشیں اور نام نہاد آئیڈیالزم کے چکر۔ صدف میں کس بات کی کمی تھی۔ مگر خوب سے خوب تر کی تلاش میں وقت ہاتھ سے پھسل گیا۔“

”یہی تو مصیبت ہے۔ پہلے تو لڑکیاں خاندان میں ہی کھپ جاتی تھیں۔ اپنے انہوں کو ڈھانپ لیتے تھے۔ اب تو جسے دیکھو۔ خاندان سے باہر جھانک رہا ہے۔ اپنے خاندان کی لڑکیاں تو نظری نہیں آتیں۔ گھر کی مرغی دال برابر اسی لیے تو نفسا نفسی اور بے چینی کا عالم ہے۔ باہر سے ہیرے موتی چن کر لائیں گے۔ بھلے

بعد میں پتھر دوڑے نکلیں۔ ”بے جی اک سرد آہ بھر کر بولیں تو ناصرو پوچھنے لگیں۔
”سبحان کی شادی ہو گئی؟“

”ابھی تو نہیں ہوئی۔“ سارا نے کچھ سوچتے ہوئے بتایا۔ ”اب حارث بھائی کے بارے میں کیا فیصلہ ہوا ہے؟“

”تمہاری چچی کہتی ہیں کہ جیتے جی اسے ہوسلیم نہ کروں گی۔“
”حارث نے انہیں زک بھی تو بڑی پہنچائی ہے۔ جو بیٹیوں کے بارے میں اتنے اونچے خواب دیکھتی
نہیں۔ بیٹے کے بارے میں کیا کیا نہ سوچا ہو گا۔ امی! میں اک بات سوچ رہی تھی۔“ سارا نے قدرے
جھجکتے ہوئے کہا۔ بے جی اب ناصرو دونوں ہی اس کے انداز پر متوجہ ہوئیں۔

”نایاب کا تو جوڑ نہیں ہے، لیکن اگر ہم عدیل اور مانو کا۔“
”ارے خواجواہ ہی۔“ ناصرو یکدم چمک اٹھیں۔ ”میری پانچ بچیوں کے لیے ان کو تو خیال نہ آیا۔ اب
مجھے کیا عدیل کے لیے دلہن نہ ملے گی۔“
”امی! اب جانے دیں ہماری۔“

”ہی، بے جانے دوں یہ مجھ سے پوچھو یا اپنے باپ سے، تمہاری دفعہ کرن کی دفعہ کیسے بار بار خیال آتا
تھا، کوئی ایک بیٹی تو گھر میں رہ جائے، مگر میرے دیور دیورانی کو ایک بار بھی خیال آیا۔ چلو عالیہ کو چھوڑو۔
تمہارے چچا نے سوچا کہ کسی طرح بھائی کا بوجھ ہلکا ہو جائے۔“ ناصرو سخت غصے میں آگئی تھیں۔
”مہوں نے نہیں سوچا۔ تو آپ ہی۔“

”بس سارا! تمہیں کس نے کہا ان معاملات میں دخل دو۔ تو صیف نے آنا ہے تو بتاؤ۔ میں کھانے کا
انتظام کروں۔“ وہ نرم دھپے پن سے کہہ کر اٹھ گئیں۔

سارا نے بے جی کی طرف دیکھا۔ وہ بے بسی کے ساتھ ہلکا سا مسکرائیں۔

”تم فکر نہ کرو۔ کچھ نہ کچھ اچھا ہی ہو گا۔“

تب ہی صدف چلی آئی۔

”سارا آئی ہے۔“

”آپ کو تو کبھی اتفاق نہیں ہوئی کہ میرے غریب خانے میں ہی جھانک لیں۔“

”کثر سوچا۔ لیکن سوچتی ہی رہ گئی۔“ وہ ہنس دی۔ سارا نے دیکھا، وہ اب بھی اتنی ہی جاذب نظر اور

بیاری تھی۔

”پھر کیوں کوئی؟“ لا شعوری طور پر اس کا ذہن ایک ہی دائرے میں گھومنے لگا۔

”سارا! یہ تو روئے جا رہا ہے۔“ مریم اس کے سب سے چھوٹے بیٹے کو گود میں اٹھائے آگئی۔ سارا کے

اب تین بچے تھے، دو بیٹیاں، ایک بیٹا۔

”اس کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا ہے، دانت نکال رہا ہے تو تنگ بہت کرتا ہے۔“

”نیا کو ساتھ لے جانا، سارا دن کمرے میں بند کڑھتی رہتی ہے۔“ صدف کے جانے کے بعد بے جی نے آہستگی سے کہا۔ وہ سارا سے سرسری سائل کراپنے کمرے میں چلی گئی تھی۔

”جی اچھا۔“ وہ بچے کو ہلاتے ہوئے پنا کے کمرے میں آگئی۔ وہ اوندھے منہ بستر پر بڑی پاس رکھے رسالے پر بے توجہی سے انگلیاں پھیر رہی تھی۔

”کیوں نیا! ہیرو کو ہٹانے کا کوئی طریقہ نہیں ملا۔“ سارا نے کمرے میں چھائی خاموشی توڑنے کو خوشی سے کہا۔ نیا اٹھ کر بیٹھ گئی۔ اس نے سارا کو دیکھا۔ دوسرے پل نبھانے کیا ہوا کہ اس کے گلے لگ کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔ سارا خود بھی آب دیدہ ہو گئی۔ اس کے بیٹے نے دونوں کو روتے دیکھ کر چیخ ماری اور آسمان سر پر اٹھالیا۔

”بس کر دیا۔ دیکھو اس معصوم پر ترس کھاؤ۔ کیوں اتنی ٹینشن لے رہی ہو۔“

”مجھے حارث بھائی کی ٹینشن نہیں ہے۔ انہیں یہ بہت پہلے کر لینا چاہیے تھا۔“

”تو اپنے لیے پریشان ہو۔ بے وقوف دیکھنا خدا نے تمہارے نصیب میں بہت اچھا سا بندہ لکھا ہو گا۔“

سارا نے اس کی بیٹھ سہلاتے ہوئے کہا۔

”سارا! مجھے لوگوں کے سامنے تماشائے کا غم ہے۔ اسی اب ایسے ایسے لوگوں کو بلانے لگی ہیں جن کی طرف ہم دیکھنا بھی گوارا نہ کریں، پھر میں ہی کیوں؟ صدف کو تو کوئی کچھ نہیں کہتا۔ وہ تو مزے سے اپنی زندگی خودی رہی ہے۔“

اس نے دوپٹے سے چہرہ صاف کرتے ہوئے کچی کچی لمبے میں کہا۔

”توازن زندگی کے ہر معاملے میں ضروری ہے زندگی کا حسن ہے اور چاقی نے ہمیشہ ہر کام بہت آنتار پر جا کر کیا ہے، لیکن دیکھو۔ اب اٹھو۔ کسی بھی بات کو دل پر لینے کی ضرورت نہیں، مجھے فمد کو ڈاکٹر کے پاس لے کر جانا اور کچھ کپڑے بھی خریدنے ہیں اور تم میرے ساتھ چل رہی ہو۔“

نیانے ٹالنا چاہا۔ مگر اس نے ایک نہ سنی۔

کلینک پر خاصا رش تھا۔ انہیں انتظار کرنا پڑا۔ پھر فمد نے بھی خاصا ستایا۔ باری آنے پر سارا اسے اندر لے گئی تو نیا کی توجہ پاس بیٹھی لڑکی نے کھینچی۔ شکل جانی پہچانی سی تھی۔

”آپ نے میٹرک کہاں سے کیا ہے؟“ نیا ب نے بے اختیار پوچھا۔ اس نے قدرے حیرت سے نیا ب کو دیکھا اور ہنسیں اچکا کر پوچھا۔

”کیوں؟“

”بس، مجھے لگا، آپ میری کلاس فیو رہی ہیں۔“

اب کے اس نے غور سے نیا ب کو دیکھا اور اسکول کا نام بتا دیا۔

”مسز خورشید ہماری کلاس ٹیچر ہوتی تھیں۔“ نیا ایک دم جوش میں آگئی۔

”ہاں۔“ اس نے اثبات میں سر ہلایا۔ دونوں کو ایک دوسرے کا نام یاد نہ تھا۔ پھر بھی باتیں شروع ہو گئیں۔
 ”بچے کو دکھانا ہے۔“ اس نے اپنے ساتھ بیٹھے چھ سات سالہ بچے کو جس کا پکٹ تھماتے ہوئے نیا سے پوچھا۔

”میری بہن نے۔“ نیا نے مختصر جواب دیا۔ پھر پوچھا۔ ”تمہارا بچہ ہے۔“

”ہاں۔ چار بچے ہیں۔ یہ سب سے بڑا ہے۔“

”ارے شادی کب ہوئی؟“

”تقریباً نو سال ہو گئے۔“

”اور تمہاری۔۔۔“

”میں نہیں ہوئی۔“ نیا نے بدقت جواب دیا۔ پھر لولا، لنگڑا عذر بھی پیش کیا۔ ”ہمارے خاندان میں شادیاں جلدی نہیں ہوتیں، پہلے تعلیم، پھر جابز وغیرہ۔“

”ظاہر ہے جب لڑکیوں کے رشتے وقت پر طے نہ ہوں تو چھاریاں کریں کیا۔۔۔ میری چھوٹی بیٹی بھی اگلے سال اسکول چلی جائے گی۔“ اس کے لہجے میں استہزا آمیز فخر در آیا۔ کم از کم نیا کو تو یہی محسوس ہوا۔ اس کا دل چاہا کھینچ کر پھنسر مونی کے منہ پر دے مارے۔ خود پر بھی غصہ آ رہا تھا، ضرورت کیا تھی راہ اور رسم بڑھانے کی۔ جب تک سارا باہر آئی اس کا موڈ آف ہو چکا تھا۔
 ”تمہیں کچھ خریدنا ہے؟“

”سارا! گھر چلو، خریداری پھر کبھی کر لیتا۔“ اس نے بمشکل ضبط کرتے ہوئے کہا۔

”چھا! اُس کریم کھا لیتے ہیں، یہاں پاس ہی ایک ہے۔“ سارا کو اس کی موڈ کی خرابی کا اندازہ بخوبی ہو چلا تھا۔

”گھر پہ منگو کر کھا لیتا۔“ نایاب نے فوراً آگے بڑھ کر ٹیکسی بھی روک لی۔ سارا کو ناچار بیٹھنا پڑا۔
 نایاب جو گھر آکر کمرے میں بند ہوئی تو اسے تو صیف کے آنے اور سارا کے جانے کا بھی پتہ نہ چلا۔



اشاف روم میں مٹھائی کا ڈبہ کھلا تھا، سب منہ میٹھا کرنے کے ساتھ ساتھ انجم کو مبارکباد دے رہی تھیں، جبکہ وہ مسرور سی سب کے درمیان بیٹھی تھی، صدف کو گلاب جامن کا ڈالٹھ ہلکا سا کڑوا محسوس ہوا، حقیقت تو یہ تھی کہ صدف کے بچ کی سب ہی شادی شدہ ہو چکی تھیں، اسوائے صدف کے اسی لیے اب سب کی توپوں کا رخ صدف کی طرف تھا۔

”مس صدف! اب آپ بھی مٹھائی کھلا دیں۔“

”زندگی بہت چھوٹی ہے، کب تک چوائس میں ضائع کریں گی۔“

”چوائس میں تو کہتی ہوں، جو مل جائے اسی پر اکتفا کر لیں۔“

اک زبردست سا قہقہہ اسٹاف روم میں گونجا۔

”ارے صدف ہاں کرے تو میں آج ہی اپنے ڈاکٹر بھائی کے لیے دست سوال دراز کر دیتی، لیکن افسوس ان کی کل متگنی ہے۔“

”میری سمجھ میں نہیں آتا۔ اس معاشرے کی لڑکیوں کا اول و آخر مسئلہ شادی کیوں ہے؟“

صدف کا موڈ بری طرح بگڑ گیا تھا۔ ”میں اپنا کماتی، اپنا کھاتی ہوں، اپنی نیند سوتی ہوں۔ کوئی روک ٹوک نہیں۔ خواجواہ کسی صوکی غلامی کیوں قبول کروں۔“

”اف“ اس قدر ڈل اور بورنگ لائف، یا رہمارا کیا قصور ہے کہ ہماری زندگی میں کوئی چاہنے والا نہ ہو۔

ساس، نندوں کی چپقلش، دیورانی، جھٹانی کا حسد نہ ہو۔“

صدف کو اپنے سوال کا جواب نہ ملا تھا۔ بات ہنسی مذاق میں ٹل گئی، اسے اپنے سوال کا جواب شام کی ڈاک سے ملنے والے دو خطوں سے ملا۔

اس نے بیڈ پر رکھا وہ گلابی لفافہ اٹھایا، وہ بنا کھولے اس میں موجود کارڈ کے الفاظ پڑھ سکتی تھی۔ مگر بیڈ کے کنارے ٹپکتے ہوئے اس نے کارڈ کھول لیا۔

آج 14 فروری تھی۔

یہ جو پکلوں پر رحم، جھم ستاروں کا میلہ سا ہے

یہ جو آنکھوں میں دکھ، سکھ کے سادوں کا ریلہ سا ہے

یہ جو تیرے بنا، کوئی اتنا اکیلا سا ہے

زندگی تیری یادوں سے مہکا ہوا شہر ہے

سب محبت کا اک پہر ہے

زندگی دھوپ چھاؤں کا اک کھیل ہے، بھیڑ جھپتی نہیں

اور اسی کھیل میں دن گزرتا نہیں، رات کتنی نہیں

تم نہیں جانے خواہشوں کی مسافت سمنٹی نہیں

پیار کرتے ہوئے آدمی کی کبھی عمر گھٹتی نہیں

دل کی دہلیز پر عکس روشن تیرے نام سے

رت جگمگے آئینوں میں کھلے ہیں کیس شام سے

اک دریا ہے چاروں طرف درمیان۔ بحر ہے

سب محبت کا ایک پہر ہے

”یہ شخص تو تھکتا ہی نہیں۔“ اس نے کارڈ لفافے میں ڈال کر ایک طرف رکھا اور دوسرا خط کھولا۔

یہ فروزاں کا خط تھا۔ جو شادی کے بعد کینڈا شفٹ ہو گئی تھی، اکثر تو فون بھی نہ کرتی، لیکن کبھی کبھار

لباسا خط ضرور لکھتی بہت سی باتوں کے بعد اس نے لکھا تھا۔

”یار صدف! ایک محاورہ تو سمجھ میں آگیا۔ دور کے ڈھول سنانے، یہ عجیب ملک ہے، یہاں سروائیو کرنے کے لیے ہر کسی کو کام کرنا پڑتا ہے، یہ تو تصور ہی نہیں کہ بیویاں گھر بیٹھ کر عیش کریں اور مرد کمائے کے چکروں میں گھن چکر بن جائیں، یہاں ہر کوئی اپنی اپنی جگہ کو لو کا تیل ہے، پاکستان میں ہر کوئی مجھ پر رشک کرتا ہے، یہ کوئی نہیں جانتا کہ میں کیسی پر مشقت زندگی گزار رہی ہوں، تم سناؤ، سنا تھا صبیحہ کی شادی ہو گئی ہے، اور انجم بھی راضی ہے، اچھی بات ہے، زندگی ٹھہراؤ کا نہیں، تسلسل کا نام ہے، رشتے سے رشتہ جڑتا ہے تو نئے رشتے جنم لیتے ہیں، سب سے خوبصورت اور پیارا رشتہ تو اولاد کا ہے، اپنے بچوں کو دیکھتی ہوں تو لگتا ہے زندگی مکمل ہو گئی۔ پھر میاں بیوی کا رشتہ ہے، میں تو اسے گلاب اور کانٹے کا رشتہ کہتی ہوں، لیکن گلاب کی خوشبو ہمیشہ کانٹے کی چھین پر حاوی ہو جاتی ہے، ہمیں غصہ آئے تو ہم بہت لڑتے ہیں، ایک دوسرے پر خوب چیخنے چلاتے ہیں، تب میں خود کو کوسی ہوں، ضرورت ہی کیا تھی شادی کی، فضول کی غلامی۔ لیکن جب وہ رات کو میرے ماتھے پر ہاتھ رکھ کر ہمارے پوچھتا ہے۔“

”خفا ہو۔“ تو آنسو بہہ نکلتے ہیں، اور جب وہ انگلیوں کی پوروں سے میرے آنسو صاف کرتے ہوئے کہتا ہے، ”بگلی! میں تو غصے میں کہہ گیا۔“

تو یقین جانو صدف مجھے سب بھول جاتا ہے۔ سمجھو تا زندگی کا حسن ہے، سراب کے پیچھے مت بھاگو، جو پاس ہے اسی میں اپنا آئیڈیل تلاشو، فروا سے بات ہوئی، بتا رہی تھی، محل بھائی اب بھی تمہارے منتظر ہیں، مجھے تم بے حد رشک آیا، ایسا کیا ہے تم میں؟ عام سی ہو، ایسی بہت سی خوبصورت لڑکیاں یہاں وہاں پھرتی ہیں، کوئی ان کے لیے عمر نہیں گنوا تا، تم تو خوش نصیب ہو کہ خود کسی کی آئیڈیل ہو۔

فیصلہ کرو صدف۔ وقت ریت کی طرح ہاتھ سے پھسلتا جا رہا ہے، ایک دن خالی مٹھی رہ جائے گی۔“

صدف نے خط تہہ کر کے کارڈ کے ساتھ ہی رکھ دیا، اس کے دل و دماغ پر اک خود ساختہ خاموشی طاری تھی، وہ کچھ بھی سوچنا نہیں چاہتی تھی۔



یہ اوائل مارچ کے خوشگوار دنوں کا سلسلہ تھا، جب تو صیف کا تبادلہ چشتیاں ہو گیا، سارا نے جاب چھوڑنے کا فیصلہ کر لیا تھا کہ بچوں کی دیکھ بھال میں مسئلہ ہوتا تھا، مانوئے مختلف کورسز ترک کر کے ایک اچھے پرائیویٹ اسکول میں جاب کر لی، جبکہ مریم بہت پہلے سے سارا کی سیٹ سنبھال چکی تھی، ناصروہ کا ارادہ اب بھولانے کا تھا، وہ مریم اور عدیل کی شادی ایک ساتھ کرنا چاہتی تھیں، سودا داروں کے ساتھ ساتھ بھوکے تلاش میں سرگرداں تھیں، بے جی نے پھر صغریٰ کو بلا لیا تھا، تب ہی عالیہ نے جھجھکتے ہوئے کہا۔

”صغریٰ، کوئی معقول سارشتہ ہو تو نیا کے لیے بھی دیکھنا۔“

انہوں نے پہلی بار معقول سے رشتے کی بات کی تھی اور مصغری کی پٹاری میں ایک معقول رشتہ موجود تھا جو وہ مریم کے لیے لائی تھی۔

”میں کل ان سے جا کر بات کروں گی۔“

کچن سے نیاتیر کی طرح باہر نکلی۔

”اور کتنا تماشا بنائیں گی آپ؟“

”میں تمہاری دشمن نہیں ہوں۔“ عالیہ نے آہستگی سے کہا۔

”دشمنی ہی کی ہے جس طرح آپ نے اپنی بیٹیوں کو ارضا کیا ہے؟ کوئی نہ کرتا ہوگا خدا کے لیے اب اور ذلیل مت کروائیں مجھے شادی نہیں کرنی سنا آپ نے اب اگر کوئی مجھے دیکھنے آیا تو میں کچھ کھا کر مر جاؤں گی۔“

وہ غصے میں جھنجھی بیڑھیاں چڑھ گئی بیڑھیوں سے اترتی مانو کے قدم ساکت ہو گئے۔ اسے نیا کے اس

روئے سے خوف آتا تھا۔ بہت دیر کے بعد وہ ست روی سے چلتی نیچے آئی اور بے جی کے پاس آکر بیٹھ گئی، بے جی کی انگلیاں ساکت تھیں، تسبیح کے دانے خاموش اور وہ خود نجانے کس سوچ میں ڈوبی تھیں مصغری جاچکی تھی عالیہ بھی اٹھ گئیں۔

باہر گول گپے والا صدا سنیں لگا رہا تھا۔

”کھاؤ گی۔“ بے جی نے چونک کر پوچھا۔

”نہیں۔“ وہ خاموشی سے ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گئی۔

”آج اسکول نہیں گئیں؟“

”جی نہیں چاہتا۔“

”صبح سے کوئی نماز نہیں پڑھی۔“ بے جی اس کی نبض شناس تھیں۔ ”عالیہ کی ساری اولاد ہی ناہنجار ہے نہ دین کا پتا نہ دنیا کا۔“

وہ خاموشی سے ان کی ڈانٹ سنتی رہی۔

”اب جاؤ جا کر نماز پڑھو ورنہ چل کھینچ ماروں گی۔“

وہ بے دلی سے اٹھ کر بیڑھیوں تک گئی مگر رک گئی عین دروازے میں کوئی رکشہ آکر رکھا تھا توڑی

دیر کے بعد آسیہ یا سرکی امی اپنی تھپتھپاندر آگئیں۔

”بسم اللہ۔ بسم اللہ۔“

بے جی فوراً ”پذیرائی کو اٹھیں۔“

یہ حقیقت تھی کہ خود مانو نے انہیں پہلی بار دیکھا تھا۔ رات گئے انہوں نے چپکے سے اپنا دبا بے جی کے سامنے رکھا وہ اس کے لیے مانو کی بات کرنے آئی تھیں۔

”میں تو ڈرتی تھی، بڑی دونوں کی موجودگی میں کیسے جھوٹی کی بات کروں، پراسر کی نوکری لگ گئی ہے میں بھی گھر میں اکیلی ہوتی ہوں۔ عالیہ اور بھائی جبار سے بات آپ نے خود کرنی ہے۔“ وہ ساری ذمہ داری ان کے کندھوں پر ڈال کر خود ایک طرف ہو گئیں۔



سارے گھر میں عجیب سا سکوت طاری تھا۔ پچھو خستہ تھیں اور سب خاموش، بے جی نے گویا کان اور زبان بند ہی کر لی تھی اور عالیہ کو یہ سمجھ میں نہ آتا کہ وہ خود کو کس مقام پر کھڑا کریں۔ صدف کی بے نیازی، نایاب کا چڑچڑاہٹ، عارث کی شادی اور بڑی دونوں کی موجودگی میں مانو کا رشتہ، اس پر شوہر کی بے اعتنائی۔

”تم جانو اور تمہاری اولاد۔“
مانو سب دیکھ رہی تھی، سمجھ رہی تھی، اسے باپ سے بھی شکوہ تھا، ان ہی کی کمزوری تھی کہ ماں کو من مانی کرنے کی عادت پڑ گئی۔ درنہ ان کی اس عادت نے ان تینوں کو کہاں کہاں خوار نہ کروایا تھا۔ وہ پہلے والی لالہ بلی مانو نہ تھی، وقت نے اور گھر کے حالات نے اسے وقت سے پہلے تو نہیں مگر ضرورت سے زیادہ میچور کر دیا تھا۔

اسے لگ رہا تھا، یہ وقت خاموش رہنے کا نہیں۔

کسی ایک کو بولنا ہے۔

کسی ایک کو یہ جمود توڑنا ہے۔

اسے بروقت اک درست فیصلہ کرنا تھا۔

اور ماڑے بروقت اک درست فیصلہ کر لیا تھا۔

صبح بے جی کے سرہانے چائے کا کپ رکھتے ہوئے اس نے بے حد ہستکی سے کہہ دیا۔

”آپ پچھو کو ہاں کہہ دیں۔“

بے جی کی تسبیح کرتی انگلیاں ساکت ہوئیں، انہوں نے سر اٹھا کر انوکھے غور سے دیکھا۔ وہ ان کی ساری پوتیوں میں سے سب سے زیادہ بے وقوف تھی، کم از کم انہیں تو لگتی تھی، کل تک لڑلڑ کر گول گپے کھانے والی مانو کو حالات نے چپکے سے ماڑہ جبار بنا دیا۔

بے جی مسکرائیں، انہوں نے دھیرے سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا اور اثبات میں سر ہلا دیا۔

”واٹ نان سنس۔۔۔ وہ احمق سالڑکا۔“ صدف کا رویہ حسب توقع تھا۔

”وہ احمق لڑکا اب ست اچھی جا کر رہا ہے۔“ ماڑہ کے لہجے میں اطمینان ہی اطمینان تھا۔

”ہمیں شروع ہی سے تم سے کوئی اچھی امید نہ تھی۔“ نایاب جل بھن کر آدمی رہ گئی۔

کمرے میں وہ تینوں اور عالیہ تھیں، جو چپ تھیں، انہوں نے کھنکار کر کچھ کہنا چاہا، مگر انہیں لگا، وہ کچھ نہیں کہہ سکتیں۔

مانہ نے سراٹھا کر ان تینوں کو دیکھا اور گردن جھکا لی۔

”مجھے رجحکشن سے ڈر لگتا ہے نیا!“

نایاب نے چونک کر اسے دیکھا۔ وہ سراٹھا کر کھڑکی سے باہر جھانکنے لگی تھی۔

”میرے اندر تمہارے جتنا حوصلہ نہیں ہے کہ بار بار ٹھکرائے جانے کا عذاب سہہ سکوں۔ اور مجھے اپنے بارے میں کوئی خوش فہمی بھی نہیں۔ تم۔ تم کیسے برداشت کر لیتی تھیں نیا۔ جب ہر ایریا غیر امنہ اٹھائے چلا آتا تھا۔ تمہیں بھیڑ بکری کی طرح جا بچتا۔ تم میں تمہارے گھر میں سو سو نقص نکال کر چلا جاتا۔ جیسے جیسے ہم لڑکیاں نہیں۔ کسی چھوٹی سی دکان کے گندے میلے شوکیں میں جی گھنیا برانڈ کی چیز ہوں جس پر گاہک ایک کے بعد دوسری نگاہ ڈالنا بھی گوارا نہ کریں۔ کیوں نیا۔ کیا کی تھی تم میں کہ کوئی ایک۔ کوئی ایک بھی تمہیں محبت سے قدر سے مانگ نہ سکے۔ صرف اس لیے کہ ہمیں محبتوں کی قدر کرنا نہ آئی۔ ہم نے ایریاں اٹھا اٹھا کر اپنے آپ کو اونچا کرنے کی کوشش کی۔ اپنے کالے رنگ کو سفید پینٹ کر کے خود کو کبوتر سمجھنے لگے۔ امی! آپ نے یہ کیوں نہ سوچا کہ جن آٹھ کنال والوں کو آپ یہاں بلا رہی ہیں۔ انہیں اپنے پہلے لوگوں میں رشتہ نہ مل سکے گا۔؟ وہ یہاں سات مرلے کے گھر میں کیا کرنے آئیں گے۔؟ امی! آپ اپنی بیٹی کی ذلت بار بار کیسے مسہد گئیں۔ اور نیا تم۔ میں تمہاری جگہ ہوتی تو اب تک مرچکی ہوتی۔ میرے اندر تمہارے جتنا حوصلہ نہیں۔“

آنسو قطرہ قطرہ اس کے رخساروں پر بہہ نکلے۔ نایاب خشک آنکھوں کے ساتھ اسے دیکھتی رہی۔ وہ ان آنسوؤں کو پہچانتی تھی۔ یہ سارے آنسو اندھیاری راتوں میں اس کے تکیے میں جذب ہوتے تھے وہ کہنا چاہتی تھی۔

”نانو! ایک بار نہیں میں تو کئی کئی بار مری ہوں۔“

”اور آپ! آپ۔“ وہ صدف کی طرف مڑی۔ ”محبتوں سے منہ موڑ کر اب تک کس کا انتظار کر رہی ہیں۔ آپ کے دل کی زمین اس قدر سنگلاخ کیوں ہے کہ وہاں کسی کی محبت کی ایک کوئیل بھی نہ پھوٹ سکی۔ ایسا نہ ہو کہ وقت گزر جائے۔ آپ تھک جائیں اور ہمراہ صرف انتظار رہ جائے۔ خدا را تو ڈرتے تھے اس نام نہاد آئیڈیلزم کے بت کو۔ خوش فہمیوں سے باہر آجائیں۔ ان میں کچھ نہیں رکھا۔ آئیڈیل کیا ہے؟ خوبیوں سے مزین خامیوں سے پاک شخصیت جو دیسے کھاتا ہو۔ پیتا ہو۔ سوچتا ہو۔ اٹھتا بیٹھتا ہو۔ اس کی گفتگو کا انداز۔ سوچنے کا اسٹائل۔ کہاں سے ملے گا۔ ہماری سوچوں کے سانچے میں ڈھلا ایسا نایاب بندہ۔ وقت ریت کی طرح مٹھی سے پھسلتا جا رہا ہے۔ ایک بار ضرور سوچیں کہ ایسا نہ ہو کل کو آپ خود اسی جگہ کھڑی ہوں۔ جہاں آج جمل صاحب کھڑے ہیں۔“

ذرا سارا اور کرن کو غور سے دیکھنے لگا۔ وہ لڑکیاں جو آپ سب کی نظر میں بے وقوف اور احمق ہیں۔ آج کس قدر مطمئن اور خوش باش ہیں۔ اپنے چھوٹے موٹے مسائل کے باوجود ان کی زندگیاں بستے پانیوں کی طرح رواں دواں ہیں۔ خوش باش عشاواں و فرحان۔ اور ہم کیا ہیں؟ ٹھہرے ہوئے پانی۔

اس نے ایک نظر سب کے گم صم چہروں کو دیکھا اور کھڑی ہو گئی۔
 ”اس سے قبل کہ یہ ٹھہرے پانی منعقد اور بدبودار ہو جائیں۔ اپنے اپنے بارے میں فیصلہ کر لیجئے۔
 نیا! سارا آپنی کے دیوراہے بھی برے نہیں۔“
 وہ کہہ کر رکی نہیں۔ فوراً ”باہر نکل گئی۔ کمرے میں صرف اس کی باتوں کی بازگشت رہ گئی۔
 یہ ماہرہ کی باتوں کا اثر تھا۔ یا وقت ان کے غور اور خوش فہمیوں کا جتنا نہ نکال چکا تھا۔ ایک دوسرے
 سے نظریں چرائے پہلے عالیہ کمرے سے باہر نکلیں، پھر نایاب۔ کمرے کے بیچوں بیچ صرف صدف رہ گئی۔
 اس نے خود کو ہمیشہ بہت اونچائی پر تصور کیا تھا۔ آج پتا چلا اس کے قدم زمین پر نہیں غلامی میں تھے۔ سو
 انجام سامنے تھا۔

وہ آہستگی سے اٹھی۔ دھیمے قدموں سے چلتی وارڈروب تک آئی اور دروازہ کھول دیا۔ اس کے ایک
 خانے میں وہ سارے تحفے اور کارڈاؤنڈھے سیدھے پڑے تھے، جنہیں اس نے کبھی کھولنے کی زحمت بھی
 گوارا نہ کی تھی۔ مگر نجانے کیوں اور کب یہاں سنبھال کر رکھنے لگی تھی۔ تب ہی نگاہ بھٹک کر آئینے تک
 چلی گئی۔

وہ اپنا خیال رکھتی تھی۔ تب ہی آنکھوں میں چمک اور چہرے کی شادابی برقرار تھی۔
 مگر کب تک؟

اس نے خود کو کچھ سال آگے دیکھا۔

چہرے کی مانند بڑتی شادابی۔

آنکھوں سے سدھم ہوتی چمک۔

سر کے اڑتے بال۔

صدف کو نواز شریف شدت سے یاد آیا۔

اس نے گھبرا کر وارڈروب بند کر دی۔



بہت جیس زندہ موسم کے بعد بارش کھل کر رہی۔ ساری کشاف بہہ نکلی۔ اک روشن نکھری صبح ان
 سب کی منتظر تھی۔ خالص مٹی کی خوشبو سے درود یوار مہک اٹھے تھے۔
 ”اف! کتنا کام ہے۔“ عالیہ اپنی ڈھیر ساری شرمندگی کو بوکھلاہٹ کے پردے میں چھپائے ہوئے
 تھیں۔ آج جل کے گھروالے آرہے تھے۔ کرن تو صبح سے آچکی تھی۔ سارا نے کان کے بعد آنا تھا۔ اسے
 بے بسی نے بطور خاص تاکید کی تھی کہ وہ اپنے رشتے کے دیور سے نایاب کے رشتے کی بات چلائے۔ سارا
 نے بتایا تھا کہ وہ لوگ ایک دودن میں چکر لگائیں گے۔ پھوہو مثبت جواب بکراڑی پھر رہی تھیں۔ انہوں
 نے اسی وقت مانو کو بغل میں دیوچ کر چٹا چٹ بلائیں لیں۔ دو ہزار ہاتھ پر رکھے۔

رات کو اسرار کا فون آیا۔

”میں نے تو بہت ڈرتے ڈرتے اماں کو بھیجا تھا کہ پتا نہیں تمہا نو آیا۔“

”یو نہی تم پر ترس آ گیا۔“

”بڑی مہربانی۔“ وہ جل کر بولا۔

”تمہیں تو پتا ہے مجھے سٹکھاڑے اور مونگ پھلی بہت پسند ہے۔“ مانو مزے سے بولی۔

”لیہ میں گول کپے بھی ستے ہیں۔“

”واف۔ پھر تو مزار ہے گا۔“ اس نے چٹکارہ لیا۔

”لیہ میں گول کپے نہ رکھو اولا۔“

”تمہیں میرا کتنا خیال ہے اسرار۔“

”پہلی بار تمہارے منہ سے اپنا نام سنا۔ اچھا لگا، ورنہ تم تو ہمیشہ مجھے لکڑھنگا ہی کہتی تھیں۔“

”نہیں وہ تو۔“ مانو کچھ نہ سوچا تو فون ہی بند کر دیا۔ ”سی لیے بے جی کہتی ہیں سوچ سمجھ کر بولا کرو۔“

”تو ب۔ اس چھٹکی کے ساتھ آنا کوئی آسان کام ہے۔ ایک بار کپڑوں پر پاؤ ڈر کر لیا۔ دوسری بار لپ

اسٹیک رگڑ لی۔ اب یو نہی لے آئی ہوں۔ خالہ خود ہی بدلے گی۔“ سارا دروازے ہی سے بولتی چلی آئی۔

”خالہ خود ہی تیار کر دے گی۔ تمہیں کون سا تیار کرنا آتا ہے۔“ مریم نے آگے بڑھ کر اس کی بیٹی کو گود

میں لیا۔ ننھے ابراہار کو مانو نے سنبھال لیا۔

”تو صیف نہیں آیا۔“ ناصرو نے پوچھا۔

”ابھی تو بیڑی تھے۔ شام میں آئیں گے۔ کرن نہیں آئی؟“ سارا نے ادھر ادھر دیکھا۔

”کرن کہاں؟ باور چن کو۔ صبح سے بلا کر کچن میں گھسا رکھا ہے۔“ کرن نے باورچی خانے سے دہائی

دی۔

”اور ہم جو آپ کے شیطان صفت بچوں کو سنبھالے ہوئے ہیں۔ وہ۔“ مانو نے ہاتھ نچایا۔

”خبردار جو میرے معصوم بچوں کو شیطان کہا ہو۔ شادی ہونے دو۔ ایسا ہی گول گیا تمہاری گود میں بھی

چیاؤں پھاؤں کر رہا ہو گا۔“

مانو بوٹھلا کر گدھے کے سر سے سینک کی طرح غائب ہوئی۔

”میں بے جی سے مل آؤں۔“ سارا ان کے کمرے میں چلی گئی۔ جبار صاحب پاس ہی بیٹھے تھے۔

بے جی کچھ بے زاری تھیں۔ اس سے مل کر کہنے لگیں۔

”اپنی چچی کو بھیج دو۔ اسے کیا وزارت۔ عظمیٰ مل گئی ہے۔ جویوں آپ سے باہر ہوئی پھر رہی ہے۔“

سارا کچھ حیران ہوئی باہر آئی۔ چچی کو پیغام دیا۔ خود نایاب سے ملنے چلی گئی۔ جو اپنے کمرے میں ہی

تھی۔ دھلا دھلایا سا چہرہ۔ سارا نے بے اختیار اسے گلے سے لگا لیا۔

”ہم اپنی صلاحیتیں ہمیشہ غلط جگہ اور غلط لوگوں کے لیے ضائع کرتے ہیں۔ اٹھو ان لوگوں کے لیے تیار

ہو جاؤ جو تم سے محبت کرتے ہیں۔“
 نایاب شرمندہ سی ہو گئی۔ بہت بار سارہ سے مس بی ہو کیا تھا۔ عالیہ گئیں تو بے جی نے تھکمانہ لہجے میں بیٹھنے کے لیے کہا۔

”بے جی بہت کام ہیں۔“

”ارے۔ بیٹھ جاؤ۔ دنیا کیا تمہارے کندھوں پر کھڑی ہے۔“
 عالیہ نے سوالیہ نظروں سے جبار صاحب کو دیکھا اور بیٹھ گئیں۔ بے جی کچھ لمحے خاموش رہیں۔ پھر مدھم لہجے میں پوچھا۔

”ادھوری خوشیاں اچھی لگتی ہیں؟“

عالیہ نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”بہنوں کی رخصتی اکلوتے بھائی کے بغیر ہوگی؟“

عالیہ نے سر جھکا لیا۔

”عالیہ! جبار، معاف کر دینے میں ہی بھلائی ہے۔ غور کرو تو اس سارے قصے میں حارث کا کچھ زیادہ قصور ہے بھی نہیں۔“

”پھر بھی اسے کم از کم باپ کو تو اعتماد میں لینا چاہیے تھا۔“ جبار صاحب نے ناراضی دکھائی۔
 ”اپنی زندگی کا سب سے بڑا فیصلہ والدین کے بغیر کر لیا۔ اب آپ کہتی ہیں کہ سب کچھ بھلا کر اسے گلے سے لگا لوں۔ کبھی نہیں۔ میری طرف سے جائے جنم میں۔ جہاں مرضی کھے (ٹی) کھائے۔“

لیکن اس گھر میں قدم رکھنا تو ناگئیں توڑوں گا یا گولی مار دوں گا۔“ وہ بھڑک اٹھے۔ عالیہ نے جھٹکے سے سر اٹھایا۔

”ارے کس کی جرات ہے جو عالیہ کے جیتے جی اس کے بچے کی ناگئیں توڑ دے شادی کی ہے، کسی کی لڑکی نہیں بھگا کر لے گیا۔ آئے گا اور اسی گھر میں آئے گا۔“

”میں اسے عاق کروں گا۔“

”میں اپنی جان دے دوں گی۔“ وہ سینہ ٹھوک کر میدان میں اتریں۔
 ”خس کم جہاں پاک۔“ جبار صاحب کی ہٹوہری پہلی بار سامنے آئی تھی۔ وہ ہنگامہ ہوا کہ سارا گھر اٹھا ہو گیا۔ ہاتھ جوڑوڑ کر انہیں خاموش کرایا۔ عالیہ بے جی کے گلے لگ کر پھپک کر رو دیں۔

”میرا اکلوتا پر کسی بچہ۔“

ساس مبہوکا یہ ملن پہلی بار سب نے دیکھا تھا۔ انگشت بدنداں رہ گئے۔

بے جی بھی جذباتی ہو گئیں۔

”بس جبار۔ بہت ہو گیا۔“ انہوں نے ہاتھ اٹھا کر تھکمانہ لہجے میں کہا۔ ”ماں کے دل سے کھیلنے کی

اجازت نہیں دوں گی۔ عدیل! حارث کو فون کرو۔ اس سے کہو کہ ہم سب اس کے منتظر ہیں۔ اور یہ کہ اکیلا نہیں بیوی کو ساتھ لے کر آئے۔ ہم سب اس گھر کی اکلوتی بہو کا استقبال کرنے کو تیار ہیں۔“
عالیہ نے بدک کر پیچھے ہٹنا چاہا۔ مگر بے جی نے بڑے زور سے جھپٹی ڈالی تھی۔ وہ ایک انچ نہ ہل سکیں۔

”اوہ جیو! بے جی آپ نے تو ہمارے بیگم کی یاد تازہ کر دی۔“

عدیل نے غموں کا گایا، سب فون کی طرف لپک گئے۔ عالیہ اپنے ہی دام میں پھنس گئی تھیں، بے بی سے ان کو فون کرتا دیکھنے لگیں، جبکہ بے جی رازداری سے جبار سے پوچھ رہی تھیں۔

”یہ ہمارے بیگم کون ہے؟“

”جنگلہ دیش کی وزیراعظم تھیں شاید۔“ عالیہ نے بے توجہی سے اپنی معلومات جھاریں۔ جبار صاحب نے بمشکل اپنا ققمہ ضبط کیا۔

”اب یہ گول میز کانفرنس ترک کریں۔ مہمان آچکے ہیں۔“ مریم نے آکر اطلاع دی۔ ہنسی مسکراتی فروا سب سے مل کر فوراً ”صدف کے کمرے میں آگئی۔“

”آخر محبت نے اپنا آپ منوا ہی لیا۔“

صدف متانت سے مسکرا دی۔

”ہم نے بھی ہکا بکا کام کیا ہے۔ موصوف نے انگوٹھی دے کر بھیجا ہے۔ وہ تو نکاح پر اصرار کر رہے تھے۔“ نیچے ہی ہڑبڑپٹی تھی۔ اگرچہ ان لوگوں نے باضابطہ ملاقات کے لیے بلوایا تھا۔ مگر وہ لوگ پھلوں اور مٹھائی کے ٹوکروں کے ساتھ باقاعدہ انگوٹھی پہنا کر رسم کرنا چاہتے تھے۔

”کوئی حرج نہیں، جب زبان دے دی تو پیچھے کیا رہ گیا۔“ بے جی نے اجازت دی، انگوٹھی اتنی کھلی تھی

کہ انگوٹھے میں پوری آئی۔

”لگتا ہے اپنی اتار کر بھجوا دی ہے۔“ صدف بربروائی۔

”وہ جلدی میں بس اندازے سے لے آئے۔“ فروا نے ڈھٹائی سے کہا۔

”اسلام علیکم!“ حارث دروازے میں اپنا چھوٹا سا بیگ لیے کھڑا تھا۔

سب ہکا بکارہ گئے، ساتھ ہی سب کی نگاہیں اس کے عقب میں بھٹکیں۔ مگر وہاں کوئی نہ تھا۔

”یہ راولپنڈی کیا گھر کے پھوٹا ہے۔“ سب سے پہلے عمیر اس کے گلے لگا۔

کچھ مہمانوں کی وجہ سے اور کچھ وہ لوگ ویسے ہی اس کو معاف کر چکے تھے۔ بہت جوش دلی سے باپ سے گلے ملتے ہوئے وہ چپکے سے بولا۔

”شکریہ ابو۔“

کسی کو خبر نہ تھی کہ جبار صاحب اسے رات ہی کو فون کر چکے تھے۔

”آپ نے ٹھیک کہا تھا بے جی۔ اوہو ری خوشیاں اچھی نہیں لگتیں۔“ سارا نے کہا۔

”کاش میری سدرہ اور زارا بھی آجاتیں۔“ ناصرو کو ان کی کمی شدت سے محسوس ہوئی۔ ”ان شاء اللہ شادیوں پر سب اکٹھے ہوں گے۔“

رات کو پچھلے صحن میں چار پائیلوں پر سب بیٹھے تھے۔

”بھیا! بھیا بھی کو کہاں چھوڑ آئے ہیں۔“ عمیر نے ہی جرات کی۔ لڑکیاں کچھ دور گول دائرہ بنائے بلا گلا کر رہی تھیں۔

”کون سی بھیا بھی؟“ اس نے لا پرواہی سے پوچھا۔

”کیوں چھوڑ گئی؟ ایسی لڑکیاں۔“ عالیہ نے تنک کر کچھ کہنا چاہا، مگر بے جی کی گھوری نے خاموش کروادیا۔ مریم سب کو چلائے دینے آئی تھی۔ بھیا بھی کدو کر پر مجھس سی ہو کر وہیں تک گئی۔

”ہماری بھیا بھی! موقعہ اچھا تھا، ساتھ ہی لے آتے۔“ مریم نے ہمدردی سے مشورہ دیا۔ حارث نے اسے بری طرح گھورا۔

”تم سے دخل دینے کو کس نے کہا ہے؟“

مریم شرمندہ سی ہو کر خاموش ہو گئی۔

”اس گھر کی اکلوتی بیوی ہے۔ اسے آنا چاہیے تھا۔“ بے جی نے سنجیدگی سے کہا۔ وہ بے جی کی گود میں سر رکھ کر لیٹ گیا۔

”اب جبکہ اسے قبول کر رہے ہیں تو خیر کس بات کے۔“ عالیہ بدبواہیں۔

”اسی لڑہ کتنی بے جرات کے ساتھ جاؤں گی۔“

”سب کچھ ہو گیا تو بارات یاد آگئی۔“ بے جی کو بھی غصہ آگیا۔ ”کورٹ میں نکاح پڑھواتے یاد نہ تھا۔“

”کورٹ میں نکاح، کس کا نکاح؟“ حارث اچھل پڑا۔

”تمہارا اور کیا میرا؟“ بے جی نے غصے سے دھپ لگائی۔

”میرا نکاح۔ آپ لوگ کیا خواب دیکھ رہے ہیں۔“

”نہن پر کیا بکواس کی تھی۔“ عالیہ کو بیٹھی کی اٹھکیلیاں ایک آنکھ نہ بھائیں۔

”کیا؟“

”یہی کہ آپ نے شادی کر لی ہے، اتنے مہینوں سے سب کی نیندیں اڑی ہوئی ہیں۔“ عمیر نے زنج ہو کر کہا۔

”فہم وہ تو یونہی مذاق میں کہہ دیا تھا۔“ اس نے دوبارہ بے جی کی گود میں سر رکھنا چاہا۔ مگر اب کہ بے جی نے اسے گود لینے سے صاف انکار کر دیا۔

”ایسی باتیں مذاق میں کرنے والی ہوتی ہیں۔“

”اسی نے مجھے زنج کر دیا تھا۔ آج یہ رشتہ کل وہ رشتہ۔ جبکہ میں بتا کر گیا تھا کہ۔“

اس نے اک ناراض نظروں پر ڈالی۔ دوسری موم پر۔ اس نگاہ کا مفہوم ہر کسی کی سمجھ میں آیا تھا۔
ماسوائے موم کے، جو گزشتہ شرمندگی بھلا کر فوراً ہی بول اٹھی۔

”آپ نے محض ٹالنے کے لیے اتنا بڑا جھوٹ بولا۔ ہم سب کے جذبات سے کھیلنے ہوئے
آپ نے ایک بار بھی نہ سوچا۔“

”ہم سب کے جذبات۔ کون سے جذبات؟“ حارث نے چمکتی آنکھوں سے اسے دیکھا۔ وہ پٹائی گئی۔
نجانے کیوں اس لمحے حارث کی نگاہوں کا مفہوم بدلادلا سا لگا۔

”حارث! تم نے ہمیں کتنا تنگ کیا ہے۔“ جہاں ایک طرف سکون کا سانس لیا، وہیں عالیہ کو تاؤ آگیا۔
”اور آپ نے مجھے۔“

”شرم کرو۔ بیجو الدین سے بدلہ لیتے ہیں۔“ بے جی نے لتاڑا۔
”یہی تو آپ لوگ سمجھتے نہیں۔ ہم لوگ بڑے ہو چکے ہیں۔ آپ کب تک ہماری انگلی پکڑ کر چلائیں
گے۔ اوسطاً“ عمر کے لحاظ سے آدمی تو گزر گئی۔ ”آخری جملہ زیر لب بڑبڑایا۔

”ہاں یہ نہ ہو کہ ہماری بھابھی گاتی پھرے۔ میں کیا کروں رام مجھے بڑبھال گیا۔“ عمو نے بھول بن
کے ساتھ حارث کے جذبات کی ترجمانی کی۔

”خواتین! میرا ایسا گھروان بیٹا ہے، دیکھنا ان ہی سب کے ساتھ اس کے سرے کے پھول کھلیں
گے اگر۔“ عالیہ نے فوراً ”کہتے کہتے ناصرو کی طرف دیکھا۔“ اگر ناصرو کو اعتراض نہ ہو۔“

ناصرہ موم کو ٹھوکے دینے لگیں۔

”کہنیاں کیوں مار رہی ہیں۔“

”یہاں سے دفع ہو جاؤ۔“ ناصرو دانت پس کر بڑبڑائیں۔ وہ غصے میں اٹھ کر اندر ہی چلی گئی۔ سب ایک
ساتھ ہنس دیے۔

ہر قسم کی فکر اور خدشوں سے پاک۔

بے ریا، ہلکی پھلکی ہنسی۔

ہوا کہیں سے موتیوں کے پھولوں کی منک چرائی۔ چاندنی دھیرے سے گنگنائی۔ ست رنگے پروں والی
تلی اگر آنگن میں پکڑانے لگی۔

عالیہ کی آنکھیں نم ہو گئیں۔ ناصرو اپنی چار بیٹیوں کو رخصت کر کے بیٹھی تھیں۔ ان کے جذبات
سمجھ گئیں۔ ہولے سے ان کا کندھا دبایا۔ دونوں نے کچھ دور بیٹھی ہنسی مسکرائی بیٹیوں کو دیکھا۔ دونوں

کے جذبات ایک سے تھے۔

عالیہ نے چپکے سے سوچا۔

”ذیر سے سہی۔ مگر درست فیصلوں نے زندگی کا بو جھل پن کم کر دیا۔ یہ میرے آنگن کی تتلیاں تھیں۔ مگر انہیں اپنے رنگوں سے کسی اور گھر کے درو دیوار سجانے تھے۔ یہ میرے چمن کے پھول تھے۔ مگر ان کی خوشبو سے غمی اور آنگن کو مہکتا ہے۔“

یہی نصیب کا فیصلہ ہے۔

یہی خدا کا حکم۔

میرے آنگن کی تتلیوں۔

میرے چمن کو پھولوں۔

خدا! تمہارے رنگوں کی آب و تاب، تمہاری خوشبو کی تازگی برقرار رکھے۔

ہمیشہ سکھ کا جھولا جھولو۔

ہمیں ماں کے دل کی دعا ہے۔



یہ اک مکمل گھر کا خوبصورت منظر تھا۔ اس نے دو کپ چائے نکالی۔ کپ چھوٹی سی اسٹرابری والی ٹرے میں رکھے۔ کیتھی دھو کر سلیب صاف کی۔ ٹرے اٹھا کر بتی بجھائی۔ کچن کا دروازہ اچھی طرح بند کیا۔ گھر کی دیگر فالتو تہیاں بجھائی لاؤنج میں آگئی۔ لاؤنج کی نرم گرم فضا میں بی۔ وی چل رہا تھا۔ فلور کشن پر نیم اور انماہا ابھی تک دودھ کا گلاس سنبھالے بیٹھی ڈرامہ دیکھ رہی۔ بڑی بڑی خوبصورت آنکھیں ڈرامے کے کسی منظر میں گم تھیں۔ آہٹ پر اس نے گردن گھمائی۔ ماں کو دیکھتے ہی جلدی سے دودھ کا گلاس منہ سے لگا لیا۔

وہ صوفے پر کھیل اوڑھے لیٹا تھا۔

”جیو! سویت ہارٹ۔“

اس نے ٹانگیں سمیٹ کر اس کے لیے اپنے قریب ہی جگہ بنائی۔ وہ اس کا کپ دے کر اور اپنا سنبھالتی قریب ہی بیٹھ گئی۔ ٹرے تپائی پر رکھ دی تھی۔ اس نے اپنا مکمل مزید کھولا اور اس پر بھی پھیلا دیا۔ وہ ڈراما مسکرائی اور بیٹی کو دیکھنے لگی۔ وہ اپنا دودھ ختم کر چکی تھی۔ نیند سے بو جھل آنکھیں ڈرامہ کے اسرار میں الجھی تھیں۔

”ماہا! بس کرو۔ سونے کا وقت ہے۔ صبح اسکول کے لیے اٹھنے میں دس دس نعرے کرو گی۔“ ماں نے ٹوکا

تو وہ منہ بسورنے لگی۔

”می! ڈرامہ تو ختم ہونے دیں۔“

اس نے کھیل کے اندر سے ہولے سے اس کا ہاتھ تھام لیا۔ نرم گرم مانوس سانس وہ مسکرا کر چائے

کے کپ میں جھانکنے لگی۔

”ماہا! سو گئی ہے“ کچھ دیر کے بعد اس کی بھاری آواز پر اس نے چونک کر سر اٹھایا۔ ماہا ڈرامہ ختم ہونے سے پہلے ہی سو چکی تھی۔

”آج چاندنی رات ہے، اوپر چلیں۔“

”یار! بہت تھک گیا ہوں۔“ اس نے جمائی لی۔ وہ جانتی تھی اس کا شوہر واقعی بہت محنت کرتا ہے۔ اس وقت سو کر اسے فجر سے پہلے اٹھ کر زمینوں پر جانا ہے۔ بغیر ناراض ہوئے اس نے ماہا کو اٹھا کر دوسرے کمرے میں بیڈ پر لٹایا۔ لفاف ٹھیک کیا اور خود شال اوڑھتی باہر نکل آئی۔

”جلدی آنا۔“ اس نے شال کا کونا کھینچ کر کہا تو وہ اثبات میں سر ملاتی میڑھیاں چڑھتی اوپر آگئی۔ پورا چاند قریب ہی درخت کی پھنگ پر نکا تھا۔ وہ آہستگی سے چلتے ہوئے چھوٹی دیوار کے پاس آگئی۔ دور تک پھیلے کھیتوں اور امود کے بانوں پر اجلی چاندنی پھیلی تھی۔ سوری تھی اس نے دونوں ہاتھ شال میں چھپا لیے اور سر اٹھا کر روشن چاند کو دیکھنے لگی۔ اک خوبصورت، الوہی سی مسکراہٹ مستقل اس کے لبوں کا احاطہ کیے ہوئے تھی۔

”میں مسرت خاتون شادی کے اتنے برس گزر جانے کے بعد بھی بہت خوش اور مطمئن ہوں۔ برسوں پہلے خواہشوں کے گرداب سے نکل کر ماں باپ کا فیصلہ قبول کر کے جو آسودگی میرا نصیب بنی ہے، خدا ہر لڑکی کا مقدر کرے“ اس دن جب ابانے مجھے بلایا تو کتنی دیر میرا چہرہ دیکھتے رہے، پھر سوچا۔“

”تمہیں ہماری محبت پر شک ہے؟“

”ابا!“ میرا دل چاہا میں رو دوں۔

”میں جانتا ہوں۔ تمہیں اپنے گھر کا ماحول پسند نہیں۔ تمہیں یہاں کی پابندیاں بری لگتی ہیں۔ لیکن مسرت! یہ اس گھر کا ماحول ہے۔ اسے میں نے اور تمہاری ماں نے بنایا ہے۔ لیکن وہ گھر جہاں تم جاؤں گی، وہاں کا ماحول تمہیں اور شفیق کو مل کر بنانا ہے، تم دونوں بڑھے لکھے ہو، سمجھ دار ہو، یہاں کی خوبیاں اپنانا اور خامیاں دور کرنے کی کوشش کرنا، صرف اس بات کا یقین رکھنا کہ میں نے تمہارے لیے اک روشن خیال شخص کا انتخاب کیا، جو ہر اچھے کام میں قدم قدم پر تمہارا ساتھ دے گا۔ تمہیں لگتا ہے تمہاری ماں تم پر بے جا پابندیاں لگاتی ہے، وہ غلط نہیں تھی، نہ وہ پابندیاں بے جا تھیں، یہ بات تب سمجھ میں آئے گی، جب اس مقام کو چھو لو گی۔“

اور مجھے یہ بات اس وقت سمجھ میں آئی، جب میں نے ماہا کو پہلی بار گود میں لیا۔ میں نے ابا کے فیصلے پر سر جھکا دیا تھا۔ شفیق میرے اندازوں سے بڑھ کر خیال کرنے والا شخص نکلا، ہم نے اپنے گھر کو جدید شری انداز میں سجایا ہے، لیکن اپنی روایات سے منہ بھی نہیں موڑا۔ زندگی نے مجھے وہ کچھ دیا ہے، جس کی تمنا کوئی بھی لڑکی کر سکتی ہے، بشر کا سحر وہاں رہنے کے بعد ٹوٹ گیا، مجھے اپنی مٹی کی خوشبو اچھی لگتی ہے۔

آج شہر والے بچے سونو آنٹی کی طرف سے بھجوائی جانے والی سوغاتوں کے منتظر رہتے ہیں۔ چھٹیوں میں یہاں آنے کے لیے بے تاب ہوتے ہیں۔ لان میں لگے جھولے، باغ میں لگے مالٹے اور امرود۔۔۔ تربوڑ اور خربوزوں سے بھرے کھیت انہیں اپنی طرف کھینچتے ہیں۔

دور کھیتوں کے پار آگ کا لالہ روشن تھا، فضا میں تازہ بننے لگنے کی خوشبو گھلی ملی تھی، وہ ذرا سا مسکرائی اور شال پلٹتی نیچے چلی گئی۔

زندگی کی راہیں روشن اور واضح تھیں۔





”تمہیں.... تمہیں ایسا نہیں لگتا تیمور! اس شہر کے لوگ محبت کرنا بھول گئے ہیں۔“ یہ کہتے ہوئے اس کی نیلے سمندروں جیسی گہری آنکھوں میں خوف بادبانی کشتی کی طرح ڈولنے لگا تھا۔ تیمور نے گلاس وال پر پھسلتے بارش کے قطروں سے نظریں ہٹا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا، حالانکہ وہ اس لمحے ایسا کرنا نہیں چاہتا تھا۔ اس لڑکی کی آنکھوں میں ڈولتا خوف تیمور کو ہمیشہ اضطراب میں مبتلا کر دیتا تھا۔

”مجھے ایسا نہیں لگتا۔“ اس کا لہجہ سپاٹ سا تھا۔ نیلے سمندروں پر حیرت بارش کی طرح برس رہی تھی۔
 ”اب رشتوں میں مضبوطی محبت میں وفا اور دوستی میں خلوص نہیں رہا تیمور۔“
 ”یہ صرف تمہاری اپنی سوچ کے زاویے ہیں۔“

”غلط نہیں ہیں۔“ وہ تلخ سی ہو گئی۔ ”کیا تم نے دیکھا نہیں پھولوں میں وہ تازگی ہی نہیں رہی۔ پتوں کا رنگ سبز نہیں زرد رہنے لگا۔ پرندے چھمانا ہی بھول گئے ہیں۔ آسمان کا رنگ اب نیلا کیوں نہیں ہوتا؟ یہ اتنا فیالا اور زرد کیوں نظر آتا ہے۔ ہوا کے ہاتھ سے خوشبو کا دامن چھوٹ گیا ہے۔ زمین بانجھ ہو گئی ہے، اس کی کوکھ سے مٹی کی مہک جنم نہیں لیتی۔“

تیور کے موبائل پر پیغام آنے لگا تھا جبکہ وہ اب بھی کہہ رہی تھی۔

”تنتلیاں ہمارے شہر کا رستہ بھول گئی ہیں تیمور۔! پھولوں نے کھلنا ہی چھوڑ دیا ہے، ہر نئی صبح کی آنکھ میں کیسی عجیب سی بے زاری اور اکتاہٹ ہے۔ جیسے وہ اس زمین پر اترنا ہی نہ چاہتی ہو۔ رات کی اوڑھنی پر نئے ستارے کون فوج لے گیا ہے۔ چاند کی روشنی بہت مدہم ہو گئی ہے۔ کہیں چاند رات سے روٹ نہ جائے تیمور! جس طرح مٹی سے خوشبو اور پھولوں سے تنتلیاں روٹھ گئی ہیں۔“

تیمور نے پیغام پڑھ کر موبائل آف کیا اور سامنے بیٹھی لڑکی کو قدرے الجھن آمیز انداز میں دیکھا۔ وہ بولنے پر آتی تو یونہی اوٹ پانگ بولا کرتی تھی۔ شاید اسے خود بھی خبر نہ تھی کہ وہ کیا کہہ رہی تھی۔ اور خوف ان آنکھوں میں کنڈلی مارے بیٹھا تھا۔

”حقیقت پسند تاریخ عثمان! تم اکیسویں صدی میں سانس لے رہی ہو۔ دنیا تمہاری انگلیوں کی پوروں میں سمٹ آئی ہے اور تم چاند، ستاروں، پھولوں اور خوشبوؤں کے لیے پریشان ہو رہی ہو۔“

”حقیقت۔۔۔ یہی تو حقیقت ہے تیمور! آئندہ کی کہ اب رشتے مجبوری اور غرض کی بنا پر نبھائے جاتے ہیں۔ محبت برائے فروخت کا بورڈ سجائے پھر رہے ہیں ہم سب، کیا محبت جیسی بانٹنے والی چیز خریدی و بیچی جاسکتی ہے۔ ہمارے قول و فعل میں اتنا بھیانک تضاد آچکا ہے کہ میں سوچ کر ہی لرز جاتی ہوں۔ کہیں ہمارے اعمال ہماری سزا نہ بن جائیں۔“ وہ ایک دم سہم سی گئی تھی۔

تیمور ہتھیلی پر دباؤ ڈال کر کھڑا ہو گیا۔ اس کی اور ارتج کی آئس کریم پکھل کر پانی ہو گئی تھی۔ حالانکہ یہ ارتج کی ہی ضد تھی کہ وہ کافی کی جگہ آئس کریم کھائیں گے۔ مگر ہمیشہ کی طرح اس کی ذہنی رو بھٹک چکی تھی۔

ارتج نے سر اٹھا کر اسے دیکھا، مگر اس کے چہرے کے تاثرات ناقابل فہم تھے۔ سنجیدگی کے علاوہ کچھ اور بھی تھا جو وہ سمجھنے سے قاصر تھی۔ وہ خاموشی سے کھڑی ہو گئی۔ پھر معذرت خواہانہ لہجے میں بولی۔

”آئی ایم ساری تیمور!“

تیمور نے لب بھینچ کر اسے دیکھا۔ ہر روز پچھڑنے سے ذرا پہلے وہ خود سے وعدہ کرتا تھا کہ اب وہ اس لڑکی سے دوبارہ نہیں ملے گا۔ مگر ہر روز یہ عہد آفس کی کسی فائل میں پلیٹ کر اپنی بے تحاشا مصروفیت میں سے کچھ لمحے اس دماغی طور پر کھسکی ہوئی لڑکی کے ساتھ برباد کرنے آ جاتا تھا۔

”چلیں۔۔۔“ تیمور نے قدم بڑھا دیے۔ وہ خاموشی سے اس کے ہم قدم تھی۔ برستی بارش نے ان کا استقبال کیا۔

”دیکھو ارتج عثمان! آسمان اب بھی بارش برساتا ہے۔“

نجانے کیوں تیمور کے لبوں سے یہ جملہ پھسل گیا۔ ارتج نے ہاتھ پھیلا کر بوندوں کو اپنی گلابی ہتھیلی میں سمیٹا، انہیں دیکھا۔ پھر ہتھیلی اس کے سامنے کر کے بولی تو اس کی آواز میں ہلکی سی مایوسی در آئی تھی۔

”دیکھو! اب بارش کا پانی بھی شفاف نہیں ہوتا۔“ تیمور نے پانی میں بھیگتے گلابی رنگ کو دیکھا، پھر اس

کے ٹھنڈے بھیکے ہاتھ پر اپنا ہاتھ رکھ کر اس کے سامنے ہوا۔

”تم دنیا کو اس نظر سے کیوں دیکھتی ہو ارتج۔“

”تو کیسے دیکھوں؟“ اس کے لمبے میں تھوڑی سی بے بسی اور تھوڑی سی معصومیت تھی۔

”میری آنکھوں سے دیکھو۔“

ارتج نے نظر اٹھا کر اس کی آنکھوں میں جھانکا اور کچھ لمحے یونہی دیکھتی رہی۔

برستی بارش تھی اور خاموشی۔ اس کی گرفت میں اک نازک بھیگا سالحہ تھا۔ وہ اس کے سامنے تھی، جسے خبری میں اس کی نسبت کا عنوان بن گئی تھی۔

”کاش! میں یہ لمحہ چرالوں۔“ اک شدید خواہش اس کے دل میں جاگی، جسے ارتج کی آنکھوں میں اٹل آنے والی بدگمانی نے اڑا ڈالا، وہ کہہ رہی تھی۔

”جانتے ہو تیمور! مجھے تمہاری آنکھوں میں کیا نظر آتا ہے۔“

تیمور کا پورا وجود سماعت بن گیا۔

”سناک ایچینج کے اتار چڑھاؤ، حصص شیرز، ڈار کی قیمت۔“ وہ ہنستی چلی گئی، یہاں تک کہ اس کی آنکھوں میں نمی اتر آئی۔ تیمور کے اعصاب تن گئے۔ آنکھوں میں در آئی ڈھیر ساری نمی کو آستین سے صاف کرتے ارتج نے اسے دیکھا۔

”یہی موضوعات ہیں جن کے گرد تمہاری زندگی کے شب و روز گھومتے ہیں، تم یہی دیکھتے اور یہی سوچتے ہو۔“

”تمہارا مطلب ہے، میرے پاس کسی کو دینے کے لیے کچھ بھی نہیں۔“ اس کی آنکھوں اور لمبے میں ہلکی سی خفگی در آئی۔

”تمہارے موبائل کی بٹری اور گھڑی پر دوڑتی نگاہ بتاتی ہے تمہارے پاس کسی کو دینے کے لیے کوئی ایک خالص لمحہ بھی نہیں۔“ نجانے کیوں وہ اتنی سفاک ہو گئی تھی۔

”خالص لمحہ؟“ تیمور کی استغنامیہ نگاہیں اس کے چہرے پر گڑ گئیں۔

”جس لمحے تم جس کے ساتھ ہو تو پورے کے پورے اسی کے ساتھ ہو۔“ اس نے آہستگی سے اپنا ہاتھ اس کی گرفت سے آزاد کرالیا، ان کے قریب پیڑ سے ٹیک لگا کر بارش کے رکنے کا انتظار کرتے شخص نے ایک دم گھوم کر ان کی طرف دیکھا۔ ارتج بارش کی اوٹ میں گم ہو گئی۔ تیمور آفندی اسے روک کر کہنا چاہتا تھا۔

”ہاں! میں زندگی میں کبھی کسی کو کوئی خالص لمحہ نہ دے سکا۔ مگر وہ ایک لڑکی ہے ارتج عثمان۔ میں اس سے جس لمحے ملتا ہوں تو پورا کا پورا اسی کا ہوتا ہوں۔“ مگر وہ جانتا تھا اس کا بدگمان دل کبھی اعتبار نہ کرے گا۔

”مگر یہ کیسے ممکن ہے؟“

بارش میں اپنے قدم بڑھاتے ہوئے تیمور آندی نے بے حد حیرت سے سوچا تھا۔
 ”جو اس شدت سے محبت کا متلاشی ہو وہ محبت کو پہچان نہ سکے۔ کیا محبت لفظوں کی محتاج ہے؟“



میں نے پہلی بار اسے بارش کی اوٹ سے دیکھا تھا۔ وہ کون تھی۔ کہاں سے آئی تھی۔ مجھے تو ساون کا بادل لگی۔

زمین کی کوکھ سے جنم لیتی مٹی کی خوشبو جیسی۔ بہت ہی ناخالص حلیے میں بہت ہی خالص لگی تھی مجھے۔

مجھے لگا۔ بارش کی اوٹ میں محبت انسوئی سی خواہش اوڑھے کھڑی تھی۔

”جس لمحے تم جس کے ساتھ ہو تو پورے کے پورے اسی کے ساتھ رہو۔“

میں پورے کا پورا اس کی سمت گھوم گیا۔ شاید یہ خواہش میں اس کی آنکھوں میں پڑھنا چاہتا تھا۔ مگر بارش میرے اور اس کے درمیان چادر کی طرح تن گئی۔ زندگی میں پہلی بار مجھے برستا ساون اتنا برا لگا۔

’جانے کہاں سے آئی تھی۔ کہاں چلی گئی۔ ساون کے بادل اپنے نشان تو نہیں چھوڑتے۔

میں نے پلٹ کر اس خبر کو شخص کو دیکھا۔ میرے اندر رنا گواری کی لہری اٹھی۔ میرا دل چاہا اپنے ہاتھ کو مگھورتے آنکھوں میں بے تحاشا تحیر لیے کھڑے اس شخص سے پوچھوں۔

”اتنی خالص لڑکی کے پاس تنہا کیوں نہیں آئے، کسے ساتھ لے آئے تھے کہ وہ یوں خفا ہو کر چلی گئی اور کیا وہ ایسی تھی کہ تم اس کی خفگی مول لے سکو۔“

مگھوہ شخص وہاں سے چلا گیا۔ شاید اسے خود بھی ”تنہا“ نہ آنے پر افسوس تھا۔ جب بھی ساون کے بادل پچھتم سے جھوم کر اٹھتے ہیں، میرے قدم بے اختیار اسی رستہ پر ان کے سامنے جا رہے ہیں۔
 مگر اس دن کے بعد وہ کبھی نہیں آئی۔

”مگر میں۔۔۔“

میں اب بھی وہیں کھڑا ہوں۔

’جانے کیوں؟‘



نیم تاریک کمرے میں اے سی کی کولنگ تھی۔ شیشے کی کھڑکیوں اور دروازے پر دبیز پردے پڑے تھے۔
 پتے ذہن کو تند و تلخ سوچوں کے نوکیلے پنچوں سے چھڑانے کی سعی کرتے ہوئے اس نے کروش بدلی تو نگاہ
 کرسٹل کی ڈائننگ گرل پر جا ٹھہری۔

پند لمحے چپکے سے یونہی ٹھسک گئے۔ تب اس نے ہاتھ بڑھا کر مٹن دیا۔ یاد ہم میوزک گونجا۔ نیلا گوں

روشنی نے بڑھ کر گڑیا کو اپنے حصار میں لیا۔ وہ دونوں باز آسمان کی سمت اٹھائے اک دائرے میں گھومنے لگی۔

اسے اپنا آپ بھی کر شل کی گڑیا ہی لگا۔ کتنے برس گزر گئے اسے ایک ہی دائرے میں چکراتے ہوئے۔ کبھی ایسا بھی ہو کہ یہ زندگی وقت کے سود و زیاں سے باہر نکل کر مسکرائے۔ کبھی تو دل کے لبوں پر وہ ہنسی

پھوٹے جو بہار کی اولین خوشبو بھری سماعتوں سے بو جھل ہو۔ بظاہر بو جھل، درحقیقت بے حد ہلکی پھلکی اور معطر کہ خوشبو بو جھ نہیں ہوتی۔

وہی انہونی سی خواہش۔

اور جب بھی اسے گمان ہو تاکہ اس کے احساسات اور اس کے اندر پھونٹی محبت، خالص محبت کی خواہش کر شل کی گڑیا کی طرح جامد، پتھر پٹی اور ٹھنڈی ہو گئی ہے۔ ایسی ہی کوئی خواہش۔ انہونی سی خواہش اس کے اندر سراٹھانے لگتی۔ پھر وہ لاکھ چاہتی کہ اس انہونی خواہش کو پلیٹ کروا کر روپ کے سب سے آخری خانے میں رکھ کر بھول جائے۔ مگر اس کے اندر طلب جاگتی تو پھر پھیلتی چلی جاتی۔ اور سب کتنی خیرت کے ساتھ پوچھا کرتے تھے۔

”ارتج عثمان کس دنیا کی باسی ہے۔“

اور بہت دور تئلیوں کے دس میں وانلن کی دھن پھیلنے لگتی۔ وانلن۔ جس کے سر ہمیشہ محبت میں ڈھل کر دکھ روتے تھے۔ اور ارتج عثمان نے یہ دھن کئی مرتبہ سنی تھی۔

”کہاں۔۔؟“

شاید خواب میں، یہ دھن ہمیشہ اس کے اندر گونجتی تھی۔ مگر وہ یہ سب کسی سے کہہ نہیں سکتی تھی۔ سب ہنس دیتے۔ مذاق اڑانے لگتے۔

”دیکھو! ارتج عثمان پاگل ہو گئی ہے۔ اسے خوابوں میں اک انجانی دھن سنائی دیتی ہے۔“

جب پہلی بار اسے یہ دھن سنائی دی تو جم کے ہاں ڈرائی فروٹ میں سے کا جو چھتے ہوئے وہ بے اختیار زگر کر بیٹھی تھی۔ جم نے اپنا وانلن اس کی طرف بڑھائے ہوئے کہا تھا۔

”کیا تم وہ دھن بجا سکتی ہو۔“

جم سنجیدہ تھا، مگر باقی سب ہنس دیے تھے۔ اس کا چہرہ خفت سے سرخ ہو گیا تھا وہ جانتے تھے ارتج وانلن بجانا نہیں جانتی۔

بات تو کچھ بھی نہ تھی۔ مگر مذاق اڑانا ان کی عادت تھی، جہاں جم کے خواب ڈیڑھی مور اور بیلا کے ٹام کروڑ سے آگے نہ جاتے تھے وہاں ارتج عثمان کو خواب میں انجانی دھن سنائی دیتی تھی۔ ان کے لیے تو باعث

حیرت بھی تھا۔ اور چہرہ برس گھرنے کے بعد وہ ان کو یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اس کے خواب آج بھی اس دھن کے اسرار میں گرفتار ہیں۔

وہ یہ بات تیمور آفندی کو بھی نہیں بتا سکتی تھی۔ وہ ہنستا نہیں، مگر اپنی آنکھوں میں ہلکا سا تبسم لیے وہ اس کی طرف جھک کر کہتی۔

”لی پریٹیکل اریج عثمان۔“

تو اسے یہی لگتا کہ اس کا تمسخر اڑایا جا رہا ہے۔

نجانے وہ اتنی نازک مزاج کیوں تھی۔ اور بہت بے اعتبار بھی۔

شاید اس کا مختلف ہونا اسے سب سے دور لے گیا تھا۔

جب بچپن میں سب فرینڈز، ویڈیو گیم یا انٹاری کے دیوانے تھے۔ آیا کی نظر بچا کر چپکے سے بھری دوپہر میں لان میں نکل آتی۔ اسے اس برف رنگ تیلی کا انتظار رہتا جو برف کی جھیل سے رستہ بھول کر سرخ گلابوں کے کنج میں نکل آتی۔ اور اریج عثمان کی ننھی، تھیلیوں پر اس کے پروں کو چھونے کی خواہش کی جگہ محض انتظار باندھ کر لوٹ گئی۔ اور وہ ہر روز اسی خواہش اور انتظار کو سنبھالے سرخ گلابوں کے کنج میں آ بیٹھتی تھی۔ اور جب تک مزاج گورنس اسے ڈھونڈتے ہوئے وہاں تک آتی اور اسے سادھوؤں کی طرح آلتی پالتی مارے پھولوں کو گھورتی پاتی تو ایک دم چیخ اٹھتی۔

”اوہ بے بی“ آریو میڈ۔ واٹ آریو ڈونگ ہیئر“ اتنی گرمی اور دھوپ۔ اگر ممانے دیکھ لیا۔ بلکہ ہم ان سے تمہاری شکایت کرے گا۔“

”پلیز روزی۔ میں سفید تیلی۔“ وہ التجا کرنا چاہتی، مگر گورنس اسے بازو سے گھسیٹ کر اندر لے جاتی۔ امپورنڈ شیپو اور صابن سے نہلا دھلا کر اسے خوبصورت سفید فراق پہنا دیتی۔ ایک پل کو اسے غور سے دیکھتی، پھر اس کا گلابی گال چھو کر کہتی تھی۔

”تم تو خود سفید تیلی ہو، بے بی۔“

But I have no wings (لیکن میرے تو پر ہی نہیں ہیں) اریج کے اندر افسردگی سی اتر آتی۔

دروازہ ایک دم کھلا تو اس نے یوں چونک کر ادھر ادھر دیکھا، جیسے اپنے یہاں موجود ہونے پر حیران ہو رہی ہو۔

”اریج، لیائی لو۔“

اس نے اک طویل سانس لے کر بٹن آف کیا۔ گڑیا ایک دم ساکت ہوئی تو اسے لگا پورا کمرہ خالی ہو گیا۔

”تم ابھی تک بستر پر ہو۔“ ممانے پیار بھری غفلت سے اسے گھورا اور وہ سوچنے لگی، ممانے کے لہجے میں شیرینی کا سبب کیا ہو سکتا ہے۔

”طبیعت تو ٹھیک ہے جانو۔“ انہوں نے آگے بڑھ کر اس کی پیشانی کو دھیرے سے چھوا، اک اجنبی سا لمس اس کو پیشانی پر محسوس ہوا۔

”آئی ایم فائن مئی۔“ اس نے پیچھے ہٹ کر بیڈ کی پشت سے ٹیک لگا کر انہیں دیکھا۔ بلیک ساڑھی، ڈائمنڈ کاسیٹ، فریش میک اپ اور جدید ہیشو اسٹائل میں وہ بہت تروتازہ، ٹیک اور اسمارٹ لگ رہی تھیں۔

”یو آر لکنگ سوسوٹ مئی۔“ وہ بے اختیار گویا ہوئی۔

”تھینک یو ڈارلنگ۔“ وہ نزاکت سے مسکرائیں۔

”آج تو فنکشن میں آپ کے سوا کوئی نہیں ہوگا۔“ اس نے لاڈ سے دونوں بازو ان کے گلے میں سما کر کیے۔ ”سرسبز فوڈ تو جل کر راکھ ہو جائیں گی۔“

”یو آر اسٹ ڈیر۔“ مئی نے آنکلی سے اس کے بازو گلے سے نکالے۔ ارتج شرمندہ ہو گئی۔ شاید وہ ہمیشہ کی طرح اورور ہو گئی تھی۔ لیکن وہ بھی کیا کرتی؟ اسے آج تک محبتوں میں حد بندی کرنا نہیں آئی تھی۔ وہ تو جس سے محبت کرتی اسے بے حد حساب چاہتی تھی۔

”لیکن تم ابھی تک تیار نہیں ہوئیں۔ ہم آل ریڈی لیٹ ہیں جانو۔“ مئی نے گھڑی پر نگاہ دوڑائی۔

”مجھے کیس جانا تھا مئی۔“

”ارتج! آج تمہارے انکل عباس کی شادی ہے۔“ مئی نے بے حد خفگی سے اسے دیکھا۔

”اوہ۔“ وہ ہوں چونکی جیسے بالکل بھول گئی تھی۔ حالانکہ اسے اچھی طرح یاد تھا۔ روزی نے اسے مئی کے پار لر جانے کے بعد بھی یاد دہانی کرائی تھی۔

”سوری مئی! میں بھول گئی۔“ اس کا لہجہ شرمندگی سے عاری تھا۔

”ارتج۔!“

”مئی! اب تو خاصی دیر ہو گئی ہے۔“

”بالکل دیر نہیں ہوئی۔ تم فوراً اٹھو اور تیار ہو جاؤ۔“ انہوں نے تحکمانہ لہجے میں کہا۔

”مئی! آپ فارینہ کو لے جائیں۔ میرا موڈ نہیں ہے۔“ ارتج کے لہجے میں بیزار سی دور آئی۔

”فارینہ عمر کے ساتھ جا چکی ہے۔ اور میں کوئی ایسکیموز نہیں سنوں گی۔ وہاں سب تمہارا پوچھیں گے۔“

”کوئی نہیں پوچھے گا مئی! وہاں کسی کو کسی کی پروا نہیں ہوتی۔“ اس نے لا پرواہی سے کہہ کر ٹی وی کا رییموٹ کنٹرول اٹھالیا۔

”تم خود انہیں نظر انداز کرنے لگی ہو۔ نجانے کن خیالوں میں کھوئی رہتی ہو۔ حلیہ دیکھا ہے اپنا کتنا عرصہ ہو گیا ہے۔ تم نے پارلر کا چکر نہیں لگایا۔ تمہیں تو یہ بھی خبر نہیں کہ تمہارے بالوں کا حشر ہو چکا ہے! لوگ مذاق اڑاتے ہیں تمہارا ارتج۔“ مئی کو ایک دم غصہ آ گیا تھا۔

”ممی! غصہ مت کریں۔ اسکن پر سلوٹیں پر جائیں گی۔“ وہ بے حد آرام سے گویا ہوئی۔ ممی کے چہرے سے غصہ ایک دم کانور ہو گیا، ”ارتج! مجھ سے ہنسنا سیکھو۔“

”پر اس آگلی بار چلی جاؤں گی۔“

”واٹ نان سنس۔“ ممی کھڑی ہو گئیں۔

”ممی! شائستہ آئی میں کیا برائی تھی۔ جو عباس انکل نے دوسری شادی کر لی۔“ ارتج نے بے اختیار

سوال کیا۔

”یہ ہمارا ہیڈک نہیں ہے ارتج! تمہیں چلنا ہے تو۔“

”سوری ممی! میں وہاں خود کو مس فٹ محسوس کروں گی۔“

ممی کچھ لمحے اسے غصے سے گھورتی رہیں، پھر سر جھٹک کر بنا کچھ کہے باہر نکل گئیں۔

ارتج بیہوشانہ مسلتے ہوئے اٹھی۔ روم ریفریجریٹر سے اورنج جوس کا پیک نکال کر وہ گلاس ونڈو کے قریب آگئی۔ پردے کھینچ کر اس نے دھرتی پر اترتی رات کے ابتدائی قدم گنتے ہوئے عباس اور شائستہ کو سوچا۔ یہی انکل عباس تھے جو اک ڈنر پارٹی میں شائستہ فیوز کو دیکھ کر اپنا آپ بھول گئے تھے۔ دو سال کا دھواں وار عشق ان کی شادی پر جا کر رکا۔ اور آج جوی انکل عباس کہتے تھے۔ انہیں لائبہ فہیم کی سیاہ آنکھوں نے لوٹ لیا۔

”کیا محبت دوبارہ ہو سکتی ہے۔“ اس سوال سے قبل اسے اس سوال کا جواب ڈھونڈنا تھا۔

”کیا محبت مر سکتی ہے۔“ تین سال کے عرصے میں اپنا وجود کھودینے والے جذبے کو محبت کہا جاسکتا ہے۔“

اور نجانے کیوں اس سوال کا جواب ڈھونڈنے کے لیے اس نے گاڑی کی چابی اٹھائی اور اسی حلیمے میں ”عباس ولا“ پہنچ گئی۔

”آؤ ہنی! تم یہاں کیسے؟“ شائستہ کی مسکراہٹ سے بوجھل پلکوں کے نیچے براؤن آنکھوں میں تحیر سا جاگا۔ دوسرے بل وہ تحیر طنز میں بدل گیا۔

”تمہیں تو اس وقت اپنے انکل کی شادی کا فنکشن اینڈ کرنا چاہیے تھا۔“ اس نے لپ اسٹک کے لباس سے ہم رنگ شیڈ چیک کرنے شروع کر دیے۔

وہ ششدر سی کھڑی اس عورت کو دیکھتی رہی جس سے اپنے ذہن میں اند آنے والے سوالوں کا جواب لینے آئی تھی۔ سرخ سیلوئس میکسی میں بھرپور میک اپ کو وہ فاسٹ ٹیچ دے رہی تھی۔ ہم رنگ لپ اسٹک سے اس کے گداز بھرے بھرے ہونٹ دھنکے لگے تھے وہ اب بھی قیامت تھی۔

بالوں سے رولر اتارتے ہوئے اس نے ڈرینگ ٹیبل کے آئینے میں اپنے عقب میں کھڑی سارکت و صامت اور گرم صم سی لڑکی کو دیکھا۔

”میں اب بھی سمجھ نہیں پائی ہوں کہ تم اس وقت یہاں کیا کر رہی ہو؟“ ارج نے چاہا وہ اپنے ذہن میں ابھرتے سوالوں میں سے کوئی ایک سوال اس کے سامنے رکھے۔
کوئی ایک گرہ تو کھلے۔

کوئی ایک الجھن تو سلجھ جائے۔
مگر اس کے سارے سوال پرندوں کی طرح اڑ گئے۔ بس خالی آسمان تھا اور باقی رہ جانے والی پھر پھر اہٹ۔

”وہ بدھا سمجھتا ہے شائستہ اس کے بغیر مر جائے گی۔ ہونہ۔ مائی فٹ۔ ہزاروں موائے آج بھی میرے طلب گار ہیں۔ میں دکھا دوں گی اسے۔“
وہ ہیر برش سے بال سنوار کر کھڑی ہو گئی۔ ذرا سالہا کر اس نے اپنے قیامت ڈھاتے حسن کو آئینے میں دیکھا اور تقاخر سے مسکرائی۔

”کیوں ڈارلنگ! میں کچھ غلط کہہ رہی ہوں۔“
”آپ۔ آپ تو محبت کرتی تھیں ان سے۔“ وہ بمشکل کہہ پائی شائستہ کا نفرتی قہقہہ بید روم کی خاموش فضا میں گھم گیا۔

”کرتی تھی میری جان! مگر اب لگتا ہے وہ صرف میری حماقت تھی۔ جلد بازی میں کیے جانے والے فیصلے ایسے ہی ہوتے ہیں۔ اس شخص نے مجھے کریڈٹ کارڈ کی طرح استعمال کیا۔ میں نے بھی اسے ٹشو پیپر کی طرح ڈسٹ بن میں نہ پھینکا تو میرا نام شائستہ نہیں۔“
تلخ لہجے میں کہتے ہوئے اس نے اپنا چھوٹا سا پرس اٹھایا۔ تب ہی ملازمہ دستک دے کر آئی۔

”بیگم صاحبہ! جواد آپ کا گاڑی میں انتظار کر رہے ہیں۔“
”آتی ہوں۔“ اس نے پلٹ کر ایک بار پھر تنقیدی نگاہوں سے اپنا جائزہ لیا۔ پھر ارج کی طرف پلٹی۔

”سوری ڈیر مجھے جانا ہو گا۔“
”میں بھی چلتی ہوں۔“ وہ آہستگی سے گویا ہوئی۔
”ارج بچو! شائستہ نے آہستگی سے اس کا کندھا تھپتھپایا۔
”ہمارے طبقے کا مرد محبت نہیں کرتا۔ وہ محبت کر ہی نہیں سکتا۔ یہ صرف ضرورت کے رشتے ہیں تم یہ فیصلہ بہت سوچ سمجھ کر کرنا لیکن۔“ وہ ذرا سا مسکرائی۔
”تیور اچھا لڑکا ہے اور مختلف بھی۔“ شائستہ نے اس کا گال تھپتھپایا۔ اور گڈبائے کہتے ہوئے باہر نکل گئی۔

وہ خاموشی سے کھڑی سوچتی رہی شائستہ نے تیور کا ذکر کیوں کیا۔ ست روی سے چلتی ہوئی وہ گاڑی تک چلی آئی۔

”لیکن میں نے تیمور کے بارے میں ایسا کبھی نہیں سوچا۔“ دروازہ کھولتے ہوئے وہ زیر لب بڑبڑاتی۔
 ”تو کیا تیمور۔“ اس کا ذہن عجیب سی سوچوں کی آماجگاہ بن گیا تھا۔

بہت دیر تک تاریک سڑکوں پر گاڑی دوڑانے کے بعد بھی اس کا دل گھر جانے کا نہ چاہا تو وہ جمشید کی طرف آگئی۔ گھٹ چوکیدار نے کھولا۔ جمشید اپنے چھوٹے سے خوبصورت لان میں تنہا بیٹھا تھا۔ اس کا وانٹن بے حد خاموش سا گھاس پر پڑا تھا۔ اس کے گرد پھیلی اشیاء بتاتی تھیں وہ سب کچھ لمحے قبل یہیں تھے۔

”ہائے جم!“ اپنے سامنے رکھے خالی گلاس کو بھرتے ہوئے جمشید نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔ اور مسکرایا۔

”ہائے ارتج! تم تو دوستوں کو بھول ہی گئی تھیں۔“

”ایسی تو کوئی بات نہیں۔ کہاں گئے سب لوگ۔“

”ہارون اور جنون کا کنسرٹ ہے۔“

”وہ۔۔۔ مجھے کسی نے بتایا ہی نہیں۔“ اس نے نجانے کیوں شکوہ کیا۔ جمشید نے سراٹھا کر بے حد حیرت

سے اسے دیکھا۔ وہ نظریں چراگئی۔ جمشید نے بھی کچھ نہیں کہا۔

”کچھ لوگ۔“ بہت دیر کے بعد جمشید نے پوچھا۔

”نہیں۔“

”تیمور کیسا ہے؟“

”مجھے کیا معلوم؟“ وہ چڑکربولی۔

”کیا ہوا؟“ اس کا مزاج عجیب تو تھا۔ مگر آج بالکل ہی بدلا ہوا تھا۔

”میں تیمور کی سیکریٹری نہیں ہوں۔“ وہ بگڑ کر بولی۔

”ہی از یور ہسٹ فرینڈ۔“

”جسٹ ایریلو ج۔“

جمشید کچھ لمحے اسے دیکھتا رہا۔ ”وہ تمہاری بہت کیر کرتا ہے ارتج۔“

”سو واٹ۔۔۔ تم نہیں کرتے۔“

جمشید خاموشی سے اسے دیکھتا رہا۔

”تم نے کسی سے محبت کی ہے ارتج۔“ اس نے ایک دم پوچھا اور محبت کا جو روپ وہ ابھی دیکھ کر آئی

تھی اس کا دل چاہا دل کھول کر قہقہہ لگائے مگر وہ بند لیوں سے اسے دیکھتی رہی۔ شاید محبت کی اتنی توہین

گوارا نہ تھی۔

”مجھے محبت ہو گئی ہے ارتج۔“ وہ اس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بولا۔ ارتج محسوس کرتی تھی پلکیں

بھی نہ جھپک سکی۔ حالانکہ وہ پوچھنا چاہتی تھی۔
 ”چھ ماہ قبل تمہیں سنہری بالوں والی لینا سے بھی محبت ہوئی تھی۔“
 ”مجھے رباب سے محبت ہو گئی ہے ارتج۔“
 نجائے کیوں ارتج کو لگتا تھا یہ داخل نواز ایک سچا عاشق ضرور ہوگا، مگر شاید وہ سارے اندازے باندھتی
 ہی اسی لیے تھی کہ وہ غلط ثابت ہوں۔



وہ کب سے لیمنیڈ کا گلاس ہاتھ میں لیے وسیع و عریض لان میں برستے چھابوں چھاج ساون کو دیکھ رہی
 تھی۔ سیاہ کوتار کی سڑک پر بارش آزادانہ ہوا کی پائل باندھے محور قص تھی۔ یہاں اس کی تنہائی میں نخل
 ہونے والا کوئی نہ تھا۔

اسے بارش کی بوندوں میں اداسی ٹپکتی سنائی دی۔
 تیز ہوا ناراض ہو کر پھولوں سے الجھنے اور ان کے پیراہن بکھیرنے لگی۔
 ساون میں سرما کی جھڑی جیسی اداسی تنہائی اور بیزاری نہیں ہوتی۔ وہ تو امید بھرا انتظار ہے۔
 خوشی کا دوسرا رنگ۔

جلتی بلتی زمین کا قرار۔
 بے زار اور ٹھکے، تپتی بنوں کا سکون۔
 ساون کی تیز بارش میں کہیں دور بسنے والے محبوب کا انتظار نہ ہو تو ساون بے کار۔
 اس کی تیز بو چھار میں کسی کنواری کے گلابی بدن کا رنگ نہ گھلے تو ساون بے رنگ۔
 مسکھوں کی چنچل ہنسی، آم اور جامن پر پڑے جھولے نہ ہوں تو ساون پھیکا۔
 پیڑوں کی گیلی شاخیں اوڑھ کر کوئی کوئل کسی کے من میں ہو کہ نہ جگائے تو ساون اداس۔
 اس نے باہر برستی بے رنگ، پھیکی اور اداس بارش کو دیکھا۔
 ساون میں تو بانٹ لینے کی خو ہے۔ شیر کرنے کی کیفیت۔ وہ زمین سے اس کی تپش بانٹ لیتا ہے۔ محب
 سے محبوب کا انتظار۔

کسی کی آنکھ جو اداس ہے تو وہ اس آنکھ میں نمی بن کر پھیل جائے گا۔
 کوئی ترس رہا ہے تو کھل کر برس جائے گا۔
 ارتج کا دل چاہا وہ باہر نکل جائے۔
 ہنسنے لگا، شور کرے۔

اس کی اداسی ساون کی ساری اداسی بانٹ لے۔

اس کا دل لاکھڑا سیور پر نکل جانے کو چاہ رہا تھا۔
مگر ساری خواہشیں پوری ہونے کے لیے تو نہیں ہوتیں۔ ممانے سختی سے منع کیا تھا۔
”دکاش تم کہیں اور برس جاتے۔“
اسے بارش کی ناقدری کا دکھ سا ہوا۔

بچپن میں جب سرمئی بادل کھل کر برستے تو بارش میں بھینکنے کی ہوک اسے لان کی طرف کھینچنے لگتی۔
مالی کی بیوی چولہے پر کڑا ہی چڑھائے چھوٹے چھوٹے پکوڑے تیلنے لگتی۔ اس کے ہر سائز کے چھوٹے
بڑے بچے بارش میں چھپا چھپا ادھر سے ادھر بھاگتے اور وہ بھی سب سے نظر بچا کر وہیں نکل آتی۔
چولہے کے پاس پھسکڑا مار کر پکوڑے کھانے مگر وہ خوشی بس لمحاتی ہوتی۔ اسے ڈھونڈنے سارے گھر میں
ملازم دوڑ پڑتے۔ اور روزی کسی جن کی طرح کو ارٹھ کے برآمدے میں نمودار ہوتی۔
کبھی جو ممام موجود ہوتیں تو اپنا سر پیٹ لیتیں۔

”کیا ملتا ہے تمہیں ان جاہل ان پڑھ اور گندے لوگوں میں بیٹھ کر۔“
اور وہ اس وقت اتنی چھوٹی تھی کہ یہ نہیں بتا سکتی تھی کہ اسے گندے لوگوں میں بیٹھ کر کیا ملتا ہے۔
”سارے کپڑے بھگو لیے ہیں اگر بیمار ہو گئیں تو۔۔۔ روزی چھینچ کر او اس کو۔“ وہ چیخ کر کہتیں۔ پھر زیر
لب بڑبڑاتیں۔

”کیسا عجیب مزاج ہے اس لڑکی کا۔۔۔ شاید میں نے ہی غلطی کی۔“ نجانے انہوں نے کون سی غلطی کی
تھی۔ اس کے اندر تو ایک ہی سوال مچلتا رہتا جواب بھی یونہی اس کے لبوں تک آگیا تھا۔

”ساون میں نہا کر بھی کوئی بیمار ہوتا ہے می۔“ دوسرے پل اسے اپنی حماقت کا احساس ہوا۔ می نے
اسے بری طرح گھورا۔

وہ وہاں ہوتے ہوئے بھی وہاں نہیں تھی۔ وزنہ خبر تو ہوتی کہ کمرے کا ماحول کب تبدیل ہو گیا۔ خوش
گہیوں میں مصروف افراد کے تیور کیوں بدلے۔ اول تو ان کا اکٹھے ہونا ہی حیران کن تھا۔ عامر بے حد سنجیدہ
تھا۔ فارینہ بے حد خفا اور ممالے حد خوش فاریہ کو کچھ سمجھاتی ہوئی۔

”لیکن یہ سب بہت جلد ہو رہا ہے۔ میں اس کے لیے مینٹلی تیار نہیں ہوں۔“ نک چڑھی فاریہ اس
وقت پریشان اور بوکھلائی ہوئی تھی۔

”نواہ ٹھیک ٹھاک عرصہ ہوتا ہے۔ خود لو تیار لو۔“ ماما کے لہجے میں اطمینان ہی اطمینان تھا۔
”مگر ابھی ہمیں ورلڈ ٹور پر نکلنا تھا۔“ اس نے رد طلب نگاہوں سے عامر کی سمت دیکھا۔ وہ کندھے
اچکا کر رہ گیا۔

”بعد میں اس قابل رہ جاؤں گی۔“ وہ تنک کر بولی۔
”تمہیں کچھ نہیں کرنا فاریہ۔“ ممانے محبت سے اس کا ہاتھ تھاما۔

”ابھی مجھے کچھ نہیں کرنا۔“ فارینہ طنز یہ انداز میں کہہ کر اپنا ہاتھ چھڑا کر کھڑی ہو گئی۔
 ”میں خود اکرٹز دیا سے بات کروں گی۔“

”تمہیں کسی سے بات کرنے کی ضرورت نہیں ہے فارینہ۔“ ممی کالج بے حد سخت تھا۔ فارینہ نے عامر کو دیکھا اور پاؤں پچختی ہوئی باہر نکلی گئی۔ عامر اس کے پیچھے لپکا تھا۔ مگر ممی کی آواز پر رک گیا۔ وہ تھکمانہ لہجے میں کہہ رہی تھیں۔

”مجھے یہ بچہ چاہیے عامر! اس لیے تمہیں اور فارینہ کو کچھ کرنے کی ضرورت نہیں ہے۔“
 ”جی ممی! وہ آہستگی سے کہہ کر باہر نکل گیا۔

”بچہ۔“ ارتج بری طرح چوکی۔ پھر ممی کی طرف پلٹی۔
 ”ممی! اس بچے کی بات کر رہی ہیں آپ؟“ ممی نے مسکرا کر کرسی کی بیک سے سر ہٹا کر آنکھیں موند لیں اور اطمینان بھرے لہجے میں گویا ہوئیں۔

”بچی! از پریمینٹ۔“
 ”ریٹلی ممی! وہ جوش میں ان کے قریب آ بیٹھی۔ ”ڈینس گریٹ“ سے واقعی بے حد خوشی ہوئی تھی۔
 ”فارینہ تیار نہیں ہے۔ جھنجھٹا کتنی ہے! احمق۔ اسے ابھی اندازہ ہی نہیں کہ ماں بننا کیا ہے؟“

”نفرت یہ تو میں ہونے نہیں دلاں گی۔ یہ بچہ اس دنیا میں ضرور آئے گا۔“ وہ مصمم لہجے میں گویا ہوئیں۔
 ”ممی! آپ گرینڈ رن جاؤں گی۔ اتنی جلدی۔“ وہ جانتی تھی ممی اپنی عمر کے بارے میں کتنی کونفئس ہیں۔
 ”کوئی بات نہیں، مجھے اچھا لگے گا۔“

ارتج نے حیرت سے اسے دیکھا۔ میک اپ سے مبرا دھلا دھلا چہرہ، چہرے کے نقوش میں اکسانوس نرمی کا سا تاثر۔

اسے پہلی بار سامنے بیٹھی عورت مل گئی۔

”اور تم نے کیا سوچا ہے ارتج۔“ وہ بہت دیر تک یونہی انہیں دیکھتی رہتی، اگر ممی بول نہ اٹھتیں۔
 ”کس بارے میں؟“ وہ پیچھے ہو کر بیٹھ گئی۔

”شادی کے بارے میں عامر تم سے چھوٹا تھا مگر اس نے شادی کر لی اپنے بھائی کا بزنس بھی سنبھال لیا اور تم وہیں کی وہیں ہو ارتج۔“ ممی نے بہت سالوں سے اسے اس کے حال پر چھوڑ رکھا تھا، آج پھر گھبر کر بیٹھ گئیں۔

”میں نے ابھی کوئی فیصلہ نہیں کیا ممی!“ وہ کیونکس کھینچنے لگی۔
 ”تو فیصلہ کیوں نہیں کر لیتیں، کتنے لوگ تم میں انٹرسٹڈ تھے مگر تمہاری بے اعتنائی و بے رخی کی وجہ سے سب ہاتھ سے نکل گئے۔ آخر تم چاہتی کیا ہو۔ یونیورسٹی تم نے چھوڑ رکھی ہے کہ موڈ نہیں، آفس تم نہیں

جانتیں کہ برنس تمہارا مزاج نہیں اور کچھ نہیں تو شادی ہی کرلو۔
 ”شادی ضروری ہے مئی؟“ وہ بے زاری ہو گئی۔

”بہت ضروری ہے اور اس بات کا ادراک تمہیں تب ہوگا جب میں نہیں رہوں گی۔“ مئی زور دے کر بولیں۔

”مئی پلیز! انو اموشنل بلیک میلنگ۔“

”ارتج مائی لو۔“ انہوں نے محبت سے اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا۔

”تمہارے پیار کے بعد ان کا برنس میں نے سنبھالا تھا، ورنہ سب برباد ہو جاتا۔ میں چاہتی تو شادی بھی کر سکتی تھی مگر نہیں کی۔ صرف تم دونوں کی خاطر۔ اب سارا برنس عامر کے ہاتھ میں ہے۔ برنس کی تمہیں کوئی شدید نہیں، ایجوکیشن تم نے کمپلیٹ نہیں کی، شادی تم کرنا نہیں چاہتیں، آخر میں تمہاری سیکورٹی کے لیے کیا کروں۔ یہ فارنہ تمہیں ہر چیز سے بے دخل کر دے گی۔“

”مئی! عامر میرا بھائی ہے۔“ اس کے لہجے میں رشتوں کا مان بول رہا تھا۔ مئی نے مضحل سا مسکرا کر ہاتھ

ہٹا لیے۔

”تم بہت انوسینٹ ہو ارتج! اسی لیے میں چاہتی ہوں تم شادی کرلو۔“ وہ خاموش ہی رہی۔

”تیور کے بارے میں کیا سوچا ہے تم نے؟“

”اچھا ہے لیکن۔۔۔“

”لیکن۔۔۔“ مئی نے اس کی بات قطع کی۔ ”ارتج! تم کس قسم کے آئیڈیلزم کا شکار ہو۔ یہ آئیڈیل کچھ

نہیں ہوتے۔ باہر سے کچھ اور اندر سے کچھ اور۔۔۔“

”تو دو غلے لوگوں کے ساتھ زندگی کیسے گزارے گی؟“ اس نے سر اٹھا کر سوال کیا۔

”اعتبار تو کرنا پڑتا ہے جانو۔“

اور وہ یہی سوچتے ہوئے اٹھ گئی تھی کہ ”اعتبار ہی تو نہیں آتا۔“



”میں آج بہت خوش ہوں تیور!“

خوشی نیلگوں آنکھوں میں ننھی پچی کی طرح کھیل رہی تھی۔ تیور نے اس کے گلانی لبوں پر کھلتی مسکان کو دیکھا تو مسکرا دیا۔ آج پھر بہت سے مصروف لمحوں میں سے چند لمحے خاص اس لڑکی کے لیے نکال کر لایا تھا۔

”لنچ پر چلیں۔“ تیور نے کہا تو وہ جوان دنوں اس سے چڑی ہوئی تھی اس وقت اتنی خوش تھی کہ فوراً اس کے ساتھ چل دی۔ اپنے غموں کے ساتھ ساتھ خوشی بھی تیور کے ساتھ شیئر کرنے کی عادت سی پڑ گئی تھی اسے۔

”خوشی کا سبب جان سکتا ہوں میں۔“

”میں پھپھو بننے والی ہوں۔“

”اوہ یہ تو اچھی خبر ہے۔“ اس نے ویٹر کو اشارہ کیا اور اس سے کھانے کا پوچھنے لگا۔

”ایزیو دوش۔۔۔“ ارتج نے آرام سے کہہ دیا۔ اسے بالکل اندازہ نہیں ہوا کہ تیور نے ہر دوش اسی کی پسند کی منگوائی تھی۔

”مگر یہ خوشی تو فارینہ اور عامر کی ہے۔“

”کیوں۔۔۔ میرا اس سے کوئی تعلق نہیں؟“ وہ خفا سی ہوئی۔

”کب تک دو سروں کی خوشی میں خوش ہوگی۔ تم اپنے لیے کوئی فیصلہ کیوں نہیں کر لیتیں۔“ تیور نے اچانک کہا تھا وہ ایک پل کو گزیر پانی گئی پھر سنبھل کر بولی۔

”مجھے اپنے متعلق کوئی فیصلہ نہیں کرنا۔“

”آج سے دس سال کے بعد بھی نہیں۔“ ارتج ہنس دی۔

”تمہیں کیا لگتا ہے؟“ آج سے دس سال بعد تمہاں بیٹھے مجھ سے یہ سوال کر رہے ہو گے۔“

”ہو بھی تو سکتا ہے۔“ اس نے ٹولتی نگاہوں سے ارتج کو دیکھا۔

”محبتوں میں بڑی گنجائش ہوتی ہے۔“

”نہیں تیور! وہ سنجیدہ ہو گئی۔“ ہمارے طبقے کے مردوں کی محبت میں گنجائش ہی تو نہیں ہوتی۔ نیلی آنکھوں کے بعد کالی آنکھوں کے سحر میں گرفتار ہو جاتے ہیں۔ دو سال بھی نہیں لگتے محبت دم توڑ دیتی ہے۔“

”اتنی بے اعتنائی کہاں سے آگئی ہے تمہارے اندر۔“

وہ خاموشی سے ویٹر کو سرو کرتے دیکھتی رہی۔ ویٹر گیا تو مسکرا کر بات بدل گئی۔

”پتا ہے تیور! جب مئی نے یہ خبر سنائی کہ میں پھپھو بننے والی ہوں تو مجھے لگا خدا ابھی ہم لوگوں سے

مایوس نہیں ہوا۔ فارینہ جو بھی کسے لیکن وہ میرے لیے بہت اہم ہو گا۔ مجھے تو ابھی سے اس کا بہت انتظار ہے۔“ وہ کھانے کے دوران مسلسل اپنی خوشی کا اظہار کر رہی تھی۔ تیور خاموش ہو گیا۔

تب ہی انہوں نے رباب اور جشید کو دیکھا وہ انہیں دیکھ بے نادو سرے کو نے میں چلے گئے تھے۔

”رباب اور جشید اب ہمیشہ ساتھ نظر آتے ہیں۔“ تیور نے یونہی تبصرہ کیا۔

”ہاں جم کو رباب سے محبت ہو گئی ہے۔“ وہ ہنس دی۔ بے حد طنز یہ ہنسی تھی پھر سنجیدہ ہوتے ہوئے پوچھنے لگی۔

”تیور! لوگوں کو اتنی بار محبت کیسے ہو جاتی ہے۔“

”مجھے اگر معلوم ہوتا کہ میرا واسطہ ارتج عثمان سے پڑنے والا ہے تو میں بزنس میں ڈگری لینے کے بجائے محبت میں پی ایچ ڈی کر لیتا۔“ وہ بے چارگی سے گویا ہوا ارتج کھلکھلا کر ہنس دی۔

”سوری تیمور! میں ہمیشہ تمہیں یونیورسٹی بورڈ کو دیتی ہوں۔“

تیمور نے قدرے غور سے اسے دیکھا۔ وائٹ جینز اور پنک ٹی شرٹ میں وہ ہمیشہ سے زیادہ فریش لگ رہی تھی وہ مسکرایا۔

”تمہارے ساتھ میں کبھی بور نہیں ہوتا۔“ ارتج مسکرا کر پلیٹ پر جھک گئی۔



گرمیوں کے لمبے لمبے کیف سے دن تھے۔ رباب اور جشید کا الفیو زوروں پر تھا۔ فواد ہائر اسٹڈیز کے لیے باہر چلا گیا۔ تیمور اپنا ذاتی بزنس اسٹیبلشمنٹ کرنے میں مصروف تھا۔ پھر بھی ہر دو سرے دن وقت نکال کر اس سے ملنے چلا آتا۔ می اور عامر بزنس میں مگن تھے اور فارینہ بے حد چڑنی اور بد مزاج ہو گئی تھی۔ اپنی ذرا بھی کیئر نہیں کرتی تھی۔ جیسے جیسے وقت قریب آ رہا تھا، وہ کچھ اور لا پوا ہوئی جا رہی تھی۔

اسے سی کی کوننگ میں بھی اسے گرمی لگتی، ہلکے ہلکے کپڑوں کے لمبے لمبے گاؤن پہن کر اپنے کمرے میں تھکی اپنی فرینڈز کے سامنے می کو گولیاں دیتی رہتی۔

اک وہ تھی کہ ”عدن“ کے استقبال کی تیاریوں میں مگن تھی۔ ایک چھوٹا سا کمرہ کس خوبصورتی سے ڈیکوریٹ کیا تھا۔ ہر خوبصورت اور قیمتی چیز خرید کر اس نے کمرہ بھر دیا تھا۔ می اس کے جنون پر مسکراتی اور فارینہ مزید بے زار ہو جاتی۔ نجائے کیوں اسے آنے والے بچے سے چڑھتی۔ اس کے بے ڈھنگے پھیلے ہوئے وجود کو دیکھ کر عامر کو آکٹا ہٹ ہونے لگی تھی۔

انہی دنوں جب سب بے حد مصروف تھے اسے نعمان مل گیا۔ اس کا یونیورسٹی فیلو اسے ابھی تک جاب نہیں ملی تھی تو اس شاعر صفت انسان نے اک فلاور شاپ کھول لی۔ باتوں باتوں میں اس نے بتایا کہ سابقہ سیلز گرل جاب چھوڑ کر چلی گئی ہے۔

”نعمان! میں کیوں نہ کام کر لوں اس کی جگہ۔“ وہ ایک دم بولی تو نعمان سر تھام کر رہ گیا۔

”ہراوٹ پٹانگ کام تمہیں کیوں اچھا لگتا ہے ارتج بی بی۔“

”کیا ہرج ہے۔“

”ارتج عثمان اب پھول بیچیں گی۔ کچھ ہوش کی دوائیں محترمہ! آپ کا توپنا نہیں لیکن اگر آپ کی می کو پتا چل گیا تو وہ مجھے میری دکان سمیت دیریا برد کر دیں گی۔“

”کچھ بھی نہیں ہو گا وہ اتنی مصروف ہیں کہ انہیں پتا بھی نہیں چلے گا۔“ وہ ہر صورت یہ تجربہ کرنا چاہتی تھی۔

”تم اپنے آفس میں کوئی اپنے مطلب کی جاب کیوں نہیں ڈھونڈ لیتیں۔“ وہ جھنجھلایا تو اترتے جھنکا ہو گئی۔
 ”اچھا بابا۔۔۔ جیسے تمہاری مرضی لیکن دیکھو میں زیادہ بے نہیں کر سکوں گا۔“ نعمان مجبور ہو کر بولا تھا۔
 ”تم کچھ بھی مت دینا۔“ وہ خوش ہو گئی اور پھر ایک مصروفیت ہاتھ آ گئی۔
 حالانکہ اگر ممی یا عامر کو پتا چل جاتا تو وہ اس کا وہ حشر کرتے کہ وہ یاد ہی کرتی۔ انہی دنوں شاپ پر وہ
 نوجوان آیا۔ وہ سادہ خاموش نوجوان اک ادھ کھلا گلاب خریدتا اور وہیں دروازے کے باہر چھوڑ کر چلا جاتا
 تھا۔

پہلے دن نعمان اندر آیا تو اس کے ہاتھ میں لمبی ڈنڈی والا گلاب تھا۔
 ”یہ باہر گرا تھا۔“

”یہ تو۔۔۔“ اس نے حیرت سے گلاس ڈور سے باہر سنسان سڑک پر نگاہ دوڑائی پھر خاموش ہو گئی۔ اور پھر
 یہ معمول سا بن گیا۔

اس نے ایک دن حیران ہو کر نعمان سے پوچھا۔
 ”اگر اسے پھول بیس چھوڑ کر جانا ہوتا ہے تو خریدنا کیوں ہے وہ؟“ تو وہ کندھے اچکا کر آرام سے کہنے
 لگا۔

”ایک سے بڑھ کر ایک خطی اس دنیا میں موجود ہے، ہمیں تو اپنا کام کرنا ہے۔“
 مگر وہ نہ پائی تو ایک دن پوچھ ہی بیٹھی۔

اور اس کا جواب۔۔۔

وہ بس حیرت سے اسے جاتا دیکھتی رہی۔

اور اسی شام تیمور کے ساتھ آکس کریم کھاتے ہوئے اس نے بے اختیار پوچھا تھا۔

”ایسا نہیں لگتا تیمور اٹل کلاس کا مروجہ خالص محبت کر سکتا ہے۔“

گاڑی سے ٹیک لگا کر کھڑے تیمور نے گردن موڑ کر اسے دیکھا جو گاڑی کے بونٹ پر چڑھی، ٹانگ پر
 ٹانگ رکھے لاپرواہی سے کون کھاری تھی اس کے کھلے بال ہوا کی شرارت سے بکھرے جارہے تھے۔

”آخر وہ کون سا جذبہ ہے جو مجھے اس لڑکی کی ہر ناپسندیدہ بات بھی برداشت کرنے پر مجبور کر دیتا ہے۔ یہ
 ہمدردی، موت یا مجبوری نہیں تو پھر کیا یہ محبت نہیں ہے؟ اگر ہے تو اسے اس کا احساس کیوں نہیں ہوتا۔
 محبت اس کے سامنے مسکراتی ہے اور وہ اسے یہاں وہاں تلاشتی پھر رہی ہے۔“

مگر تیمور آتندی کو بھی ضد سی ہو چلی تھی۔ وہ بتائے گا نہیں اسے خود کھوجنا ہو گا۔

”اے۔۔۔ میری بات کا جواب نہیں دیا۔“

”تم فلاور شاپ پر کیا کر رہی ہو؟“

یہ اس کی بات کا جواب نہیں تھا مگر وہ سٹٹا گئی۔

ساری دنیا بے خبر ہو سکتی ہے مگر یہ تیمور آفندی۔
مگر وہ لاپرواہی سے کندھے اچکا کر بولی تھی۔

”یونہی جسٹ فار انجوائے منٹ۔۔۔ کچھ دنوں میں چھوڑ دوں گی۔ مگر وہ میرا سوال۔۔۔“ اس نے فوراً
بات بدل۔

”کیا دے سکتا ہے یہ ٹل کلاس مرد ایک عورت کو۔ محدود سوچ، محدود ذہن، مسائل کا انبار، ہر روز بگڑتا
بجٹ، تنگ نظری اور بچوں کی لائن۔“

”اس کے باوجود تیمور مجھے لگتا ہے وہ ایک دوسرے سے وفا کر سکتے ہیں۔ ان کے پاس اب بھی وقت
ہے۔“ ارتج اب بھی وہیں انکی تھی۔

”مجبوراً“ ایک دوسرے کے ساتھ بندھے رہنا و فائز نہیں ہے ارتج! وفا تو یہ ہے کہ سارے راتے کھلے
ہوں اور انسان پھر بھی کہیں نہ جاسکے۔ محبت پہلے لمحے میں اپنی تکمیل کر لیتی ہے ارتج! اس کے لیے بے
چوڑے وقت کی بھی ضرورت نہیں۔“ تیمور کا لہجہ سنجیدہ و خوبصورت تھا۔ ارتج ایک پل کو ٹھہم سی گئی۔
”پھر بھی تیمور۔۔۔“ اس کے ذہن میں وہ اجنبی نوجوان اٹکا تھا۔

تیمور نے مڑ کر دونوں ہاتھ اس کے دائیں بائیں گاڑی پر ٹکائے اور براہ راست ان نیلی جھیلیوں میں
جھانکتے ہوئے بولا۔

”محبت کسی طبقے کی میراث نہیں ارتج عثمان! محبت کرنے کے لیے ایک خالص سچا اور کھرا دل چاہیے
ہوتا ہے جو کسی کے پاس بھی ہو سکتا ہے خواہ وہ کوئی مل او نہ ہو یا اسکول ماسٹر۔“

ارتج اس کا ایک لفظ بھی نہ سن پائی تھی بس اکسدم گمبیر مگر مضبوط لہجہ تھا۔ وہ اس کے اتنا قریب تھا
کہ اس کے وجود سے پھونتی خوشبو نے ارتج کو اپنے حصار میں لے لیا۔ اس کی ہتھیلیوں پر پسینہ سا اتر
آیا۔

تیمور نے اس کے چہرے کے گلابی پن اور لبوں کے کنارے اتری ہلکی سی کپکپاہٹ کو دیکھا تو مبسم سا
مسکرا کر پیچھے ہٹ گیا۔ گاڑی کے اوپر سے اپنے گلاسز اٹھاتے ہوئے نارمل سے لہجے میں گویا ہوا۔
”چلو تمہیں کسی سے ملواتا ہوں۔“

وہ خاموشی سے گاڑی میں آ بیٹھی۔ وہ ابھی تک متحیر تھی۔ کئی بار ڈانس پارٹی میں جمشید اور فواد کے ساتھ
اس نے رقص کیا تھا مگر کسی کی قربت اس کے اندر رچی برف کو پکھلانا سکی تھی مگر یہ تیمور۔۔۔
اس نے چاہنے کے باوجود نظروں کا زاویہ بدل کر تیمور کی سمت نہ دیکھا۔ بس خاموشی سے سامنے نظریں
جمائے بیٹھی رہی۔

گاڑی اک خوبصورت اور شاندار بنگلے کے پورچ میں رکی تو ایک گرم دن کی نسبتاً ”خوش گوار شام
خوبصورت لان میں اتر رہی تھی۔
”یہ کہاں لے آئے ہو تیمور۔۔۔؟“

”اوتو ابھی ملو تا ہوں۔“

لان میں جوس پیتے دو نوں افراد خوش گواری مسکراہٹ کے ساتھ استقبال کو کھڑے ہو گئے۔
 ”زہے نصیب۔ آج تیمور صاحب کہاں سے رستہ بھول پڑے۔“ مروکی آواز اس کی شخصیت کی طرح
 بھرپور اور جاندار تھی جبکہ عورت بے حد نازک، خوبصورت اور کوئل سی تھی پھر اس کے لبوں پر کھلتی
 بھرپور مسکراہٹ۔
 ”بھئی آج سڈے تھا مجھے لگا بھابھی نے اپنے ہاتھوں سے کچھ اہتمام کیا ہو گا۔“ تیمور نے ہنستے ہوئے
 کہا۔

”اہتمام تو نہیں مگر تمہارے طفیل ہمیں بھی کچھ نصیب ہو جائے گا۔“ وہ ہنس دیے۔
 ”ارتج! یہ ظہیر بھائی ہیں، میں جو اپنا ماربل کا بزنس اشارٹ کر رہا ہوں، اس میں یہی میرے پارٹنر ہیں
 اور یہ ان کی ڈاکٹر تابندہ ظہیر ہیں۔“
 ”اور یہ کیا ہوا ہمار کی ہیں۔“ ارتج کا تعارف نہ کروانے پر ظہیر نے ہنستے ہوئے پوچھا۔
 ”وہ سوری یہ ارتج ہیں۔“ تیمور نے تعارف کروایا۔
 ”خاصا مبہم سا تعارف ہے۔ ہر حال کیسی ہوا ارتج؟“ ڈاکٹر تابندہ نے مسکرا کر پوچھا تھا۔
 ”آئی ایم فائن۔“ وہ کہہ کر تیمور کو دیکھنے لگی۔ نجانے وہ اسے یہاں کیوں لایا تھا۔ وہ اور ظہیر باتوں میں
 مگن ہو گئے تھے ڈاکٹر تابندہ نے اس کا ہاتھ تھام لیا۔
 ”اوہم کچن میں چلتے ہیں۔“

ارتج کو یاد نہیں اس نے آخری بار اپنے گھر کا کچن کب دیکھا تھا اور اب تابندہ نے کچن میں رات کے
 کھانے کی تیاری کرتے خاسماں کو مارکیٹ کچھ چیزوں کی لسٹ دے کر بھیج دیا اور خود فریزر کھول کر اندر
 سے چیزیں نکالنے لگیں۔
 ”کیا کرتی ہو تم؟“

وہ جو سچے سچائے کچن کا جائزہ لینے میں مصروف تھی، چونک گئی۔
 ”کچھ بھی نہیں۔“
 ”تیمور تمہارا کزن ہے۔“
 ”نہیں فرینڈ۔“

”جسٹ فرینڈ۔“ وہ مسکرا کر پوچھنے لگیں۔ ارتج متذبذب سی انہیں دیکھنے لگی، آخر اس سوال کا کیا
 جواب دے۔ وہ بھی گویا اس کا تذذبذبا گئیں۔ تب ہی مرکز ریزر جلائے لگیں۔
 ”آپ خود ہی کو کنگ کریں گی۔“

”عام طور پر تو وقت ہی نہیں ملتا۔ صبح ہسپتال، شام میں کلینک پھر ظہیر بھی بہت مصروف ہوتے ہیں۔
 بس کبھی کبھار ہی مل بیٹھنے کا موقع ملتا ہے، اس لیے ظہیر گھر پر ہوں تو میں ان کے لیے اپنے ہاتھوں سے کچھ

نہ کچھ ضرور بتاتی ہوں۔ ویسے میں اچھی کو لنگ کر لیتی ہوں۔ تیور کو میرے ہاتھ کے کچے قیے کے کباب
 بہت پسند ہیں، ابھی بھی وہی بتا رہی ہوں۔“

”آپ کے بچے؟“ اس نے یونہی بات برائے بات کی لیکن ڈاکٹر تابندہ کا مسکراتا چہرہ تاریک ہو گیا۔
 ”ہمارے ہاں اولاد نہیں ہوئی۔“

”وہ آئی ایم ساری۔“ وہ شرمندہ سی ہو گئی۔

”ٹس اوکے، ہمیں تو دس سال ہو گئے اس حقیقت کو تسلیم کیے ہوئے۔“ انہوں نے فرانک پین
 چولے پر رکھ کر فریج سے ایک نکال کر ڈالی میں رکھا۔

”دس سال۔ آپ کی شادی کو اتنا عرصہ ہو گیا ہے۔“ ارنج کو حیرت سی ہوئی۔ دیکھنے میں وہ خاصی تنگ
 نظر آتی تھیں۔

”ہاں اور شادی کے کچھ عرصے کے بعد ہی مجھے معلوم ہو گیا تھا کہ میں کبھی ماں نہیں بن سکتی۔“
 ”ظہیر بھائی کو بھی معلوم ہے۔“

”ظاہر ہے، میں ان سے چھپا تو نہیں سکتی تھی بلکہ اس کے بعد ہی انہوں نے میرا میڈیکل میں ایڈمیشن
 کروایا تھا تاکہ میں مصروف ہو جاؤں اور مجھے اس کے بارے میں سوچنے کا بھی وقت نہ ملے۔ حالانکہ جو کمی
 ہے وہ ہے اسے سوچنے کے لیے وقت نکالنے کی ضرورت تو نہیں پڑتی۔“ ان کا لہجہ پھیکا سا تھا اور وہ بے حد
 متحیر سی سوچ رہی تھی۔ اس کے باوجود ظہیر نے اس عورت کے ساتھ دس سال گزار دیے۔

”میں نے بہت چاہا کہ ظہیر دوسری شادی کر لیں۔“ تابندہ بتا رہی تھی۔

”میں بخوشی اجازت دینے کو تیار تھی مگر میری کوئی ضد کوئی دلیل ان کی محبت کو ہرانہ سکی۔ نجانے کیسی
 محبت ہے ان کی۔ وہ کہتے ہیں، تم اس کمی کے ساتھ زندگی گزار سکتی ہو تو میں کیوں نہیں۔ اگر خدا نے اولاد
 دینا ہوتی تو تم ہی سے دیتا۔“

تابندہ رول تلے لگیں۔ وہ میز کی سطح پر نظریں جمائے نجانے کس سوچ میں ڈوب گئی تھی۔

”میں بھی کیا باتیں لے بیٹھی، تم بتاؤ کہیں انکی جگہ ہو۔“ ڈاکٹر تابندہ نے بات بدلی۔

”نہیں۔“ ارنج نے مختصر ”کہا پھر بوجھنے لگی۔

”آپ کوئی بچہ ایڈاپٹ کیوں نہیں کر لیتیں۔“

”ظہیر تو چاہتے ہیں مگر میں چاہتی ہوں کہ وہ دوسری شادی کر لیں۔ اپنی اولاد کی بات اور ہوتی ہے۔
 دیکھیں، ہم دونوں میں سے کس کی محبت جیتی ہے۔“

”بیگم صاحبہ! کچھ رحم کریں مہمانوں پر یا انہیں یونہی بھگانے کا ارادہ ہے۔“ ظہیر کچن میں جھانک کر
 بولے۔

”بس میں ابھی لے کر آئی، دو منٹ۔“

باتوں میں وقت گزرنے کا احساس ہی نہ ہوا۔ انہوں نے کباب اور رول ٹرائی میں سچائے۔

”آپ کے سرال والے؟“ ارتج کو ہیں انگی تھی۔

”سارا زمانہ ایک طرف اور ظہیر کی محبت ایک طرف۔“ ڈاکٹر تابندہ کے لہجے میں تقاریر سا ادا آیا۔ ”آؤ چائے پیتے ہیں۔“

وہ خاموش سی ان کے ساتھ باہر آگئی۔ تیمور نے ایک نظر اس کے چہرے پر ڈالی، وہ نظر انداز کر کے تابندہ کے ساتھ باتیں کرنے لگی۔

واپسی پر تابندہ نے بہت اصرار کے ساتھ اسے دوبارہ آنے کا کہا تھا۔ تیمور نے اس کی طرف سے اگلے ویک اینڈ پر آنے کا وعدہ کر لیا۔

”کیسے لگے یہ لوگ تمہیں؟“ واپسی پر تیمور نے پوچھا تھا۔

”دوبری ٹائٹس۔“ اس نے ایمانداری سے اعتراف کیا۔

”اگلے ویک اینڈ پر چلو گی۔“

”دیکھیں گے۔“ وہ رخ موڑ کر باہر دیکھنے لگی۔ وہ جانتی تھی تیمور اسے یہاں کیوں بلایا تھا۔



اگلی صبح اک نئی خبر اس کی منتظر تھی۔

رباب کو فواد نے پوز کیا تھا اور اس نے فواد کا پوزل قبول کر لیا تھا۔ جمشید بے حد ڈسٹرب تھا اور ہمیشہ کی طرح اس کے آنسو ارتج ہی کو صاف کرتے تھے اس نے فون کر کے نعمان سے معذرت کی اور جمشید کی طرف آگئی۔ جو اپنے بیڈ روم میں حلیہ بگاڑے اپنے جلے ہوئے دل کو گرم گرم تلخ کافی سے کچھ اور جلا رہا تھا۔ ارتج نے پردے ہٹا کر بیڈ روم کے یاسیت زدہ ماحول کو بدلنے کی کوشش کی۔ سی ڈی پلیئر میں روتی دھوتی سی ڈی نکال کر اسپاٹسی گرل کا نیا البم لگا کر الیوم فل کر دیا۔ پھر اس کے ہاتھ سے مگ چھینتے ہوئے بولی۔

”چلو آؤس کریم کھانے چلتے ہیں۔“

”تم میرا مذاق اڑانے آئی ہو۔“ جمشید کی سرخ آنکھوں میں خفگی اتر آئی۔

”نہیں، تمہیں تسلی دینے کہ ٹھیک دو ماہ بعد تمہارا رستہ کوئی سنری بالوں یا کالی آنکھوں والی روک لے گی تو تمہیں رباب یاد بھی نہیں آئے گی اس لیے ڈرامہ مت کرو۔“ اس نے کپ سائیڈ ٹیبل پر پٹخا۔

”تم اتنی سفاک کیوں ہو گئی ہو ارتج! میں نے رباب سے واقعی محبت کی تھی۔“

”تمہیں ہر لڑکی سے واقعی محبت ہو جاتی ہے، اس تیسری سے بھی ہو جائے گی، اس لیے فوراً اٹھ جاؤ۔“

اس گرم شام انہوں نے آئس کریم کھائی کم پکھلائی زیادہ تھی۔ وہ بات بے بات اسی کا تذکرہ کر رہا تھا۔
 واپسی پر جشید نے وائلن پر اسے کئی خوبصورت دھنیں سنائیں۔ وہ گم سی ہو گئی، کتنا عرصہ ہو گیا اسے وہ
 خواب دوبارہ نہیں آیا تھا اور وہ دھن اس کے ذہن میں کچھ بھی نہیں آیا، بس اک احساس ساتھ تھا۔
 جشید کا وائلن خاموش ہو گیا تو وہ خاموشی سے اٹھ گئی اور نجانے کیا سوچ کر اس نے رباب کو فون کیا
 تھا۔ وہ مسرور سی فواد کے پرپوزل کے بارے میں بتانے لگی۔
 ”لیکن رباب! تم تو جشید سے محبت کرتی تھیں۔“

”ہاں کرتی تھی۔“ وہ ہنس دی۔ ”دراصل تب جشید کہہ رہا تھا کہ اس کے ڈیڈی کے ساتھ اس کی صلح
 ہونے والی ہے لیکن اب پتا چلا کہ اس کے ڈیڈی اس سے اتنے تنگ آگئے ہیں کہ اسے عاق کرنے والے
 ہیں پھر فواد کا پرپوزل آگیا، انہیں پتا ہے یا راس کی فیملی کیا چیز ہے اور خود اس کا فیوچر کتنا براٹھ ہے۔
 ماما کا خیال ہے میرے لیے فواد ٹھیک رہے گا، وہ امریکہ سے آجائے تب انکی جمنٹ ہوگی۔“
 ارتج نے گڈ بائے کہہ کر موبائل آف کر دیا اور سوچنے لگی۔

”فواد کے واپس آنے تک اگر رباب کو کوئی اور فواد سے بہتر مل گیا تو کیا وہ فواد کو بھی بھول جائے گی۔“
 ان ہی سوچوں میں الجھتی وہ گھر پہنچی تو ملازم نے بتایا کہ عامر اور می فارینہ کو لے کر اسپتال گئے ہیں۔
 ”وہ صبح سے ہی چلے گئے تھے۔“ وہ پیشانی پر ہاتھ مار کر رہ گئی۔
 آج سولہ اگست تھی اور ڈاکٹر نے فارینہ کو یوکی ڈیٹ بتائی تھی۔ اس نے فارینہ کے لیے ڈھیر سارے
 پھول خریدے اور اسپتال آگئی۔

می اور عامر وینٹنگ روم میں تھے۔
 ”ممی۔“ وہ ان کے قریب جا کر۔ می نے سر اٹھا کر اسے دیکھا پھر آہستگی سے گویا ہوئیں۔
 ”فارینہ کی حالت ٹھیک نہیں ہے۔“
 ”اوہ گاڈس۔“ ارتج نے مضحل سے عامر کو دیکھا پھر اس کے بالوں پہ انگلیاں پھیرتے ہوئے تلی آمیز
 انداز میں بولی تھی۔

”ڈونشوری عامر! سب ٹھیک ہو جائے گا۔“
 عامر نے بونہی اثبات میں سر ہلایا اور اٹھ کر ادھر سے ادھر چکرانے لگا۔
 ”مگر می! ڈاکٹر تو کہتی تھیں کس۔“
 می اس کی بات سننے کے بجائے باہر آئیں۔ ڈاکٹر شفاء طارق کی طرف متوجہ ہو گئیں، وہ ان کے قریب
 آکر رک گئیں۔

”آئی ایم ساری مسز عثمان! ہم بے بی کو نہیں بچا سکے۔ بیٹا تھا مگر مردہ۔“
 ارتج کو لگا ساری کائنات تھم گئی ہے۔

اس نے پل پل اس کا انتظار کیا تھا“ سے لگتا تھا یہ بچہ ان کے گھر کی فضا کو خوش گوار بنادے گا۔
 ”یہ نہیں ہو سکتا۔“ اس کے ہاتھ سے پھول گر کر فرش پر بکھر گئے۔
 ”فاریہ ٹھیک ہے؟“ عامر پوچھ رہا تھا۔
 ”یس شی ازل رائٹ۔“

وہ دو قدم پیچھے ہٹی۔ اس کی بے یقین نگاہوں نے سامنے کھڑے تینوں افراد کے مغموم و پریشان چہروں کو دیکھا اور بھاگتی ہوئی وہاں سے باہر نکل گئی۔



”تم نے دیکھا۔۔۔ تم نے دیکھا تیمور۔۔۔ وہ اس دنیا کو دیکھے بغیر چلا گیا“ اس نے ایک نظر بھی کسی کو دیکھنا گوارہ نہیں کیا۔ وہ یونہی روٹھ کر چلا گیا۔ وہ جانتا تھا یہاں کوئی اس کا منتظر نہیں، یہاں کسی کو اس کی ضرورت نہیں لیکن تیمور! میں نے اس کا انتظار کیا تھا۔ مجھے ضرورت تھی اس کی۔۔۔“ اسے رونے کے لیے وہی کندھا ملا تھا۔

”سنبھالو خود کو! رتیخ! فاریہ نے کو دیکھو“ اس نے کتنی جلدی خود کو سنبھال لیا ہے۔“
 ”میں نے اس کا نام ہی غلط رکھا تھا۔“ ”عدن“ ”جنت کا پھول۔“ ”وہ جنت کا پھول تھا اس گھٹیا سی دنیا میں کیا کرنے آتا۔“

”چلو! رتیخ! ادا کڑتا بندہ کے ہاں چلتے ہیں۔“ تیمور نے اسے بھلانا چاہا۔
 ”نہیں تیمور! پھر کبھی چلیں گے۔“ وہ تھڑی ہو گئی۔

”رتیخ۔“ تیمور نے اس کا ہاتھ پکڑ کر روکا۔ ”آؤ! کہیں دور چلتے ہیں، بہت دور جہاں میرے اور تمہارے سوا کوئی نہ ہو۔“ اس نے پہلی بار کوئی فرمائش کی تھی۔

”کہاں زمین کے آخری کنارے تک یا سورج سے اپنا دکھ بانٹنے۔ ہم جہاں بھی گئے تیمور تمہا نہیں ہوں گے۔ اگر سورج نے بھی ہمارا دکھ نہ بانٹا تو کہاں جائیں گے۔“

تیمور نے اسے کھینچ کر واپس بٹھایا اور جھنجلا کر پوچھنے لگا۔

”کس قسم کی باتیں کرتی رہتی ہو تم؟ یہ سب فارغ دماغ کے کرشمے ہیں، بے مقصد جینے کے نقصانات۔ رتیخ عثمان! اکل تم میرے ساتھ چلوں تمہارے لیے کوئی جگہ نکال لوں گا۔ اگر تم زیادہ عرصہ یونہی فارغ رہیں تو بالکل پاگل ہو جاؤ گی۔“

”مجھے اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ سپاٹ لہجے میں گویا ہوئی۔

”رتیخ! چلو کسی سائیکائرسٹ کے پاس چلیں۔“ تیمور نے بے حد محبت بھرے لہجے میں کہا تھا مگر وہ بھڑک اٹھی۔

”تمہارا خیال ہے کہ میں پاگل ہو گئی ہوں۔“

”سائیکارٹسٹ کی ضرورت صرف پاگلوں کو نہیں ہوتی! ارتج! بعض اوقات ہمارے اندر بندھ جانے والی کوئی چھوٹی سی گرہ ہمارے لیے نفسیاتی براہِ مہم بن جاتی ہے۔ کبھی کبھی تو۔۔۔“

”فار گاڈ سیک تیور! مجھے مت دویہ لیکر مجھے کسی کی ضرورت نہیں ہے، میں بالکل ٹھیک ہوں۔“ اس نے چڑکرات قطع کی۔

”ارتج! مجھے کیا سمجھتی ہو تم؟“ تیور نے لب بھیج کر سوال کیا۔ اچانک اسے لگا وہ اس لڑکی کے پیچھے خواخوہ خوار ہو رہا ہے۔

”مجھے جانا ہے۔“ وہ بیک اٹھا کر کھڑی ہو گئی۔

”میرے سوال کا جواب دو ارتج!“

ارتج نے اسے دیکھا اور بتا جواب دیے چلی گئی۔ تیور لب بھیجے اسے جاتا دیکھتا رہا۔



میں نے اسے دوسری بار ایک فلاور شاپ پر دیکھا۔ شیشے کے اس پار بے تحاشا پھولوں کی تازگی اور خوشبو کے درمیان گھری وہ اک خوبصورت تتلی لگ رہی تھی۔ مجھے لگا وہ رستہ بھول کر یہاں آگئی ہے پھر اس خوشبو نے کند ڈال کر مجھے شاپ کے اندر دھکیل دیا۔

وہ اپنے کام میں مصروف تھی اور میں اسے مسحور سا دیکھتے ہوئے سوچ رہا تھا اس سے پوچھوں۔

”اچھی لڑکی! تمہیں وہ خالص لمحہ ملایا نہیں۔“ تب ہی اس نے ذرا فارغ ہو کر مجھ سے پوچھا تھا۔

”آپ کو کون سے پھول چاہئیں۔“

میں نظروں کا زاویہ بدل کر خوبصورت، شوخ و رنگ پھولوں کو دیکھنے لگا۔

”میں کچھ سمجھ نہیں پا رہا۔“ میری نگاہ کا پیچھی بھٹک کر اس کی گھنی پلکوں پر خیمہ زن ہوا۔

”آپ کو کس کے لیے پھول لینا ہیں۔“ وہ متانت سے پوچھ رہی تھی۔

”رستہ بھول کر آئی اک انمول تتلی کے لیے، پھول جس کا گھر اور خوشبو جس کا پیرا، ہن ہے۔“ اک ہلکا سا تبسم نیلی جھیل پر نرم پھوار کی طرح برسا۔

”اچنی گرل فرینڈ کے لیے۔“ میں نے نفی میں سر ہلایا۔

”وہ لڑکی جس سے محبت کرتے ہیں؟“

”کسی کی عیادت کے لیے۔“ میں نے بات بنائی۔ وہ بے ساختہ ہنس دی۔

گلابی نرم ہونٹ کے کنارے چھپا پل اپنی چھب دیکھانے لگا۔

میرا دل چاہا، میں ذرا سا جھکوں اور۔۔۔

”کسی کی عیادت کے لیے پھول لے جانے والے اتنا نہیں سوچتے۔“

تب ہی ایک شخص تیزی سے اندر داخل ہوا ایک بو کے لیا اور چلا گیا۔
 ”یہ عیادت کے لیے آیا تھا۔“ اس نے گویا جتایا تو میں ہنس دیا۔
 ”جو میں کہنا چاہتا ہوں اس کا اظہار کرنے سے پھولوں کی زبان بھی قاصر ہے۔“ اس نے پلٹ کر ادھ کھلے گلابوں کا گلہ سہ اٹھایا۔
 ”کہتے ہیں پھول خاص طور پر سرخ گلاب محبت کی زبان سمجھتے اور سمجھاتے ہیں۔ مجھے یقین ہے۔“ وہ
 سمجھ جائے گی، آپ کیا کہنا چاہتے ہیں۔“

کون کتنا ہے محبت کی زبان ہوتی ہے
 یہ حقیقت تو نگاہوں سے عیاں ہوتی ہے

میں نے اک ادھ کھلا بسی ڈنڈی والا گلاب لیا، پے منٹ کی اور باہر نکل آیا۔ بہت دیر تک وہیں کھڑے
 رہنے کے بعد یاہر نکل آیا۔ بہت دیر تک وہیں کھڑے رہنے کے بعد میں نے مڑ کر خالص لمحے جیسی انمول
 لڑکی کو دیکھا اور وہ بسی ڈنڈی والا گلاب شیشے کے دروازے کے پاس رکھ کر چلا گیا۔
 یہ میرا معمول سا بن گیا تھا۔

نجانے وہ پھول اسے ملتا تھا یا ہوا کا رزق بن جاتا تھا، لیکن میرا دل چاہتا، وہ کبھی تو پوچھے۔
 ”تمہیں یہ پھول ہمیں چھوڑ جانا ہے تو خرید لے کیوں ہو؟“
 مگر وہ خاموشی سے اک ادھ کھلا گلاب میری سمت بڑھاتی۔ مگر یہ خاموشی بے حد متبسم ہوتی۔ اور یہ
 تبسم اس کی نیلگوں آنکھوں میں بادیانی نشئی کی طرح جھونکتا رہتا۔
 ”کیا تم ابھی تک اسے اپنی بات نہیں سمجھا پائے؟“ اک بادلوں بھری اداس سی شام میں اس نے
 اچانک پوچھا تھا۔

میں نے نفی میں سر ہلایا۔
 ”آخر تم اس سے کیا کہنا چاہتے ہو؟“
 میں نے سراٹھا کر اسے دیکھا۔
 ”جی لڑکی! میرے پاس تمہیں دینے کے لیے بہت سے خالص لمحے ہیں۔“ وہ ششدر سی رہ گئی۔
 میں اپنا پھول اسی کے ہاتھ میں بھول کر باہر نکل گیا۔ اگلے دن میں نے اسے خط میں وہ شام پوسٹ
 کر دی تھی۔ جب میں نے صرف اسے سوچا تھا۔
 نجانے وہ خط اسے ملایا وہ شام پوسٹ آفس کی کسی ٹیبل پر گری رہ گئی۔ مگر وہ پھر کبھی وہاں نظر نہیں
 آئی۔

میں نے اس فلاور شاپ کو اپنے اندر وہیں سنبھال کر رکھ لیا۔ جہاں اس پہلی بارش کو سنبھال رکھا تھا۔

وہی فرانسیسی درپچہ، وہی سبز تیل سفید پھولوں سے لدی ہوئی۔ ہوانے ہلکی سی شرارت کی اور سارے پھول دیوانہ وار اس پر برسے لگے۔ مگر وہ مہسوت سی کھڑی تھی۔

درپچے کے اس پیار سے آتے وائٹن کے اداس سر اسے اپنی طرف بلا رہے تھے۔ اس نے گردن موڑ کر ماربل کی سفید سیڑھیوں کو دیکھا۔ اسے لگایہ سیڑھیاں اسے درپچے تک لے جائیں گی۔ اس نے پہلی سیڑھی پر قدم رکھا۔ پھر دوسری، پھر تیسری۔ اس کی نگاہیں کھلے درپچے کے اس طرف نیم تاریکی کو کھوج رہی تھیں۔ اچانک اسے لگا اس کے قدموں تلے سے سیڑھیاں کھسک گئیں، اس نے گھبرا کر نیچے دیکھا تو لڑکھڑائی۔ اس سے قبل کہ گر جاتی۔ کسی نے اسے بازوؤں میں سمیٹ کر سنبھال لیا تھا۔

”سنبھل کر۔“ وہی مدھم سی سرگوشی۔

اس سے قبل کہ وہ پلٹ کر دیکھتی، آنکھ کھل گئی۔ کچھ لمحے گھورتی رہی، پھر گردن گھما کر چیختے چلاتے فون کو دیکھا۔ پھر ہاتھ بڑھا کر ریسور اٹھالیا۔

دوسری طرف رباب تھی۔

فورا ”بستر سے نکلو اور کلب پہنچو۔“

”راہی! میں۔“

”تو ایک سکیورٹس، ہم تمہارا ویٹ کر رہے ہیں۔“ اس نے فون بند کر دیا۔ چاروٹا چار اسے اٹھانپڑا۔ تیار ہو کر باہر نکلے تو می نہیں تھیں۔ عامر اور فارینہ ایک دوسرے سے الجھ رہے تھے۔ اس نے جاتے جاتے سنا۔ فارینہ چیخ رہی تھی۔

”اگر انہیں پچہ چاہیے تو میں کیا کروں۔“

”یہ ممی کی خواہش ہے فاری۔“

”تو انہیں کہو خود ثرائی کریں۔ مجھ سے کوئی امید نہ رکھیں۔“

”شٹ اپ فاری۔ تم حد سے بڑھ رہی ہو۔“

”پوشٹ اپ۔ میں کوئی۔“ وہ خاموشی سے آگے بڑھ گئی۔

”ممی بھی کمال کرتی ہیں ابھی وقت ہی کتنا گزرا ہے۔“

اس نے گاڑی اسٹارٹ کرتے ہوئے سوچا تھا۔ کتنے بے کیف سے دن ہفتوں اور مہینوں میں ڈھل کر گزر گئے تھے۔ تیمور کو اپنی فیکٹری کے لیے جاپان سے مشینری منگوانا تھی۔ ڈیلنگ کے لیے وہ خود گیا تھا اور جانے سے پہلے اس سے ملنے آیا تھا، مگر کچھ خفا سا لگتا تھا۔

کتنے عرصے کے بعد وہ کلب آئی تھی۔ سب نے اسے ہاتھوں ہاتھ لیا۔ رباب کے ساتھ فواد کی موجودگی سر پرانزنگ تھی۔

”تم امریکہ سے کب آئے؟“ اسے احساس ہوا، وہ ان سب سے کتنی بے خبر بنے لگی ہے۔

”میں بھی چند دن ہوئے، لیکن تم کہاں رہتی ہو؟ رباب بتا رہی تھی۔“

وہ بس مسکرا دی۔ آرکسٹرانے خوبصورت سی دھن بجائی تو وہ دونوں ہاتھوں میں ہاتھ ڈالے فلور کی طرف بڑھ گئے۔ وہ قدرے ہٹ کر صوفے پر جا بیٹھی۔ کسی نے اس کے ہاتھ میں صوفے ڈرنک کا گلاس تھما دیا تھا۔ تب ہی جمشید اس کے پاس آ بیٹھا۔
”ہائے رتج۔“

”ہائے جم۔“ اس نے خوشدلی سے مسکرائے کی کوشش کی۔
”و آرلکنگ سوپرٹی۔“ جمشید نے سر تپا اس کا جائزہ لیا۔
”نہینکس۔“ اس نے خالی گلاس ایک طرف رکھ کر نارمل سے لہجے میں کہا تھا۔
”تمہیں رباب کے ساتھ فواد کو دیکھ کر جیلسی فیل نہیں ہوئی؟“ رتج نے گردن گھما کر ایک دوسرے میں گم ان دونوں کو دیکھا۔

”مسوچ کر ہوتی تھی، دیکھ کر نہیں ہوئی۔“ وہ آہستگی سے ہنسا۔
”اچھا! رتج کھلکھلا کر ہنس دی۔“

وہ اس کے بول کھلکھلا اٹھنے پر دم بخود سا ہو کر اسے دیکھنے لگا۔
”تیو ڈو یو نمی تو تمہارے پیچھے پاگل نہیں۔“

”واٹ ڈو یو مین۔“ وہ ایک دم سنجیدہ ہو گئی۔ تب جمشید نے آہستگی سے اس کا گال چھو کر کہا۔
”ہمت خوبصورت ہو تم میوں لگتا ہے مجھ سے محبت ہو جائے گی۔“

وہ ایک پل کو ساکت ہوئی اور دوسرے پل اس کا ہاتھ جھٹک کر فلور سے نیچے اتر گئی۔ جم نے اسے پکارا،
مگر وہ بھاگتی ہوئی بیرونی دروازہ کر اس کر گئی۔

اسے جمشید سے ایک دم شدید کراہیت کا احساس ہوا تھا۔ اسے شدید رونا آ رہا تھا اور گاڑی میں بیٹھ کر
خوب روئی بھی تھی۔

یہ کیسی محبت تھی جو کبھی لینا سے ہو جاتی ہے، کبھی رباب سے تو کبھی رتج سے۔ یہ نہیں تو وہ سہی وہ
نہیں تو کوئی اور۔۔۔

”سب ایک جیسے ہیں، سب ایک جیسے، کسی کو کسی کے نہ ہونے سے کوئی فرق نہیں پڑتا۔ سب وقت
گزاری کے مشغلے ہیں۔ خود غرضی کے رشتے، جھوٹ، فریب، ڈھکوسلے میں کیسے کسی پر اعتبار کروں،
کیسے؟“ وہ اسٹیرنگ پر ہاتھ مار مار کر روتی رہی۔



ملازمہ اسے کھانے کے لیے بلانے آئی تھی۔ وہ کتاب بند کر کے کمرے سے باہر آ گئی، آج کل اس کا
یہی مشغلہ تھا۔ لائبریری سے کتابیں لے آتی اور سارا دن پڑھتی رہتی۔ انسانوں سے چڑ کر اس نے کتابوں

میں پناہ ڈھونڈتی تھی۔ لاشعوری طور پر اس کے قدم ڈانٹنگ روم کے باہر ہی رک گئے۔ شاید اپنا نام سنا تھا۔ ایک بل کو گنج بھی ہوا۔ نجانے کتنے عرصے کے بعد ڈنپر وہ تینوں موجود تھے۔
”جو کچھ آپ اس کے لیے کر چکیں وہ بہت ہے۔ مزید میں عامر کی حق تلفی کرنے نہیں دوں گی آپ کو۔“ فارینہ کا لہجہ تلخ سا تھا۔

”یہ میرا اور عامر کا معاملہ ہے فارینہ! تمہیں بولنے کی ضرورت نہیں۔“ ممی کا لہجہ رکھائی لیے ہوئے تھا۔

”یہ صرف آپ کا اور عامر کا معاملہ نہیں ہے اور میں کیوں نہ بولوں آخر میں بھی اس گھر کی ایک فرد ہوں۔“

”عامر! خاموش کرو! اپنی بیوی کو۔“

”ممی! فاری کچھ غلط تو نہیں کہہ رہی۔“ عامر کے جواب نے ایک بل کو ممی کو خاموش کر دیا۔

”تم محض ایک کوٹھی اور تھوڑے سے بینک بیلنس کے لیے اتنا جھگڑا کر رہے ہو عامر جبکہ سب کچھ تو

تمہارا پاس ہے۔“

”بات اصول کی ہے ممی۔“

”اصول میرے اپنے اصول ہیں عامر! اگر وہ اس گھر میں رہتی ہے تو اسے اس کا حق مل کر رہے گا۔“
مما کا لہجہ سخت اور بے چلک تھا، ہوتا تو وہ سمجھ گئی تھی کہ بات اسی کے متعلق ہو رہی ہے مگر گفتگو سے وہ کچھ بھی اخذ نہیں کیا تھی۔ اگر ممی جائیداد میں سے کچھ حصہ اسے دینا چاہتی تھیں تو اس کا حق تھا۔ عامر یا فارینہ کے اس طرح بھڑک اٹھنے کی کوئی توجیہ اس کی سمجھ میں نہ آئی تھی۔

”ممی! بہتر ہے اس کی شادی کر دیں۔“ عامر نے کہا تھا۔

”یہ تمہارا ہیڈک نہیں ہے۔ وہ میری بیٹی ہے اور میں جانتی ہوں کہ مجھے اس کے لیے کیا کرنا ہے۔“

”بھی از ناٹ پور ڈائز ممی! (وہ آپ کی بیٹی نہیں ہے) اور میں سمجھ نہیں پا رہی ہوں کہ اپنی سگی اولاد کے

مقابلے میں آپ ایک لے پالک کو ترجیح کیوں دے رہی ہیں؟“

”شٹ اپ فارینہ۔“ ممی چیخ اٹھی تھیں۔ اور باہر کھڑی ارجن گویا وہ پورے قد کے ساتھ زمین پر آ

گری ہے۔



بے یقینی سی بے یقینی تھی وہ گویا عرش سے فرش پر آ پڑی تھی۔ زندگی کے اتنے برس وہ جس نام کو اپنے نام کے ساتھ اپنی شناخت کی تکمیل کے لیے استعمال کرتی رہی۔ وہ اس کا نہیں تھا۔ وہ کیا تھی؟
ماسٹر صلاح الدین کی بیٹی۔

شادی کے سات برس گزر جانے کے بعد اولاد نہ ہوئی تو مسز فرزانہ عثمان نے اسے گود لیا تھا۔ اور اسے شہزادیوں کی طرح پروان چڑھایا۔ سینٹھ عثمان لڑکا گود لینا نہیں چاہتے تھے، ایک لے پالک ان کی پوری جائیداد کا وارث ہو، یہ انہیں گوارا نہ تھا۔ سو انہوں نے ارتج کو گود لے لیا۔ محض اپنی چیت پیوی فرزانہ کی ضد پر۔ جو اس بچی کو گود کی گرمی تو نہ دے سکیں مگر اس بچی نے ان کے گھر کا سونا پن ضرور بانٹ لیا۔ مگر یہ کسی کے لیے حتیٰ کہ ارتج کے لیے بھی اجنبی کی بات نہ تھی کہ یہاں اس پر توجہ کیوں نہیں دیتے۔ یا مئی اسے اپنے سینے سے کیوں نہیں لگاتیں کہ اس نے اپنے گرد موجود ہر بچے کو گورنس کی نگرانی میں ہی پروان چڑھتے دکھا تھا۔ اسے کبھی نہیں لگا کہ وہ اس کی مئی نہیں ہیں۔

انہوں نے اس کی ہر ضرورت کو پورا کیا تھا۔ اور جب خدا نے خود انہیں بیٹے کی نعمت سے نوازا تب بھی انہوں نے ارتج کو کوئی کمی نہ آنے دی تھی۔ بس اس کا اپنا مزاج ہی کچھ اور تھا، وہ ہر کسی سے دور ہو گئی تھی۔ ہر چیز سے بے زار، اس نے سب سے ملنا چھوڑ رکھا تھا اور یہ بات تو طے تھی کہ وہ جب بھی پریشان ہوتی، وہ خواب مسلسل و متواتر اس کی بے چین نیند میں دستک دیتا تھا۔ مگر اب اسے اس تسلسل پر غصہ آنے لگا تھا۔ اس فرانسسی طرز کے در سے بچے پر، اس پر جھکی سفید پھولوں سے لدی تیل پر، وائلن کی دھن پر، اسے سنبھال لینے والے شخص پر۔

تین دن کے بعد مئی نے اسے دیکھا تو ٹھٹھکی گئیں۔

وہ از خود ان کے کمرے میں آئی تھی۔

”ارتج کیا ہوا؟“ تنازرد چہرہ وہ حیران سی ہو گئیں۔

”مئی! مجھے آپ سے کچھ پوچھنا ہے۔“

”یہاں آؤ میرے پاس، پہلے بتاؤ، تمہیں ہوا کیا ہے، بیمار ہو۔“

پچھلے دو دن وہ اتنی مصروف رہی تھیں کہ گھر میں جھانکنے کا وقت ہی نہیں ملا تھا، وہ ان کے قریب آئی اور گھٹنوں کے بل ان کے قریب بیٹھ گئی۔ مئی کی گود میں کچھ فائلیں دھری تھیں۔ انہوں نے یونی آگے جھک کر اس کا چہرہ اپنے ہاتھوں میں لیا۔

”ارتج تم ٹھیک تو ہو۔“

”ٹھیک ہوں مئی! مجھے کیا ہوا ہے۔“ اس کی مسکراہٹ پھسکی سی تھی۔ مئی نے ہاتھ ہٹا لیے اور گود میں پڑی فائل اس کے سامنے کی۔

”ارتج! میں نے ڈیفنس والی کوٹھی، اور اسلام آباد والا بنگلہ تمہارے نام کیا ہے، بینک میں تمہارے نام کا اکاؤنٹ ہے جس میں۔“

”مئی!“ اس کے بول اٹھنے پر وہ خاموش ہو کر اسے دیکھنے لگیں۔

”مئی! میں کس کی بیٹی ہوں؟“ اس نے اپنا ہاتھ ان کے ہاتھ پر رکھ کر اچانک پوچھا تھا۔ مئی ششدر سی

رہ گئیں۔

”ممی! مجھے بتائیں، انہوں نے مجھے آپ کو کیوں دے دیا۔“

”ارتج! تم میری بیٹی ہو۔“ ممی کی آواز اندھم سی تھی۔

”ممی۔“ وہ مضطرب سی مسکرائی۔ ”فیئکٹ از فیئکٹ، مجھے بتائیں ماسٹر صلاح الدین کون ہیں، کہاں ہیں، پلیز ممی۔“ وہ لجاجت سے کہہ رہی تھی۔

ممی نے ایک طویل سانس لے کر آنکھیں بند کیں۔ انہیں لگا اب ارتج سے چھپانا ناممکن ہے۔ وہ دھڑکنے والے دل کے ساتھ متحضر تھی۔

”میرا تعلق ایک متوسط گھرانے سے ہے۔ اتفاقاً شادی سیٹھ عثمان سے ہو گئی۔ ماسٹر صلاح الدین میرے دور پرے کے کزن تھے۔“



وہ گھر سے نکلی تو کالی کالی بدلیاں بچپن سے اٹھی تھیں اور اب چھانچوں چھانچوں پرستامینہ اس کے رستے میں حائل تھا۔ بچے اس کی گاڑی کے گرد بارش میں انکھیلیاں کرتے پھر رہے تھے، کچھ دور آم والا ریڑھی پر، پیلے سبز آم بھرتی ہوئی اور بنیان میں ملبوس بارش میں بھیکتا ہوا اونچی آوازیں گارہا تھا۔
بھاگاں والیو، آم۔

مولا آم۔

آم کھاؤ آم۔

سامنے والوں کی بیشک کا دروازہ کھلا تھا اور ایک نوجوان صوفے پر ٹانگیں بچھائے خاموشی سے برستے ساون کا لطف لے رہا تھا۔ اس کے ڈیک پر فل آوازیں گانے چل رہے تھے۔ تب ہی ایک نوجوان ہاف جینز اور ٹی شرٹ میں گاتا ہوا گزرا۔
”ساون بر سے تر سے دل۔۔“

ارتج نے ہارن بجا کر اپنی طرف متوجہ کیا تو جہاں وہ ٹھنک کر رہا، وہیں بیشک والے لڑکے نے گردن موڑ کر اس کی طرف دیکھا، ”آم والا بھی گانا بھول کر اس کی طرف متوجہ ہو گیا۔“
”ماسٹر صاحب کا گھر کون سا ہے؟“

”ماسٹر صاحب۔“ نوجوان نے قدرے تعجب سے گاڑی میں بیٹھی لڑکی کا حلیہ ملاحظہ کیا۔ پھر سنبھل کر بولا۔ ”گلی میں نیم والا گھرانہ ہی کا ہے۔“

”تھینک یو۔“
ارتج نے گردن گھما کر گلی میں دیکھا۔

پختہ گلی کشادہ تھی۔ وہ گاڑی اندر لے گئی۔ نیم کے درخت کے نیچے لوہے کی کرسی بھیک رہی تھی۔ وہ گاڑی سے نکل کر ہاگتی ہوئی نیم کے درخت کے نیچے آگئی۔ سبز پتوں کو چھو کر شاخوں میں سے رستہ بناتی بارش کی بوندیں اسے بھگونے لگیں۔

اس نے لب کاٹھے ہتھیلیاں مسلتے ہوئے پلٹ کر نیلے دروازے کو دیکھا۔
اس کا دل رک رک کر دھڑکنے لگا۔

بند دروازے کے پیچھے اس کے لیے نجانے کیا تھا۔ وہ اپنی کیفیت کو کوئی نام نہ دے پائی۔
عجیب سا ڈر اور خوف، عجیب سی جھجک
”اگر انہوں نے مجھے تسلیم ہی نہ کیا۔“

اسے لگا اگر ایسا کچھ ہوا تو وہ واپس نہ چلائے گی۔ اس کا وجود ہمیں بکھر جائے گا۔
اس کی ہتھیلی نے بہت ڈرتے ڈرتے دستک دی۔

دوسری طرف پختہ صحن پر گرتی بارش کی آواز کے سوا کچھ بھی نہ تھا۔
اس نے بے تاب ہو کر دروازہ دھڑو دھڑایا۔

دوسری طرف قدموں کی چاپ ابھری۔ کسی بچے نے بہ غلٹ دروازہ کھولا۔

”اندر آجائیں۔“ وہ اسی غلٹ میں کہہ کر ہاگ جانے کو مڑا، پھر ایک دم ٹھٹک کر رک گیا۔ سر تپا اس کا جائزہ لیا۔

”ماسٹر صاحب ہیں؟“

”ہیں اندر آجائیں۔“ اس نے تہذیب سے جواب دیا۔

وہ اندر چلی آئی، پختہ کھلے سے صحن میں ایک طرف جامن کا بڑا درخت پھیلا تھا۔ اس کے سبز پتے ہوا کی تال پر محور قص تھے۔ ٹپ ٹپ پکی ہوئی جامنیں نیچے گر رہی تھیں۔ درخت کے نیچے بڑا سا پرندوں کا

پنجرہ تھا جس میں کئی رنگ کے ننھے ننھے آسٹریلین طوطے پر پھیلائے ادھر سے ادھر اڑتے ماحول کی خوبصورتی اور رنگینی میں اضافہ کر رہے تھے۔ چائنیز ڈو محور قص تھی۔ برآمدوں کا سرخ فرش بھیک کر کچھ اور سرخ ہو گیا تھا۔ ستون کے ساتھ لپٹی سبز بیل سے آتش گلابی پھول ٹوٹ ٹوٹ کر بارش کے پانی میں رنگ گھول رہے تھے۔ دائیں طرف سے اوپر جاتی ہریہڑھی پر چھوٹے چھوٹے کلمے دھرے تھے۔ جن میں قسم قسم کے پودے ماحول کو تروتازہ کر رہے تھے۔ فضا میں بارش کی خوشبو کے ساتھ پکوان تلنے کی خوشبو پھیلی تھی۔

وہ بچہ سامنے والے کمروں میں غائب ہو گیا تھا۔ ارتج نے قدم اٹھائے، تب ہی نگاہ دائیں طرف قدرے الگ تھلک بنے کمروں کی طرف اٹھ گئی، جہاں گاؤں تکیے سے ٹیک لگائے بارش بزرگ صورت شخص محور مطالعہ تھا اس کی پوری توجہ ہاتھ میں پکڑی کتاب پر مبذول تھی۔

ارتج کا دل دھڑک دھڑک کر بے تاب ہو بے کل ہو رہا تھا۔
”کیا یہی ہیں؟“

اس کے قدم بے تابانہ ان ہی کی طرف اٹھ گئے۔
دروازے سے روشنی آتا معدوم ہوئی تو ماسٹر صاحب نے چونک کر سراٹھایا۔ جینز اور شرٹ میں ملبوس
اجنبی لڑکی کو دیکھ کر وہ چونک کر سیدھے ہوئے۔
”کس سے ملنا ہے بیٹی؟“ ان کے ذہن میں پہلا خیال یہی آیا کہ شاید کوئی قرۃ العین کی یونیورسٹی فیلو ہوگی
مگر وہ تو ابھی یونیورسٹی سے لوٹی ہی نہ تھی۔
وہ اپنی بھیگی نگاہوں سے انہیں دیکھتی رہی۔
ماسٹر صاحب کو ابھنسی ہوئے لگی تھی۔
”کیا بات ہے بیٹی!“

”آپ۔۔۔ آپ ماسٹر صلاح الدین ہیں۔“ اس نے انک انک کر پوچھا۔ اس کی نگاہیں ترس ترس کے
ان کے چہروں زدہ چہرے کا طواف کر رہی تھیں۔
ماسٹر صاحب بری طرح چونکے۔
”کسم۔۔۔ کسم دیں۔۔۔ آپ ہی ہیں۔“
انہیں لگا انہوں نے اگر انکار کیا تو وہ لڑکی مر جائے گی۔
انہوں نے اثبات میں سر ہلادیا۔

ارتج کو قدم آگے بڑھی۔ انہوں نے کچھ پوچھنا چاہا مگر وہ ضبط کا بندھن کھو بیٹھی۔ گھٹنوں کے بل بیٹھ کر
اس نے ان کا چہروں زدہ ہاتھ تھاما اور اس پر اپنی پیشانی ٹکا کر پھوٹ پھوٹ کر رو دی۔
”کیوں کیا آپ نے ایسا بابا؟ کیوں کیا؟ میرا وجود اتنا بڑا بوجھ تھا آپ کے لیے؟ کتنی آسانی سے مجھے
دوسروں کی جھولی میں ڈال دیا۔ کہتے ہیں بیٹی رحمت ہوتی ہے“ آپ نے کیوں اس رحمت کو ٹھکرا دیا بابا۔
اور پھر مڑ کر خبر بھی نہ لی۔ یہ بھی نہ دیکھا کہ وہ بچی کس حال میں ہے۔“

”کون۔۔۔ کون ہو تم۔۔۔؟“ وہ گڑبڑ سے گئے۔
”میں۔۔۔“ اس نے بھیگا ہوا چہرہ اوپر اٹھایا۔ ”میں آپ کی بیٹی ہوں بابا۔ وہ بیٹی جسے بیگم عثمان کی جھولی
میں ڈال کر آپ بھول گئے تھے۔“ ماسٹر صاحب ششدر سے رہ گئے۔
”تم۔۔۔“

”آپ مجھے اب بھی نہ ملتے تو میں مرجاتی بابا! آپ کو نہیں پتا میں نے کیسے زندگی گزاری ہے۔ میں ان
سب کے درمیان اجنبی تھی۔ میں ان میں سے نہیں تھی بابا۔“
وہ بچوں کی طرح ہلک ہلک کر رو رہی تھی اور اس کے عقب میں کھڑی خوش بخت دم بخود کھڑی تھیں۔

ابھی ابھی نومی نے آکر بتایا تھا کہ کوئی پینٹ والی لڑکی بابا سے ملنے آئی ہے، وہ کڑاہی چڑھائے بیٹھی تھیں۔ کچھ حیران سی ہو کر وہ سب چھوڑ چھاڑ کر آئی تھیں اور اب دم بخود کھڑی تھیں۔

”بابا! چپ کیوں ہیں بولے نا۔ کیا اب بھی اپنی بیٹی کو گلے سے نہیں لگائیں گے۔ میں بہت ترسی ہوں بابا! وہ لوگ بہت اچھے تھے مگر میرے نہیں تھے۔“ بابا کے ساکت وجود میں جنبش ہوئی۔ انہوں نے جھک کر اس کے سر پر بوسہ دیا تو جیسے اس کی سسکیاں قہقہہ سی گئیں۔

بابا نے سر اٹھا کر ساکت کھڑی خوش بخت کو دیکھا۔
”خوش بخت بیٹا! بسن کو لے جا کر قرۃ العین کا کوئی سوٹ نکال دو۔ اس کے کپڑے گیلے ہیں، بیمار ہو جائے گی۔“

”جی۔۔۔“ انہوں نے بے حد چونک کر بابا کو دیکھا۔ انہوں نے سنجیدگی سے اشارہ کیا تو انہوں نے آگے بڑھ کر اس کے کندھے پر ہاتھ رکھا۔

”چلو گزریا۔۔۔“

”میرا نام ارتج ہے۔“ اس نے اٹھتے ہوئے بتایا پھر سوالیہ نظروں سے بابا کو دیکھا۔

”آپنی ہے تمہاری خوش بخت۔۔۔“

ارتج بے اختیار پلٹ کر ان کی طرف بڑھی پھر جھجک کر رک گئی۔

”میں بہت ترسی ہوں ان رشتوں کو آپ!“

خوش بخت نے مسکرا کر اسے گلے سے لگالیا پھر ساتھ لے کر ایک کمرے میں چلی گئیں۔ کمرے میں ڈبل بیڈ، رائٹنگ ٹیبل اور وارڈروپ تھی۔ رائٹنگ ٹیبل پر کتابوں کے ساتھ چھوٹا ٹیپ ریکارڈر اور بہت سی کمپٹس پڑی تھیں۔

”یہ یعنی اور نور کا کمرہ ہے۔“

”یعنی اور نور؟“ اس نے سوالیہ نظروں سے انہیں دیکھا۔

”تمہاری بہنیں، یعنی تو تمہاری ہم عمری ہوگی۔ نور البتہ چھوٹی ہے۔“

”ہم عمر کیا مطلب۔۔۔؟ یا تو وہ مجھ سے چھوٹی ہوگی یا بڑی۔“ ارتج نے چونک کر پوچھا۔

”ایک آدھ سال کی چھوٹائی بڑائی کیا۔“ انہوں نے مسکراتے ہوئے وارڈروپ کھولی۔

”یعنی انگلش میں ماسٹرز کر رہی ہے، نور میٹرک کے ایگزیم کے بعد فارغ ہے۔“

”کہاں ہیں دونوں؟“ اسے مزید بے تاب نے گھیر لیا۔ اتنے سارے لوگ اس کے اپنے تھے اور اس نے

اک عمر تمنائی کا زہریا تھا۔

”یعنی یونیورسٹی میں ہوگی۔ بارش کی وجہ سے لیٹ ہو گئی ہے۔ ارمغان بھی ابھی تک نہیں آیا۔ شاید

یعنی کو لینے چلا گیا ہو۔ نور صبح ماموں کے ہاں گئی ہے، کل آئے گی۔“

”ارمغان!“ وہ سب کچھ ہی جان لینا چاہتی تھی۔
 ”ہمارا اکلوتا بھائی۔۔۔“ خوش بخت نے روانی میں بتایا پھر ٹھٹک کر بولی۔
 ”تمہارا بھی۔۔۔“

”یہ عینی کے کپڑے ہیں تمہارے پورے ہوں گے کوئی نکال لو۔“ انہوں نے اس کی چوائس پر چھوڑا
 مگر وہ فوراً بول اٹھی۔

”کوئی سا بھی نکال دیں آپ!“

خوش بخت نے لائٹ پنک میوین امیر اینڈری والا کائن کا سوٹ نکال کر اس کی طرف بڑھادیا۔ تب ہی
 نومی بھاگتا ہوا آیا۔

”آئی! آپ کو بابا بلا رہے ہیں۔“ اس نے چونک کر خوش بخت کو دیکھا۔

”یہ میرا بیٹا ہے نومی۔“

”آپ کی شادی ہو گئی ہے۔“ اس نے بے حد حیرت سے نازک اور کامنی سی خوش بخت کو دیکھا۔

”ظاہر ہے اسی لیے تو یہ میرا بیٹا ہے۔“ انہوں نے ہنستے ہوئے کہا۔ ”چھاتم کپڑے بدلو، میں بابا کی بات
 سن کر آتی ہوں۔“

ان کے جانے کے بعد وہ کچھ لمحے سوٹ ہاتھ میں لیے یونہی کھڑی رہی۔

”آئی ایم ساری می! میں نے آپ سے وعدہ کیا تھا کہ میں انہیں نہیں ڈھونڈوں گی مگر میں رہ نہ سکی۔“
 وہ زیر لب بڑبڑاتی۔

کپڑے بدل کر باہر آئی تو بارش ہلکی ہو گئی تھی۔ نومی بیچرے کے پاس کھڑا تو توں سے ان ہی کی زبان میں
 باتیں کرتے ہوئے بھاگ بھاگ کر جامنیں اکٹھی کر رہا تھا۔

اسے سچے سچائے نیم تاریک بیڈروم کی سرد تنہائی یاد آگئی۔ تو وہ ستون کے پاس رک کر نومی کو دیکھنے
 لگی۔ بارش میں پورے کا پورا بھیگا۔ خوش اور گمن وہ یہاں ہوتی تو اس کا بچپن بھی اتنا ہی خوبصورت اور
 بے فکر ہوتا۔ اسے اپنی بارش میں بھیگنے کی حسرت یاد آئی اور مالی کی بیوی کے پاس اس کے بچوں میں گھس
 کر پکڑے کھانا۔ وہ مسکرا دی، تب ہی پکڑوں کی خوشبو نے اس کی رہنمائی کی تو وہ سائیڈ پر بنے کچن کی
 طرف بڑھی۔ چھوٹا سا صاف ستھرا کچن تھا۔ خوش بخت اپنی پکڑے کڑا ہی سے نکالنا بھول گئی تھیں۔
 ”آئی۔۔۔“ اس رتج نے پکارا تو وہ چونک گئیں۔

”پکڑے سارے جل گئے۔“

”اوہ۔۔۔“ وہ کچھ خفیف سی ہو کر پکڑے نکالنے لگیں۔

”کیا سوچ رہی تھیں؟“ اس رتج ان کے پاس بیٹھی۔

”کچھ خاص نہیں۔“

”آپ کو میرا یہاں آنا برا تو نہیں لگا۔“ اک ہلکا سا خوف تھا۔

”بگلی! برا کیوں لگے گا لو پکوڑے کھاؤ۔“ انہوں نے پہلے نکالے گئے پکوڑے اس کے سامنے رکھے۔
”بابا۔۔۔“

”وہ ظہر کی نماز پڑھنے گئے ہیں۔“ خوش بخت نے بتایا تو وہ خاموش ہو کر نجانے کیا سوچنے لگی۔ خوش بخت نے چوہا بند کیا اور فریج سے وہی نکال کر رانتے کے لیے پھینٹنے لگی۔
”آئی! آپ کو پتا تھا کہ آپ کی کوئی اور بسن بھی ہے۔“ اس نے اچانک سوال کیا۔ خوش بخت کا ہاتھ ایک پل کو تھم گیا۔

”ہاں۔۔۔“
”ارمغان! یعنی اور نور کو۔“ اس نے اگلا سوال کیا۔ خوش بخت نے ایک نظر اس کے خوبصورت چہرے پر ڈالی۔ بے تحاشا رونے سے اس کی آنکھیں سرخی ہو رہی تھیں۔

”نہیں۔۔۔“
”آئی۔۔۔“

”باتیں تو ہوتی رہیں گی ارتج۔“ خوش بخت نے نرمی سے اس کی بات قطع کی۔
”ابھی وہ لوگ آتے ہوں گے۔ چلو برآمدے میں میز لگادیں، وہیں بیٹھ کر کھائیں گے۔ مزا آئے گا۔“
تب ہی نوی بھاگتا ہوا آیا۔ اس کے ہاتھ میں جامنوں سے بھری پلیٹ تھی۔
”امی! دیکھیں میں نے کتنی ساری جامنیں اکٹھی کر لیں۔“
”اچھا۔ انہیں دھو کر ٹیبل پر رکھو، ماموں اور خالہ آتے ہی ہوں گے۔“ خوش بخت نے کہا تو وہ سنک کی طرف بڑھ گیا۔ پلیٹ ایک طرف رکھی، کن آنکھوں سے ارتج کو دیکھتے ہوئے ماں کے کندھے پر جھکا۔
”امی! یہ کون ہیں۔“

”یہ بھی تمہاری خالہ ہیں۔“ خوش بخت نے بتایا تو ارتج نے مسکرا کر اس کی سمت دیکھا۔

”کون سی کلاس میں پڑھتے ہو نوی۔۔۔؟“

”کلاس تھری۔۔۔“

”یہاں میرے پاس آؤ۔“ ارتج نے پکارا تو وہ جھجکتا ہوا اس کے پاس آگیا۔ ارتج اس سے چھوٹی چھوٹی باتیں کرنے لگی۔ ذہین اور ہوشیار بچہ تھا۔
خوش بخت نے پکوڑے، جامنیں، رانتے اور امی کی چٹنی برآمدے میں ٹیبل پر رکھ دی۔ ابھی وہ لوگ بیٹھے ہی تھے کہ ارمغان اور یعنی آگئے۔ بارش رک گئی تھی۔
”وہ مارا۔۔۔ مجھے پہلے ہی پتا تھا۔“ ارمغان نے نعرہ لگایا۔

”اف! آج تو بھوک بھی زوروں کی لگی ہے۔“ یعنی نے کہا اور آگے بڑھ آئی۔ ارمغان موٹر سائیکل کھڑی کرنے لگا۔ یعنی اجنبی صورت دیکھ کر ٹھنک گئی مگر خوش دلی سے سلام کیا تھا اور سوالیہ نظروں سے خوش بخت کو دیکھا۔

”یہ ارتج ہے۔“ خوش بخت اتنا ہی کہہ کر خاموش ہو رہیں۔ تب ہی ارمغان سر کے بال جھٹکتا ہوا برآمدے میں آیا اور وہیں ٹھٹک گیا۔

”کیا یہ میرا تخیل ہے؟“

”آپ؎ وہ جو ہریل خوشبو کی طرح اس کے ساتھ ہوتی تھی جسے ہر رستی بارش میں اسی رستوران اور فلاور شاپ پر ڈھونڈا کرتا تھا۔ وہی جس کے نام اس نے اپنی ہر شام لکھی تھی۔ وہی جس کی خاطر اس نے اپنی زیست کے ہر لمحے کو سنبھال رکھا تھا۔ ادھ کھلے گلاب کی کہانی۔“

خالص لمحوں جیسی انمول لڑکی

یہ خواب تھا یا گمان

یہ سراب تھا یا حقیقت

”ارے تمہے۔“ ارتج کو خوشگوار سی حیرت ہوئی۔ خوش بخت نے ان دونوں کو دیکھا۔

”ارمغان۔۔۔ یہ یہ۔۔۔ ارتج ہے۔ ہماری بہن۔۔۔“

ارمغان کو لگا، ہزاروں ہم ہیں جو اس کے وجود کے اندر پھٹے تھے۔ اس نے وہیں کھڑے اپنے وجود کو ریزہ ریزہ ہو کر بکھرتے دیکھا۔



کسی نے حال پوچھا تھا ہمارا

کسی کی آخری بس جاری ہو

کوئی اسٹاپ پر تنہا کھڑا ہو

مسلل رات گہری ہو رہی ہو

ہمارا حال ایسا ہے سمجھ لو

کسی کو کوئی یاد آتا ہی نہ ہو

کسی کو کوئی شے بھاتی ہی نہ ہو

کسی کا کوئی بھی اپنا نہ ہو

کسی کا کوئی بھی ساتھی نہ ہو

ہمارا حال ایسا ہو گیا ہے

کہ جیسے اپنا سب کچھ کھو گیا ہے

شگفتہ ناؤ ڈولی جاری ہے

نہیں ابھرا بھنور میں جو گیا ہے

بھنور کو جب کوئی ساحل سمجھ لے
 کوئی منقل کو ہی منزل سمجھ لے
 وہ اپنا حال دل سمجھ لے
 ہمارا حال ایسا ہے سمجھ لو
 نجانے میں کہاں کھڑا ہوں
 شاید زمین کے آخری کنارے پر
 میرے قدم لڑکھڑا رہے ہیں مگر۔ اپنے ڈولتے وجود کو سورج نہیں تھام سکتا۔
 سورج جو میرے اتنا قریب ہے کہ میں پگھل کر اپنے ہی قدموں میں آ پڑا ہوں۔ ابھی کچھ لمحے پہلے مجھے
 میرے ہونے کا احساس تھا۔
 میں وہیں کھڑا تھا اپنے دھیان کی سڑک پر فلاور شاپ کے سامنے برستی بارش میں بھگتا ہوا۔
 بارش جو خوشبو برساتی تھی
 بہت سے پھولوں میں اک ادھ کھلا گلاب
 میری معصوم و پاکیزہ محبت کی علامت
 مگر ہوا کیا؟
 آسمان کی کوکھ بھر ہو گئی
 ادھ کھلا گلاب، میرے ہی قدموں تلے آ کر روند گیا۔
 میں نے پانی آنکھوں سے اس فلاور شاپ کو بھڑبھڑ چلتے دیکھا کیونکہ آج میں نے اسے تیسری بار اپنے
 گھر میں دیکھا۔
 اور کس روپ میں دیکھا۔
 ایک پل کو میرا دل چاہا میں خود کشی کر لوں۔
 مگر میں اب بھی زندہ ہوں۔



وہ بے حد خوش تھی۔ اسے لگا زمین و آسمان اس کی دسترس میں آ گئے ہیں۔ اس نے پہلی بار خوشی
 خالص خوشی کے احساس کو چھو کر محسوس کیا تھا وہ وہاں سے کبھی واپس نہ آتی مگر بابائے کما-وہ رات یہاں
 رک گئی تو می پریشان ہوں گی۔
 وہ کہنا چاہتی تھی کہ می پریشان نہیں ہوتیں۔ انہیں تو خبر بھی نہ ہو گی کہ ارتج گھر لوٹی تھی یا نہیں۔ مگر وہ
 خاموش ہو کر لوٹ آئی تھی۔ ساری رات مارے خوشی کے اسے نیند نہ آئی۔ اس کا دل چاہتا تھا وہ ایک
 ایک کو پکڑ کر تائے کہ اسے اس کے اپنے مل گئے ہیں۔ اب اگر وہ یہاں سے بے دخل بھی کر دی جائے تو وہ

ایکلی نہیں ہوگی۔ بہت سے لوگ ہوں گے اسے سارا دینے کو۔ اس کے اپنے لوگ۔ اس کا باپ اس کی بہنیں، اس کا بھائی، حالانکہ ارمغان کا رویہ خاصا حوصلہ شکن تھا۔ جبکہ وہ خود خوشی سے اچھل ہی تو پڑی تھی۔ جب اس نے ارمغان کو وہاں دیکھا۔ مگر وہ ٹھٹھکی باندھے اسے دیکھتا رہا۔ اور جب خوش بخت آپلی نے قدرے حیرت سے پوچھا۔

”تم دونوں ایک دوسرے کو جانتے ہو؟“

”ہسن۔“ اس نے آپلی کا سوال گویا سنا ہی نہیں۔ بس زیر لب دہرایا تھا۔

”بچپن میں بابا نے اسے کسی بے اولاد جوڑے کو دیے دیا تھا۔“ انہوں نے بے حد آہستگی سے بتایا۔ تو جہاں یعنی نے ہاتھ میں پکڑی پلیٹ واپس ٹیبل پر رکھی تھی وہیں وہ ایک دم مڑا اور لمبے لمبے ڈگ بھرتا ہر نکل گیا۔

اس نے گھبرا کر خوش بخت کی سمت دیکھا۔ وہ گڑبڑاسی گئی تھیں۔

”اچانک انکشاف ہوا ہے نا بعد میں آئے گا تو تم سے ٹھیک طرح سے ملے گا۔ تم لوہیہ۔“ انہوں نے بات بدل دی تھی۔ مگر وہ شام ڈھلے تک نہیں لوٹا تھا۔ بعد میں بابا بھی آگئے۔ یعنی اچھی خوش مزاج لڑکی تھی۔ ارتج کو لگا اس کی یعنی کے ساتھ دوستی ہو جائے گی۔ نور سے ابھی وہ ملی نہیں تھی اور وہ ارمغان۔ دوستوں کی طرف نکل گیا ہو گا۔“ اس کے پوچھنے پر بابا نے اطمینان سے جواب دیا۔



اگلی صبح اس نے اپنا داروڑوب کھولا۔ اس کے پاس چند ہی شلوار سوٹ تھے۔ اس نے گرے سوٹ نکال کر پہن لیا۔ بالوں کو سمیٹ کر کلپ کیا اور بنا میک اپ کے نکل آئی۔ جہاں وہ جا رہی تھی وہاں ان مصنوعی لوازمات کی ضرورت نہ تھی۔

دروازہ خوش بخت نے کھولا تھا اسے دیکھ کر مسکرا دیں۔

”بابا کو یقین تھا کہ تم صبح ہی آ جاؤ گی۔ اور وہ بھی بیٹا ناشتہ کیے۔“

”اچھا۔“ وہ ہنس دی، پھر بیٹھک کے بند دروازے کی طرف دیکھ کر پوچھنے لگی۔

”کہاں ہیں بابا؟“

”اسکول گئے ہیں۔ حالانکہ جب سے ارمغان کی جا ب ہوئی ہے، وہ یہی کہتا ہے کہ ریٹائرمنٹ لے لیں۔ مگر بابا بضد ہیں کہ قبل از وقت ریٹائرمنٹ نہیں لیں گے۔“

”یعنی اور نوی؟“

”چلے گئے یونیورسٹی اور اسکول۔“ وہ اسے لے کر کین میں چلی آئیں۔

”کیا لوگ تم ناشتہ میں۔ پر اٹھایا ڈبل روٹی؟“ انہوں نے فریج کھولتے ہوئے پوچھا۔

”کچھ بھی دے دیں۔ پر اٹھا بنا دیں۔“ اس نے فرمائش کی ”انہوں نے فریج سے آٹا نکال کر باہر رکھا۔
 ”پہلے میں ارمغان کو دلیہ دے آؤں۔“ انہوں نے ایک پیالے میں دلیہ نکالتے ہوئے کہا تو وہ چونک
 گئی۔

”ارمغان گھر پر ہے؟“

”ہاں۔۔۔ اسے بخار ہے۔“ خوش بخت نے بتایا ”پھر قدرے جھنجھلا کر بولیں۔“ ”ایک دم احمق ہے۔ کل
 ساری رات بارش میں بھٹکتا رہا۔“

”میں بھی اسے دیکھ لوں۔“ ”ارتج قدرے پریشان سی ہو کر ان کے ساتھ ارمغان کے کمرے میں آئی وہ
 آنکھیں موندے لیٹا تھا۔ آہٹ پر آنکھیں کھول کر دیکھنے لگا۔ ارتج کو دیکھ کر اس کی آنکھوں کی سرخی میں
 کچھ اور اضافہ ہو گیا تھا۔

”کیسے ہوا ارمغان؟“ اس نے مسکرا کر پوچھا۔ ”بیمار ہو گئے۔“ وہ اس کے قریب آئی اور دوسرے پل
 اس کا ہاتھ ارمغان کی پیشانی پر تھا۔

ارمغان کو لگا اس کی پیشانی پر جلتے ہوئے انگارے آپڑے ہیں۔ اس نے ارتج کی کلائی کو جھٹکا دے کر
 ہاتھ ہٹایا اور تیزی سے کروٹ بدل لی۔
 ارتج ششدر سی رہ گئی۔

خوش بخت دم بخود۔ پھر ایک دم سنبھل کر بولیں۔

”بیماری میں یونہی چڑچڑاؤ اور بد مزاج ہو جاتا ہے۔“ انہوں نے تنبیہ بھی لگا ہوں سے ارمغان کو گھورتے
 ہوئے ارتج کو وضاحت دی۔ جس کا چہرہ ایک دم فنی ہو گیا تھا۔

”اٹھو ارمغان! دلیہ کھاؤ۔“

”مجھے نہیں کھانا۔“ اس کا لہجہ سخت بے زار تھا۔ ”فضول باتیں نہیں، ایک تو اوٹ پٹانگ حرکتیں
 کرتے ہو اور پھر نخرے بھی، کس نے مشورہ دیا تھا ساری رات بارش میں نہانے کا۔ مجھے تو یحییٰ نے صبح بتایا
 ورنہ اسی وقت پٹائی لگاتی۔“

”رکھ دیں آپ! کھاؤں گا۔“ پتا نہیں وہ ہمیشہ اتنی شرافت سے ان کی ڈانٹ کھا لیتا تھا، یا ارتج کے
 سامنے ہی خاموش تھا۔

خوش بخت نے پیالہ میز پر رکھ دیا۔

”ضرور کھا لینا۔ میں ابھی آتی ہوں، آؤ ارتج! تمہیں ناشتہ بنا دوں۔“

وہ کچھ خاموش سی ان کے ساتھ چلی آئی۔ خوش بخت نے فریج سے وہی کا پیالہ اور جیم نکال کر ٹیبل پر
 رکھا۔

”پہلے ہم لوگ دسترخوان پر ہی ناشتہ کرتے تھے۔ ارمغان کو پے پی ٹو سب سے پہلے یہ ناشتے کی ٹیبل
 خرید لایا۔“ انہوں نے پیرا بناتے ہوئے کہا۔

ارتج خاموش ہی رہی۔

انہوں نے پلٹ کر دیکھا۔ پھر اسے یونیورسٹی کے ساتھ ٹیک لگائے کچھ سوچتے پایا تو کہنے لگیں۔
”کھڑی کیوں ہوا رتج! بیٹھو نا۔“

وہ خاموشی سے آکر بیٹھ گئی۔ حالانکہ اس کا دل اب ناشتہ کرنے کو نہیں چاہ رہا تھا، اتنے لوگوں کی محبت کے درمیان اس ایک شخص کی بے اعتنائی نے اسے افسردہ کر دیا تھا جو اس کا کلو تباہی تھا۔
آپنی نے پراٹھا اور گرم سالن اس کے سامنے رکھا تو وہ بے اختیار پوچھنے لگی۔
”ارمغان کو میرا یہاں آنا اچھا نہیں لگتا؟“ خوش بخت نے نیلی آنکھوں کی صاف سطح پر غم کی لکیریں دیکھیں۔

”پاگل! اچھا کیوں نہیں لگے گا۔ لیکن میں نے تمہیں بتایا نا، بیماری میں وہ یونیورسٹی بد مزاج ہو جاتا ہے۔ اگر بابا کو پتا چلا تو دیکھنا کیسے کا کھینچیں گے۔“
”اے نہیں آپ! بابا کو مت بتائیے گا۔ اس طرح تو وہ مجھ سے اور بھی چڑ جائے گا۔“ وہ فوراً بول اٹھی تو خوش بخت ہنس پڑیں۔

”آپ کی ہنسی بہت خوبصورت ہے آپ۔“
”خوبصورتی کا لفظ تو تم پر ختم ہوتا ہے میری جان۔“ خوش بخت نے اس کی ٹھوڑی چھو کر محبت بھرے لہجے میں کہا تو وہ جھینپ سی گئی۔

”لیکن اب تم پراٹھا ٹھنڈا کر رہی ہو۔ کو تو آلیٹ بنا دوں۔“
”نہیں آپ! یہ کافی ہے۔ آلیٹ تو میں یوں بھی نہیں کھاتی۔“
”اچھا میں دیکھتی ہوں کہ ارمغان نے دلیہ کھایا یا نہیں“ اگر میں نہ ہوں تو یہ لڑکا تو بس۔“
”آپ کا گھر کہاں ہے آپ؟“

”میرا گھر۔“ وہ ایک دم چپ ہوئیں، پھر مسکرا کر پوچھنے لگیں۔
”کیوں یہ میرا گھر نہیں ہے؟“
”میرا مطلب ہے۔“

”میرے شوہر کا گھر۔“ انہوں نے بات قطع کی۔
”آپ ہی کا ہوا۔“

”ہاں۔ شاید۔“ ان کا لہجہ عجیب سا ہو گیا۔ پھر لہجہ بدلتے ہوئے بولیں۔ ”اسی شہر میں ہے۔“
”آپ کتنے دنوں کے لیے آئی ہیں۔“ اسے خوش بخت میں ماں جیسی محبت و شفقت محسوس ہوئی تھی۔
”پتا نہیں۔“ ان کا چہرہ تاریک سا ہو گیا۔
”کیا مطلب؟“

”طارق اپنے کام کے سلسلے میں شہر سے باہر گئے ہیں۔ میں یہاں آگئی۔“
 ”آپ کے سرال میں کوئی اور نہیں ہے۔“
 ”نہیں۔“ وہ جلدی سے کھڑی ہو گئیں۔ ”میں ارمنان کو دیکھ لوں۔“
 ”یوں لگتا ہے خوش بخت آپ اپنی گھر میں خوش نہیں ہیں۔“ ارتج کو یہ سوچ کر ہی دکھ ہوا تھا۔



اسے اچانک احساس ہوا تھا کہ می ناشتہ کرنے کے بجائے مسلسل اسے دیکھ رہی ہیں اس نے بنانا کی طرف دیکھے چائے کالک لبوں سے لگالیا۔ کچھ لمحوں کے بعد اسے الجھن سی محسوس ہونے لگی۔
 ”کیا ہوا می؟“ کب واپس رکھ کر اس نے می کو دیکھا۔
 ”تم صلیح کے گھر گئی تھیں۔“ انہوں نے اچانک پوچھا تھا۔ ایک پل کو وہ گڑبڑا گئی، پھر گویا تسلیم کرتے ہوئے بولی تھی۔

”آئی ایم ساری می۔“
 ”میں نے تمہیں منع کیا تھا۔“ می کو غصہ آگیا۔
 ”میں خود کو روک نہیں سکی۔“
 ”ارتج! میری بات غور سے سنو! اب تم وہاں نہیں جاؤ گی۔“ انہوں نے گویا حتمی انداز میں اس پر پابندی عائد کی تھی۔ وہ کرسی گھسیٹ کر کھڑی ہو گئی۔
 ”ارتج! میری بات کا جواب دو۔“
 ”آپ کی بات کا کیا جواب دوں می! آپ مجھے ایسے شخص سے ملنے سے روک رہی ہیں جو میرے فادر ہیں۔“ می کچھ لمحے اسے دیکھتی رہیں۔
 ”تیمور کب واپس آ رہا ہے؟“
 ”مجھے کیا معلوم۔“

”بیگم زمان اپنے بیٹے کا پوزل لے کر آئی ہیں۔“ می نے بتایا۔ تو کپ اٹھاتے ہوئے اس نے بیگم زمان کے بیٹے کے بارے میں سوچا تب اسے رضا زمان یاد آگیا۔
 ”فادر گاڈ سیک می! مجھے اس سے شادی نہیں کرنا۔“
 ”تیمور بھی تم میں انٹرنسٹڈ ہے۔“ انہوں نے اگلا پوزل پیش کیا۔
 ”بٹ آئی ایم ناٹ انٹرنسٹڈ۔“
 ”تو پھر تم کس میں انٹرنسٹڈ ہو؟“ می کو شدید قسم کے غصے نے گھیر لیا۔
 ”مجھے کسی سے شادی نہیں کرنا ہے۔“ وہ حتمی لہجے میں کہہ کر اٹھ گئی۔ می شدید غصے میں بیڑا تاتی رہ گئی تھیں۔



اسے گھر سے نکل کر ظاہر ہے وہیں آنا تھا، چھٹی کا دن تھا۔ برآمدے میں بابا بیٹھے اخبار دیکھ رہے تھے۔ عینی نے واشنگ مشین لگا رکھی تھی۔ نور اور نومی کتابیں کھولے بیٹھے تھے۔ پاس ہی خوش بخت عینی کی قمیص کی کٹائی کر رہی تھیں، ارمغان پنجرے کے پاس کھڑا پردوں کو دانہ ڈال رہا تھا۔

”آخر پکڑ لی یا نہیں نے تمہیں۔“ وہ ارمغان کو دیکھ کر ہنس دی۔ جبکہ اس کے چہرے پر تناؤ سا چھا گیا۔ اس نے ہاتھ میں پکڑا دانہ ایک ساتھ پنجرے میں ڈال دیا۔ اس سے قبل کہ وہاں سے چلا جاتا رتیج نے اس کا بازو تھام لیا۔

”نہیں بھائی! آج میں صرف تمہارے لیے آئی ہوں کہ تم چھٹی کے دن گھر ہو گے۔“ وہ ہنسی لہجے میں

کہا۔

”مرمغن۔“ بابا کی آواز میں تنبیہ تھی۔ وہ بادل ناخواستہ اس کے ساتھ چلتا ہوا برآمدے تک آیا۔

”کبھی ہوا رتیج بیٹا۔“ بابا نے شفقت سے اس کے سر پر ہاتھ پھیرا۔

”بالکل ٹھیک ہوں، تم لوگ کیا پڑھ رہے ہو۔“ اس نے بابا کے پاس بیٹھتے ہوئے نور اور نومی سے پوچھا تو نور قدرے منہ بنا کر بولی۔

”بابا نے ابھی سے انگلش پڑھانا شروع کر دی ہے۔“ بابا ہنس دیے۔

”ٹھیک ہے، تمہاری آپنی کے آنے کی خوشی میں چھٹی کر دیتے ہیں۔“

نور العین نے تیزی سے کتابیں سمیٹ کر رکھ دیں۔ وہ چند دن قبل ہی نور سے ملی تھی، نور تو خوشی سے اچھل ہی پڑی تھی کہ اتنی پیاری لڑکی اس کی آپنی تھی، بابا اس سے ادھر ادھر کی باتیں کرتے رہے، ارمغان ستون سے لپٹی تیل کے سبز پتے نونج نونج کر نیچے پھینکتا رہا۔ عینی نے مشین بند کی اور فرش دھونے لگی تھی، تھوڑی دیر میں بابا اٹھ گئے۔

”سچ آپنی! امیر لال چاہتا ہے میں یہیں آ جاؤں۔“

”تو آ جاؤ نا۔“ عینی نے مڑ کر کہا۔ تب ہی ارمغان پر نظر پڑی تو چیخ اٹھی۔

”ارمغان! کیا کر رہے ہو۔ ساری تیل کا ستیاناس کر دیا ہے۔“ ارمغان کے قریب پتوں کی ڈھیری سی لگ گئی تھی۔

ارتیج نے شاکی نظروں سے ارمغان کو دیکھا۔

”صرف ارمغان کی وجہ سے نہیں آتی۔ اس نے ابھی تک مجھے اپنی بہن تسلیم نہیں کیا۔“

ارمغان نے اس سختی سے اپنا ہونٹ کاٹا کہ اس سے خون پھلکنے لگا۔ اک اذیت سی رگ و پے میں سرایت کر گئی۔ تب ہی تند و تلخ اور رکھائی لیے لہجے میں گویا ہوا۔

”آپ کو میری فکر کرنے کی ضرورت نہیں۔“

”تو پھر میں آ جاؤں؟“ وہ اٹھ کر اس کے قریب چلی آئی۔ اس کے وجود سے پھوٹی خوشبو نے اسے بے

چہین سا کر دیا۔

”تو پھر آ جاؤں بھائی۔“ ارج نے دوبارہ پوچھا۔

ہر بار اک کوڑا سا اس کے وجود پر پڑتا تھا۔

”آپ کی مرضی ہے۔“ اس کا لہجہ ہنوز وہی تھا۔

”خوش بخت آئی۔“ ارج نے غصہ میں کھڑے ہو کر دونوں ہاتھ ارمغان کے کندھوں پر رکھے، ارمغان

کو لگا، اک پہاڑ سا بوجھ اس کے دونوں کندھوں پر آگرا ہے۔

”ارمغان مجھ سے چھوٹا ہے یا بڑا۔“

”بڑا ہی ہوگا۔“ خوش بخت کی سمجھ میں نہ آیا کہ اس پتویشن کو کیسے سلجھائیں۔ ارمغان کو کتنا سمجھایا

تھا بابائے اور خود انہوں نے بھی۔

”ہو گا کیا مطلب، ٹھیک ٹھیک بتائیں نا۔“

”بڑا ہی ہے۔“ انہوں نے آہستگی سے کہا۔

”تو پھر یہ مجھے آپ۔ آپ کیوں کہہ رہا ہے۔“ اس نے ہاتھ ہٹائے۔ ارمغان کا رکاوٹ اس سانس بحال

ہوا۔ وہ وہاں سے بھاگ جانا چاہتا تھا۔

”اس کی تو تم بات ہی چھوڑو۔“ یعنی کام ختم کر کے ادھر ہی چلی آئی۔ ”نجانے کیا ہو گیا ہے اس کو، ہر

وقت صدم کلم بیٹھا رہتا ہے۔ سوال کچھ کر، جواب کچھ اور ملتا ہے۔“

”بھائی تو اب آس کر کم کھلانے بھی نہیں لے جاتے۔“ ٹورنے بھی شکایت کی۔

”پتا ہے آئی!“ ارج مڑ کر ان کے پاس بیٹھی۔ ”کچھ عرصے پہلے میں اک فلاور شاپ پر کام کرتی تھی۔“

”تم کام کرتی تھیں۔“ یعنی نے بے حد حیرت سے سوال کیا۔

”ہاں، وہ میرے یونیورسٹی فیلو کی شاپ تھی۔ میں نے یونیورسٹی فار انجوائے منٹ کام کیا تھا تھوڑا

عرصہ۔“

”بڑے عیش تھے تمہارے۔ انجوائے منٹ کے نام پر کیا کیا کرتی تھیں۔“ یعنی نے کہا۔

”عیش کہاں یا۔۔۔ وقت بھی تو کٹتا تھا۔“

ارمغان اٹھ کر کھڑا ہو گیا۔ ”آئی! میں باسٹ کی طرف جا رہا ہوں۔“

”ارے۔ ارے بھاگے کہاں جا رہے ہو بھائی!“ ارج چلائی۔ ”آئی! پہلے ان سے پوچھیں۔ یہ ہر روز

وہاں سے پھول کس کے لیے خریدا کرتے تھے۔“

”کیا۔۔۔؟“ یعنی اور نور چیخیں۔ ارمغان نے نیل کی اک پوری شلخ نوچ جڑالی۔

”اور حیرت کی بات یہ ہے کہ یہ ہمیشہ وہ پھول وہیں شاپ پر چھوڑ آتے تھے۔“

”شٹ اپ۔۔۔“ ارمغان ایک دم اس کی سمت گھوما۔ ”ول یو شٹ اپ پلیز۔“ اس کی آنکھیں سرخ

ہو کر جلنے لگی تھیں۔

خوش بخت نے ایک جھٹکے سے سر اٹھا کر ارمنغان کو دیکھا، پھر ہکا بکا کھڑی ارتج کو ارمنغان کچھ لمبے اپنی سرنگا ہیں اس کے چہرے پر گاڑے کھڑا رہا۔ پھر جھٹکے سے مرکز باہر نکل گیا۔ سب جہاں تھے وہیں کھڑے رہ گئے۔



ارمنغان کا رویہ اسے اپ سیٹ کر گیا تھا۔

”ایسا کیا کہہ دیا تھا میں نے۔“ اس نے نم آنکھوں سے کئی بار خوش بخت سے سوال کیا تھا۔ وہ خاموش بس اسے دیکھ کر رہ گئیں۔ یعنی نے کئی بار اسے تسلی دی تھی۔

”یار! وہ ایسا ہے۔ تم دل پر مت لو۔“

”پہلے تو ایسے نہیں تھے۔“ نور نے بھی کئی بار یہی بات کہی تھی۔

”تمہیں ارمنغان کے رویے پر پریشان نہیں ہونا چاہیے۔ یہ بابا کا گھر ہے اور ہم تمہاری بہنیں۔“ خوش بخت نے مستحکم لہجے میں کہا تھا۔ اور پیا سے صحرا کو چند بوندیں ہی بہت تھیں۔ وہ کب سے آنکھیں موندے یہی سب سوچ رہی تھی۔

”لو ارتج! جلدی سے پکڑو، ٹھنڈا ٹھار فالے کا شربت۔“ یعنی نے آکر اسے چونکا دیا۔ شربت سے بھرا جگہ اس کے سامنے ٹیبل پر رکھ دیا۔

”شربت تو میں پی لوں گی۔ پہلے تم یہ بتاؤ۔ یہ آؤر کون ہے؟“ ارتج نے پوچھا تو یعنی نے چونک کر نور کو دیکھا، وہ پوری دلجمعی سے جامنص کھانے لگی۔

”تم کیوں پوچھ رہی ہو۔“

”اے ابھی ابھی موصوف کا فون آیا تھا۔“ ارتج نے سنجیدگی سے جواب دیا۔

”اے تو تم نے مجھے کیوں نہیں بتایا۔“ وہ روانی میں بولی۔

”کیونکہ وہ تم سے بات کرنا نہیں چاہتا تھا۔“ ارتج ہنوز اسی لہجے میں بولی تھی۔

”کیا مطلب؟“ دوسرے پل اسے سمجھ میں آیا کہ فون دون سب کو اس ہے یہ ساری شرارت نور کی ہے۔

کیونکہ اس نے ارتج کے سامنے بڑے کارڈز دیکھ لیے تھے۔

”نور کی بیٹی۔“ وہ اسے گھورتے ہوئے پسلی۔ تو وہ جامنص چھوڑ چھاڑا ہر کی طرف بھاگی تھی۔ ارتج نے مسکراتے ہوئے شربت کا گلاس لبوں سے لگا لیا۔ یعنی نور کی ٹھیک ٹھاک کھنچائی کر کے ہی لوٹی تھی۔

”اچھا یہ تو بتاؤ، شادی کب تک متوقع ہے۔“

”یہ تو آذر کے حالات پر منحصر ہے۔“ اس نے ارتج کے سامنے بڑے آذر کے بھیجے کارڈز اکٹھے کرنے شروع کیے۔ نجانے کب چابی نور کے ہاتھ لگ گئی تھی۔
”مطلب؟“

”آذر کی ابھی جاب نہیں ہوئی ارتج! اور خالو کے مرنے کے بعد ساری ذمہ داری آذر کے کندھوں پر ہے۔ آذر کی تین بہنیں غیر شادی شدہ ہیں۔ جب تک وہ ان ذمہ داریوں سے عمدہ برآمد نہیں ہو جاتا شادی نہیں کر سکتا۔“

”اور تم تب تک کیا کرو گی؟“ ارتج نے حیرت سے اسے دیکھا۔
”ظاہر ہے انتظار، جو گزشتہ دو سال سے کر رہی ہوں۔“ اس نے سب کچھ سمیٹ کر الماری کے نچلے خانے میں سنبھال کر رکھ کر لاک کر دیا۔ ”میں نے یونیورسٹی میں ایڈمیشن ہی اس لیے لیا ہے کہ مجھے کوئی شادی کے لیے فورس نہ کر سکے۔“

”لیکن یعنی! اب تک! اسے وہ اگلے پانچ برسوں تک ان ذمہ داریوں سے۔۔۔“
”پانچ برس۔۔۔ میں نے تو ساری عمر اس کے نام لکھ دی ہے۔“ وہ ہولے سے ہنسی۔ ارتج بس اسے دیکھ کر رہ گئی۔

”اور آذر۔۔۔ وہ کیا کہتا ہے۔“
”اس کو کیا کہنا ہے، جب بھی کبھی ملاقات ہوتی ہے لڑائی پری ختم ہوتی ہے۔ موصوف اپنا سارا ڈپریشن مجھ پر ہی نکالتے ہیں۔“ وہ ہنستے ہوئے بتا رہی تھی۔ تب ہی خوش بخت اندر آئیں۔
”یعنی! ذرا آنا تو گوندھ دو۔“
”جی آپلی۔“ وہ فوراً ہی اٹھ گئی۔

”آپلی! آپ کے پاس امی کی تصویریں ہیں۔“ ارتج نے پوچھا۔
”ہاں دکھاؤں۔“ انہوں نے پوچھا تو اس نے اثبات میں سر ہلا دیا۔ وہ البم نکال لائیں نور بھی آگئی۔
”امی زندہ ہوتیں تو یقیناً“ مجھے دیکھ کر بہت خوش ہوتیں۔“ اس نے ماں کی تصویر پر نظریں جم کر پوچھا۔
”یقیناً۔“ خوش بخت کھوسی گئیں۔ ماں سے سب سے زیادہ قریب وہی تو تھیں۔
”امی بالکل آپ جیسی تھیں آپلی۔“ اس نے سراٹھا کر خوش بخت کو دیکھا۔
”ہاں سب یہی کہتے ہیں۔“

”میرے لیے تو آپلی ہی سب کچھ ہیں! امی تو مجھے یاد بھی نہیں۔“ نور نے پیار سے خوش بخت کے گلے میں بانٹیں ڈال دیں تو وہ مسکرا دیں۔

”اور ارمان بالکل بابا پر گیا ہے۔“
”آپلی! میں کس پر چلی گئی آپ میں سے تو کسی کی آنکھیں نیلی نہیں ہیں۔“ ارتج نے پوچھا تو نور بول اٹھی۔

”آپ کی آنکھیں بابا پر گئی ہیں۔ ان کی آنکھوں کا رنگ عجیب سا ہے، کبھی نیلا لگتا ہے تو کبھی سبز۔“
یونہی البم دیکھتے مغرب کی اذان ہونے لگی۔ خوش بخت نے ایک بار سوچا کہ اسے گھر جانے کو کہیں۔ پھر خاموش ہو گئیں۔ سب ہی مغرب کی نماز پڑھنے لگے۔ وہ کچھ شرمندہ سی ہو گئی۔

نماز کے بعد خوش بخت نے روٹی پکائی، یعنی اور نور نے دسترخوان بچھا کر رتن چن دیے۔ بابا اور ارمغان اکٹھے مسجد سے واپس آئے تھے۔ اسے وہیں موجود دیکھ کر ٹھٹھک سے گئے۔ بابا نے بے اختیار پوچھا تھا۔
”بھی تک گھر نہیں گئیں ارجحینا۔“

”یہ میرا گھر نہیں ہے بابا؟“
”وہ تو ٹھیک ہے، پھر بھی جلدی گھر چلی جایا کرو، ماں انتظار کرتی ہوگی۔ بیٹیوں کو یوں شام ڈھلے گھر سے باہر نہیں رہنا چاہیے۔“
”بابا! امی میرا کبھی انتظار نہیں کرتیں۔“ ارجح نے لاپرواہی سے کہا تو وہ کچھ کہنے کا ارادہ ملتوی کرتے

ہوئے دسترخوان پر بیٹھ گئے۔

خوش بخت نے مڑلاؤ بنایا تھا، دبی کا راستہ اور سلاڈ بابا کے لیے روٹی اور انڈوں کا سالن تھا۔ ٹی وی آن تھا۔ صحن میں ٹیوب لاسٹ چل رہی تھی۔ مگر جامن کے پتوں پر اندھیرا پھیلانے لگا تھا۔ پرندوں کے بچرے میں بالکل خاموشی تھی۔ ارمغان خاموشی سے نوالے لے رہا تھا۔ جبکہ سب ہی خوش گھپوں اور ہلکی پھلکی باتوں کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا بہت اچھا لگا۔ لیکن یہ سارا مزاج کر کر رہا تھا۔

اسے یوں سب کے ساتھ بیٹھ کر کھانا کھانا بہت اچھا لگا۔ لیکن یہ سارا مزاج کر کر رہا تھا۔

بعد بابا نے ارمغان سے کہا کہ وہ ارجح کو گھر چھوڑ آئے۔
”کون۔۔۔ میں۔۔۔؟“ ارمغان کا ”میں“ خاصا تعجب خیز تھا۔
”نہیں“ میں لے جاتی ہوں بایک پر۔“ یعنی سرگوشی کر کے ہنسنے لگی، ارمغان نے اسے بری طرح گھورا۔

”ہاں۔۔۔ تم۔۔۔ رات ہونے والی ہے۔“ وہ حتمی انداز میں کہہ کر اٹھ گئے اور صحن کے کونے میں لگے واش بیسن پر جا کر کلی کرنے لگے۔

”چلو۔“ ارمغان نے بنا اس کی طرف دیکھے روکھے سے لہجے میں کہا تھا۔ ارجح کا اٹھنے کو بالکل دل نہیں چاہ رہا تھا۔ مگر مجبوراً اٹھنا پڑا، ارمغان نے موٹر سائیکل باہر نکالی تو وہ سب کو خدا حافظ کہہ کر باہر نکل آئی۔
ارمغان نے بایک اشارت کی۔

”سنبھل کر بیٹھو۔۔۔“

ارمغان بوکھ کی منزل عبور کر کے وہاں کھڑا تھا۔ جہاں شدید غصے کی حد شروع ہوتی تھی۔
”دھیان سے چلا تا ارمغان! میں کبھی بایک پر نہیں بیٹھی۔“

ارمغان نے بانیک چلائی نہیں اڑائی تھی۔ وہ اس کی شرٹ دوپے چینی رہی کہ آہستہ چلاؤ مگر اس نے بس گھر کا پتا پوچھا تھا۔ اور گیٹ کے سامنے جب بانیک رکی تو ارتج کا رکا ہوا سانس بحال ہوا۔
 ”ارمغان! کون سی دشمنی نکال رہے ہو مجھ سے۔“ وہ خفگی سے گویا ہوئی۔
 ”چلتا ہوں اب۔“

”اندر تو آؤ ارمغان۔“ اس نے محبت سے اصرار کیا۔
 ”اس کی ضرورت نہیں۔“ وہ رکا ہی نہیں۔
 ”پتا نہیں، یہ مجھ سے اتنا خفا کیوں ہے؟“
 وہ یہی سوچتی ہوئی اندر آئی تو لان میں تیمور کو دیکھ کر اس کی طرف آگئی۔ تیمور شاید واپس جانے کے ارادے سے اٹھا تھا۔

”بائے تیمور۔“ اس کی نیلگوں آنکھوں میں کسی دیرینہ دوست کے ملنے کی خوشی جگمگائی تھی۔
 ”تم جاپان سے کب لوٹے تیمور؟“
 ”کل رات۔“ وہ مسکرا دیا۔ ”میں اب واپس جانے ہی والا تھا۔“

”تھینک گاڈ! اس وقت پر آگئی۔“ وہ اس کے سامنے کرسی پر بیٹھ گئی۔
 ”سب لوگ کیسے ہیں؟“
 ”ٹھیک ٹھاک۔“

”خود واپس چلا گیا؟“
 ”معلوم نہیں، تم کیا لوگے ٹھنڈا یا۔“
 ”میں، جس لے چکا ہوں۔“
 ”تمہارا کام ہو گیا؟“

”ہاں تقریباً۔“ تیمور نے مختصراً ”جواب دیا اور بغور اسے دیکھنے لگا۔
 ”ایسے کیا دیکھ رہے ہو۔“ وہ کچھ پزل سی ہو گئی۔
 ”ارتج۔“ وہ ذرا سا آگے جھکا۔ ”تم بہت خوش ہو۔“
 ارتج نے حیرت سے اسے دیکھا، پھر مسکرا دی۔
 ”تمہیں کیسے معلوم ہوا؟“

”یہ جو تمہارا چہرہ ہے نا کھلی کتاب کی طرح، ایسی کھلی کتاب جس کی تحریر ہر کوئی نہیں پڑھ سکتا، سوائے تیمور آفندی کے۔“

”اوہو۔ اتنا کافیڈنس ہے خود پر۔“
 ”نہیں ہونا چاہیے؟“

208

احساس کو جانچا۔

”کیا یہ خوشی کی بات نہیں؟“ اس نے جواباً پوچھا۔

”یقیناً ہے۔“ تیمور کا لہجہ نارمل سا تھا۔

”تمہیں حیرت نہیں ہوئی تیمور! کہ میں اک معمولی اسکول ماسٹر کی بیٹی ہوں۔“

”آئی ایم شکنڈ۔“ اس نے ایمانداری سے اعتراف کیا۔

”اس شاک کے بعد تم مجھ سے ملنا گوارا نہیں کرو گے، ہے نا؟“ ارتج نے کس سفاکی اور یقین کے

ساتھ سوال کیا تھا۔ حقیقتاً وہ شکنڈ پہلے نہیں اب ہوا تھا۔

”ارتج۔“ اس کے لہجے اور آنکھوں میں بے یقینی سی بے یقینی تھی۔

”کیونکہ تم جس طبقے سے تعلق رکھتے ہو، وہاں ملنے سے پہلے اسٹیٹس دیکھا جاتا ہے۔ آج اگر میں

رباب بنوایا جمشید کو یہ سب بتاتی تو وہ بھی یہی کرتے۔“

تیمور کا دل چاہا سامنے کھڑی لڑکی کا خوبصورت چہرہ تھپٹوں سے سرخ کر دے، اسے ان سارے لمحوں

کے رائیگاں جانے کا افسوس ہوا جو اس نے اس لڑکی کی جھولی میں ڈالے مگر لگتا تھا وہ جب اس سے الگ

ہوتی تھی تو اس لمحے کو وہیں کہیں بھول جاتی تھی۔

کسی سڑک کے کنارے

کسی درخت کی کھوہ میں

کسی رستوران کی میز پر

تیمور کو لگا وہ سارے لمحے سڑک کے کنارے پڑے خالی ڈسٹ بن میں ڈال آئی ہے، ورنہ کوئی ایک لمحہ

تو اس کا دامن پکڑتا، اسے یہ بات کہنے سے روکتا۔ ارتج نجائے کیا کہہ رہی تھی، تیمور دو قدم پیچھے ہٹا۔

(تو ہوا یہ ارتج عثمان! کہ تم بدگمان کی بدگمان ہی رہیں۔ شاید میری محبت میں کوئی کمی تھی۔ شاید تیمور

آفندی تمہیں محبت کرنا آیا ہی نہیں لیکن ارتج۔ زندگی میں کبھی ایسا لمحہ بھی آئے گا جو تمہیں تمہارے

الفاظ کی بد صورتی کا احساس دلائے گا، مجھے اسی لمحے کا انتظار رہے گا۔)

ارتج نے ایک صدم خاموش ہو کر دوڑ جاتے شخص کو دیکھا۔

”اور میں نے سوچا تھا کہ یہ شخص۔۔۔ یہ شخص تیمور آفندی سب سے مختلف ہوگا، حالانکہ میں جانتی

تھی یہ اسٹیٹس کمپلیکسز میں مبتلا دولت کے پجاری، محبت و خلوص اور وفا کو پرانی قدریں سمجھنے والے

جب بھی میرے بارے میں جانیں گے تو ان کا رد عمل یہی ہوگا۔ مگر بونہی اک گمان سا تھا کہ یہ شخص۔۔۔ مگر

تیمور آفندی! تم بھی ویسے نکلے۔ ارتج عثمان! تم جانتی تھیں کہ یہی ہوگا مگر پھر بھی یہ دل کے اندر خالی پن سا

کیوں بڑھنے لگا ہے۔ ایسا کیوں لگتا ہے کہ تمہارے وجود کا ایک حصہ گم ہو گیا ہے۔“

یوکلپٹس کے درختوں کے سائے میں کھڑی نجائے کب تک وہ یہی سوچتی رہی تھی۔ یہاں تک کہ

اندھیرے نے پوری کائنات کو نگل لیا۔



ہست سے دن آگے پیچھے کھسک گئے۔ تیمور پھر نہیں آیا۔ مئی نے اسے اس کے حال پر ہی چھوڑ دیا تھا۔ وہ بوکھلائی سی پھر رہی تھی۔ اسے اپنی کیفیت خود ہی سمجھ میں نہ آتی۔
”کیا یہ تیمور کی بے اعتنائی کی وجہ سے ہے۔“

وہ اکثر بے حد خاموشی سے سوچا کرتی۔

”لیکن ایسا کیوں ہوا؟ میں تو اس میں انٹرنسٹڈ نہ تھی پھر یہ دکھ کیسا؟“

ان ہی دنوں بہت اچھی خبر یہ ملی کہ آڈر کو جاب مل گئی تھی۔ یعنی نے اسی خوشی میں سب کو گلاب جامن بنا کر کھلائے۔ آڈر بھی مٹھائی لے کر آیا مگر ارتج کے آنے سے قبل وہ جا چکا تھا۔ جاب پر ایسویٹ تھی مگر کچھ نہ ہونے سے کچھ ہونا بہتر تھا۔ اس کی امی نے فوراً ”بڑی بیٹی کے لیے رشتہ ڈھونڈنا شروع کر دیا لیکن اس سارے ہنگامے میں وہ ایک دم چپ کر جاتی یا بات کرتے کرتے کہیں کھو جاتی۔

”کوئی پرالیم ہے ارتج۔؟“ ایک دن خوش بخت نے پوچھا تو وہ چپ سی ہو گئی مگر اسے لگا اسے کسی راز داں کی ضرورت ہے۔

”آپی! لوگ بدل کیوں جاتے ہیں؟“

”کون بدل گیا کرٹیا؟“ انہوں نے محبت سے پوچھا۔ اور وہ تیمور کا نام لیتے لیتے رک سی گئی۔

”کوئی نہیں۔“

”ارتج! تمہاری مئی نے تمہاری شادی کے بارے میں کیا سوچا ہے؟“ انہوں نے دال چھتے ہوئے

پوچھا۔

”مئی نے کیا سوچنا ہے؟ سوچنا تو مجھے ہے۔“ وہ ذرا سی ہنسی۔

”آپی بھول جاتی ہیں کہ تمہارا تعلق اپر کلاس سے ہے۔“ یعنی رائٹنگ ٹیبل پر بیٹھی نوٹس بنا رہی تھی۔ مسکرا کر کہنے لگی۔

”میرا تعلق تو تم لوگوں سے ہے۔“ ارتج سنجیدہ ہو گئی۔ ”اور ہماری کلاس میں کچھ نہیں رہا۔ نہ رشتوں میں خلوص نہ آنکھ میں مروت وہ لوگ ہاتھ ملانے سے پہلے اسٹینڈس دیکھتے ہیں۔ دولت کے پجاری اقتدار کے رسیا غرض کے بندے۔“

”یہ صرف اپر کلاس کا المیہ نہیں ہے ارتج! یہ تو عمومی رویہ بنتا جا رہا ہے۔ ہر کوئی اس کی لپیٹ میں آ رہا

ہے۔“

”لیکن تم لوگ بھی تو ہو۔ محبت کرنا اور برتا جانتے ہو۔ تم لوگوں کے پاس وقت ہے ایک دوسرے کی خوشیاں شیئر کرنے کا۔ میں تو ترس جایا کرتی تھی۔ کبھی مئی کے پاس بھی اتنا وقت ہو کہ میں ان کی گود میں سر رکھ کر لیٹ سکوں، کبھی انہیں بھی میری برتھ ڈے یاد ہو، کبھی وہ بھی میرے ساتھ بارش انجوائے کر سکیں۔“

”ہر کسی کا کیر کرنے کا اپنا انداز ہوتا ہے ارتج! محبت کرنے اور اس کے اظہار کے اپنے طریقے۔ اگر وہ اپنی مصروفیات کی بنا پر یہ سب نہیں کر سکتیں تو تم ان پر محبت نہ کرنے کا الزام نہیں دھر سکتیں۔“ خوش بخت نے رسائیت سے سمجھایا تھا۔

”محبت تو ہم سے روٹھ ہی گئی ہے۔“ اس کی آنکھیں ایک دم نم ہی ہو گئیں۔ ”ایسا نہ ہوتا تو عدنان ایک بار تو آنکھیں کھول کر دیکھتا مگر وہ جانتا تھا اب ماؤں کے سینے میں ممتا نہیں جاگتی۔ ہمارے ہاں لوگوں کو نشو و نما پیریا کر ڈیٹ کارڈ کی طرح یوز کیا جاتا ہے، استعمال کیا اور پھینک دیا۔“ اس کی نگاہوں میں شائستہ کا سجا ہوا وجود آگیا۔

”ہمارے ہاں محبت کا نام دیتے ہیں، محض وقت گزاری کے کھیل۔“ کسی نے اس کے گال کو دھیرے سے چھو کر کہا تھا۔
 ”متم کتنی خوبصورت ہوارتج! یوں لگتا ہے مجھے تم سے محبت ہو جائے گی۔“
 وہ اک جھرجھری لے کر رہ گئی بہت عرصے کے بعد اس پر وہی کیفیت طاری ہوئی تھی۔ وہی اضطراب، وہی خالی پن، بائیں ہاتھ سے دایاں بازو ہولے ہولے دباتے ہوئے وہ مسلسل بول رہی تھی۔ خوش بخت نے بے اختیار اس کا کندھا ہلایا۔

”ارتج! کیا ہو گیا۔“ وہ ایک دم ان کی گود میں سر رکھ کر رو دی۔
 ”آپ لوگ اچھے ہو آئی! ہمارے ہاں کسی کو کسی کی مجبوری سے کوئی سروکار نہیں۔ ہمارے ہاں کوئی کسی کا انتظار نہیں کرتا، سب چھوڑ جاتے ہیں۔ وہ بھی جو سب سے مختلف نظر آتے ہیں۔ تیمور بھی مجھے چھوڑ گیا خوش بخت آئی۔۔۔ وہ بھی مجھے چھوڑ گیا اور میں اسی دن سے ڈرتی تھی، تب ہی اس کی محبت کا جواب محبت سے نہ دے پائی۔ مگر میں نے یہ کبھی نہیں سوچا تھا جب وہ مجھے چھوڑ جائے گا تو میں زندہ کیسے رہوں گی۔ میں جو اس سے واقعی محبت کرنے لگی تھی۔“
 ہاتھ میں شرٹ پکڑے اندر آتا ار مغان جہاں تھا وہیں کھڑا رہ گیا۔ خوش بخت نے سر اٹھا کر ار مغان کے فٹ چہرے کو دیکھا اور سر جھکا کر ارتج کو خاموش کروانے لگیں۔



صورتحال بتا رہی تھی کہ ابھی ابھی کچھ خاص مہمانوں کو رخصت کیا گیا ہے۔ میز پر ابھی تک ادھ کھایا کیک بچے ہوئے سموے اور ہیشیز موجود تھے۔ یعنی برتن سمیٹ رہی تھی۔
 ”کیا کوئی خاص مہمان آئے تھے۔“ اس نے شوڈر بیگ کرسی پر رکھتے ہوئے پوچھا۔
 ”خاص تو نہیں۔ میری یونیورسٹی فیلو ہے ثویہ، اس کے امی۔ ابو۔۔۔“
 ”یعنی آپ کا رشتہ لے کر آئے تھے۔“ نور ٹپک پڑی۔

”اے۔۔۔ تمہاری کلاس فیلو کو پتا نہیں تھا کہ تم پہلے سے انگیج ہو۔“ ارتج نے حیرت سے دریافت کیا۔

”اب باقاعدہ انگیجمنٹ ہوتی تو میں اسے بتا بھی دیتی۔ بچپن میں خالہ اور امی کے درمیان بات ہوتی تھی۔“ وہ چیزیں اٹھا کر کچن میں چلی گئی۔
”مگر تمہارا اور آزر کا تعلق تو بہت مضبوط ہے۔“ وہ اس کے پیچھے چلی آئی اور دروازے میں کھڑے ہو کر پوچھنے لگی۔

”ظاہر ہے، وہ تو ہے۔۔۔“ یعنی بچے ہوئے ایک کے پس بنانے لگی۔
”تمہیں پتا تھا کہ یہ لوگ آئیں گے۔“

”پتا ہوتا تو ہیں منع کر دیتی۔“ اس نے پلیٹ میں ایک کا بڑا سا ٹکڑا رکھ کر اس کی طرف بڑھایا۔ ارتج نے پلیٹ تھام لی تو وہ لیٹرٹیک میں پچی ہوئی پیپی گلاس میں ڈالنے لگی۔
”سچ ارتج! اتنے امیر لوگ ہیں، اتنی بڑی گاڑی میں ڈھیر سارا پھل اور مٹھائی لے کر آئے تھے۔ یعنی آپ! میں تو کستی ہوں، چھوڑیں آزر بھائی کو، کچھ بھی نہیں ہے ان کے پاس، عیش ہو جائیں گے آپ کے، سنا ہے ان کی دو کنال پر کوٹھی ہے۔“ نور بے حد متاثر ہوئی تھی۔

”نور بی بی! آپ یہ ایک کھائیں۔“ وہ ایک کا ٹکڑا اس کے منہ میں ٹھونس کر ارتج کو ساتھ لے کر باہر نکل گئی۔ ارمغان ابھی ابھی آفس سے لوٹا تھا، بایک کھڑی کر کے واش بیسن پر ہاتھ منہ دھونے لگا۔
”یعنی! کھانا نکال دو میرے لیے۔“ اس نے ارتج کو یکسر نظر انداز کر کے یعنی سے کہا تھا۔
”ہیلو ارمغان۔۔۔“ ارتج بھی ایک ڈھیٹ تھی، اس کی تمام تر بے اعتنائی کے باوجود اس سے بات کرنا نہیں چھوڑتی تھی۔
”ہیلو۔۔۔“ اس کے لمبے میں رکھائی کی جگہ سنجیدگی آگئی تھی۔ تو لیے سے منہ صاف کرتا، بیٹھک میں چلا گیا۔

ارتج ہنسنے لگی۔
”تم دیکھنا، ایک دن یہ بھی مجھے اپنی بن تسلیم کر لے گا۔“
”پتا نہیں ہو کیا گیا ہے اس کو۔ پہلے تو ہر بات مجھ سے شیر کرتا تھا، اب پوچھو تو کہہ دیتا ہے،“ آفس کی پرابلم ہے۔“ یعنی قدرے تشویش سے کہہ رہی تھی۔
”مجھے تو لگتا ہے، اسی پھول والی کا چکر ہے۔“ ارتج نے خیال آرائی کی۔
”یہاں کچھ ہے تو بتائے بھی۔ جہاں شادی کا نام لو وہاں ہتھ سے اکھڑ جاتا ہے۔“ یعنی نے گلاس اس کے ہاتھ میں تھمایا۔
”میں کھانا دے دوں۔“

”ارتج اور نومی کہاں ہیں؟“

”نومی تو کھینے نکلا ہے۔ آپنی بیٹھک میں بابا کے پاس ہیں۔“ یعنی کہہ کر کچن میں چلی گئی، کچھ لمحوں کے بعد خوش بخت آگئیں۔

”ارتج آئی ہے۔“

”آپنی! بابا نے کیا کہا؟“ یعنی ان کے پیچھے ہی اندر آئی تھی۔

”رشتہ بہت اچھا ہے۔“

”آپنی۔“ وہ احتجاجاً چلائی۔

”بابا نے کیا کہنا ہے، یہی کہا ہے کہ یعنی سے پوچھ لو۔“

”مجھ سے کیا پوچھنا ہے انکار کروں بس۔“ آپنی! کہیں بابا یہ تو نہیں سمجھ رہے کہ یہ لوگ میری ایماء پر۔۔۔ اسے ایک دم خیال آیا تھا۔

”بھئی۔۔۔ وہ جو بھی سوچتے ہیں، تم اپنا فیصلہ دو۔“

”میں نے تو۔۔۔“ اس کا جملہ ارمغان کے آنے پر ادھورا رہ گیا۔ اس نے ایک نظر سب کو دیکھا پھر خوش بخت سے کہنے لگا۔

”آپنی! طارق بھائی آئے ہیں۔“

”طارق۔۔۔“ وہ ہڑبڑا کر کھڑی ہوئیں۔ ”کہاں ہیں؟“

”بابا کے پاس۔“

”تو میں کیا کروں۔“ وہ جھنجھلا کر واپس بیٹھیں۔ ارتج نے قدرے حیرت سے انہیں دیکھا۔

”اور اب وہ کیا لینے آئے ہیں؟“ یعنی کو غصہ آگیا۔

”بابا آپ کو بلا رہے ہیں۔“ ارمغان نے کہا۔ ”بات کر لیں ان سے۔“

”میں۔۔۔ میں کیا کروں گی ان سے باتیں کر کے۔“ انہوں نے بے بسی سے بھائی کو دیکھا۔ ارمغان نے

آگے بڑھ کر اپنا مضبوط بازو خوش بخت کے کندھے پر پھیلایا۔

”آپنی! بات کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے۔ لیکن ڈرنے یا گھبرانے کی ضرورت نہیں، آپ کا بھائی آپ کے ساتھ ہے۔“

خوش بخت کچھ لمحے سوچتی رہیں، پھر اثبات میں سر ہلا کر ارمغان کے ساتھ باہر نکل گئیں۔

”کوئلہ رنگ اور ساتھ میں کچھ بھجوا دو۔“ ارمغان نے دروازے سے پلٹ کر یعنی سے کہا تھا۔

”زہر نہ بھجوا دوں۔“ وہ چڑ کر بولی تھی۔

”یعنی۔“ ارتج نے حیرت سے اسے دیکھا۔ ”کیا ہوا؟“

”کچھ نہیں۔“ وہ اضطرابی انداز میں ہونٹ کاٹنے لگی۔

”آئی کا طارق بھائی کے ساتھ کوئی جھگڑا ہوا ہے۔“ ارتج نے پوچھا تو وہ ایک دم چمچ گئی۔
”کوئی جھگڑا۔“

”آئی۔ آئی۔ آپ نے دیکھا، میرے ابو آئے ہیں۔“ نوی خوشی سے جگمگا تا چہرہ لیے اندر آیا تھا۔
”دفع ہو یہاں سے ابو کا چیتا۔“

”یعنی! کیا ہو گیا ہے تمہیں؟“ ارتج چکر اگئی تھی۔

”دو سری شادی کر چکے ہیں موصوف گزشتہ ایک سال سے نوی اور آپی یہاں ہیں اور انہیں خیال نہیں آیا اور اب۔“

”یعنی۔“ ارتج لڑکھڑاسی گئی۔

یعنی اسے تفصیل بتانے لگی تھی۔ اس کا ذہن سائیں سائیں کرنے لگا۔ خوش بخت کا مطمئن اور مسکراتا چہرہ دیکھ کر لون جہاں تھا کہ وہ اس کرب سے گزر رہی ہیں۔ وہ بے دم سی ہو کر بیڈ پر بیٹھ گئی اور بے یقینی سے ساری تفصیل سننے لگی۔



سارا گھر خاموش ہو گیا تھا۔ ہر کوئی اپنی ہی سوچ میں گم، ارتج کو اپنا وجود ان سب کے درمیان اضافی سا لگتا، امرغان اور خوش بخت بابا کے ساتھ مل کر نجانے کن گتھیوں کو سلجھاتے رہتے تھے طارق اس دن کے بعد کئی بار آئے تھے۔ وہ خوش بخت کو ساتھ لے جانا چاہتے تھے۔ اپنی غلطی کا احساس بخوبی ہو گیا تھا انہیں۔ بعض مجبور یوں کی بنا پر وہ دوسری بیوی کو طلاق نہیں دے سکتے تھے۔ مگر خوش بخت کو علیحدہ گھر لے کر دینے کو تیار تھے۔ بابا نے فیصلہ خوش بخت پر چھوڑا تھا اور وہ کوئی فیصلہ بھی نہ کر پاتی تھیں۔
دوسرے عدیل کے گھر والے بار بار چکر لگا رہے تھے۔ ان کے بیٹے نے یعنی کو یونیورسٹی میں دیکھا تھا۔
اور اب وہ اسی سے شادی کرنا چاہتا تھا۔

”تم اگر اس سے شادی نہیں کرنا چاہتیں تو صاف انکار کرو۔“

ارتج جھنجلا گئی۔

”کیا ہے، تمہارا کیا خیال ہے، میں خاموش بیٹھی ہوں۔“ وہ اس سے زیادہ جھنجلائی تھی۔ آج کل اس کا

مزاج یونہی بیڑا ہوا تھا۔

نجانے کیوں ارتج کو لگا، وہ اپنے مسئلے اس سے بالا ہی بالا طے کرنا چاہتے ہیں، حالانکہ کسی نے کچھ نہ کہا تھا۔ مگر ارتج کے آنے پر وہ سب ایک دم خاموش ہو جاتے تھے۔
”میں چاہوں بھی تو ان میں پوری طرح شامل نہیں ہو سکتی۔“

وہ برگشتہ ہو گئی، اور چاہنے کے باوجود اگلے دو دن تک وہاں نہ گئی۔



دو دن اس نے یونہی گزارے تھے، یا پھر اپنے کمرے میں گھس کر کتابیں دیکھتی یا کتاب جاتی تو گاڑی لے کر سڑکیں ٹاپنے لگتی۔ اس وقت بھی وہ بدلی سے۔ ”شہر و فامیں دھوپ۔“ کی ورق گردانی کر رہی تھی، جب ملازمہ نے آکر پیغام دیا۔

”آپ کو بیگم صاحبہ بلا رہی ہیں۔“

”کہاں ہیں؟“

”اپنے کمرے میں۔“

اس نے کتاب بند کر کے ریک میں رکھی اور اٹھ کر می کے کمرے میں آ گئی۔ وہ حسب معمول کسی فائل کے مطالعے میں منہمک تھیں۔ جب سے عامر فارینہ کے ساتھ اس کی فرمائش پر سوئٹز رلینڈ گیا تھا سارا بوجھ می پر تھا۔ می نے اسے دیکھ کر فائل بند کر دی۔ ”آؤ بیٹھو۔“ می کے سنجیدگی سے کہنے پر وہ ان کے بیڈ پر بیٹھ گئی۔

”تم دو دن سے وہاں گئیں نہیں۔“

”جی۔“ سے می کی باخبری پر حیرت ہوئی۔

”کیوں؟“ انہوں نے اگلا سوال کیا۔

”یونہی۔“

”اچھی بات ہے، میں چاہتی بھی نہیں کہ تم وہاں جاؤ۔“ می نے پہلی بار اتنے واضح انداز میں اپنی ناپسندیدگی کا اظہار کیا تھا۔

”میں وہاں نہیں گئی۔ اس کا یہ مطلب ہرگز نہیں کہ میں جاؤں گی بھی نہیں۔“ وہ قدرے بدتمیزی سے گویا ہوئی۔ می نے اس کی بات کو یکسر نظر انداز کیا۔

”میں نے تمہیں اس لیے بلایا ہے کہ تیمور نے تمہارے لیے باقاعدہ پروزل بھجوایا ہے۔“

”واٹ۔“ وہ اچھل ہی تو پڑی۔ ”یہ کیا کہہ رہی ہیں آپ؟“

”اس کی می کا کل امریکہ سے فون آیا تھا، اگلے ہفتے وہ لوگ واپس پاکستان شفٹ ہو رہے ہیں۔ اور وہ چاہتے ہیں، اسی وقت ملگنی بھی ہو جائے۔ یوں بھی تیمور کا گھر مکمل ہو گیا ہے اور وہ وہاں شفٹ بھی کر گیا ہے۔“

”آئی کانٹ لمیٹوس۔“ وہ زیر لب ہنسنے لگی۔ پھر می سے پوچھنے لگی۔

”کیا انہوں نے تیمور سے پوچھا ہے؟“

”کیا وہ تیمور کی مرضی کے بغیر کوئی فیصلہ کر سکتی ہیں۔“ انہوں نے الٹا سوال کیا۔ وہ بس الجھ کر انہیں

دیکھنے لگی۔

”میں نے انہیں ہاں کر دی ہے؟“ ممی نے اطمینان سے بتایا تو وہ متحیر سی انہیں دیکھنے لگی۔
”تمہاری پرابلیم یہ ہے کہ ارتج کہ تم نے اعتبار کرنا نہیں سیکھا۔ ورنہ تیمور ایسا لڑکا نہیں کہ جس کے لیے اتنا سوچنا پڑے۔“

”وہ کیسا ہے؟“ میں جانتی ہوں۔ لیکن آپ میری زندگی کے بارے میں اس طرح فیصلہ نہیں کر سکتیں۔“
ابھی کچھ دن پہلے اسی تیمور کے لیے وہ خوش بخت کی گود میں سر رکھ کر روئی تھی۔
”تمہاری شادی تیمور سے ہی ہوگی۔“

”میری شادی کس سے ہوگی؟“ یہ فیصلہ مجھے کرنا ہے۔“ وہ تیز لہجے میں گویا ہوئی، ممی نے بشکل اپنا غصہ ضبط کیا۔

”ٹھیک ہے، میں تین دن کے لیے اسلام آباد جا رہی ہوں۔ واپس آؤں تو فیصلہ بنا دوں گا۔ لیکن ایک بات یاد رکھنا، فیصلہ تیمور کے حق میں ہونا چاہیے۔“ ان کا لہجہ بے چلک تھا۔ وہ کچھ لمحے لب کاٹتی رہی، پھر سر اٹھا کر کہنے لگی۔

”ٹھیک ہے، میں بابا سے مشورہ کر کے۔“
”بابا۔۔۔“ ممی نے تندو تیز لہجے میں اس کی بات کاٹی۔ ”وہ کون ہوتا ہے تمہیں مشورہ دینے والا۔ تمہیں کچھ ڈسکس کرنا ہے تو مجھ سے کرو۔“
”مما ابھی آزمائی فادر۔“ وہ احتجاجاً چلائی۔
”ہرگز نہیں، نہ وہ تمہارا باپ ہے اور نہ وہ لڑکیاں تمہاری بہنیں۔ کوئی رشتہ نہیں تمہارا اس گھر کے ساتھ۔“ ممی گویا ضبط کھو بیٹھی تھیں۔

”آپ جھوٹ بول رہی ہیں۔“ وہ بلند آواز میں چیخی۔
”جھوٹ میں نہیں، جھوٹ ان لوگوں نے بولا ہے، تمہارے ساتھ، تمہارا اصلی باپ مرچکا ہے۔“
انہوں نے گویا بم پھوڑا تھا۔
وہ ششدر سی رہ گئی۔
”نہیں۔۔۔ ممی یہ جھوٹ ہے۔“

”یہی سچ ہے۔ صلاح الدین مرچکا ہے۔“ ممی کا لہجہ پست ہوا۔ ”یہ ٹھیک ہے کہ وہ پہلے اسی گھر میں رہتا تھا۔ لیکن اب وہ گھر اس کے دوست ماسٹر شجاع کے پاس ہے، جس کو تم اپنا باپ سمجھتی رہی ہو وہ تمہارے باپ کا دوست ہے۔ انہوں نے تم سے جھوٹ بولا تھا۔ میں گئی تھی وہاں ان سے ملی بھی تھی۔ اچھے لوگ ہیں۔ تم بہت خوش تھیں، میں خاموش ہو گئی، مگر کب تک ایک نہ ایک دن تمہیں اس حقیقت کا سامنا کرنا ہی تھا اس لیے۔“

وہ لڑکھڑاتے قدموں سے باہر نکل گئی۔ گویا ہفت آسمان گھوم رہے تھے۔
وہ جنہیں اس نے اپنا سمجھا اس کے نہیں تھے۔
اپنے بیڈ پر گر کر وہ چیخ چیخ کر روئی تھی۔
”گیا اس کی قسمت میں یہی لکھا تھا کہ وہ جس کو اپنا سمجھے، وہی اس کا نہ رہے۔“



بہت گھنا جنگل، مہیب تاریکی، کھل کر رستا آسمان اور کڑکتی، بجلیاں۔
وہ رستے کی تلاش میں لمبی گھاس میں ادھر ادھر چکرارہی تھی۔ مگر وہ لمبی گھاس بار بار اس کے قدموں
سے لپٹ کر رستہ روک لیتی تھی۔

”کوئی ہے۔۔۔ کوئی ہے۔۔۔“ وہ بند لیوں سے چیخ رہی تھی، ہاتھ پھیلا پھیلا کر کوئی سارا اتلاشتی تھی۔ بادل
بہت زور سے گر رہے اور وہ بے دم ہو کر گھٹنوں کے بل گر گئی اور اونچا اونچا رونے لگی۔

تب ہی بہت دور سے اسے واٹلن کی آواز سنائی دی۔ وہ دیوانہ وار اس کے تعاقب میں دوڑ رہی تھی اور
لمبی گھاس، نوکلی شاخیں، گھنی تاریکی، کانٹوں کا سفر جب اسے لگا کہ بس اس کا سانس اکھڑ جائے گا، وہی
فرائیسی طرز کے درپچوں والا گھراس کے سامنے آگیا۔ تیز بارش کے ساتھ وہ سفید پھول اس پر برسے
لگے۔

ماربل کی سیڑھیاں اس کے سامنے تھیں۔ اسے لگا، وہ یہ سیڑھیاں کبھی عبور نہ کیا ئے گی۔ مگر اوپر سے
اٹھتی مانوس سی دھن نے اسے اپنی طرف کھینچ لیا۔ مگر تیسری سیڑھی پر ہی وہ ساری سیڑھیاں یکنخت غائب
ہو گئیں۔ اس سے قبل کہ وہ پشت کے بل نیچے گرتی، کسی نے اسے سنبھال لیا تھا۔
”سنبھل کر۔۔۔“ وہ سرگوشی۔

دوسرے بل اس کی آنکھ کھل گئی۔ اس کا پورا وجود پسینے پسینے ہو رہا تھا، اسے لگا وہ واقعی کسی جنگل سے
بھاگتی آتی ہے اور لمبی گھاس اس کے قدموں سے اب بھی لپٹی ہے۔ اس نے گھبرا کر پاؤں کھینچ لیے۔
”آج بی بی! کھانا کھالیں۔“ ملازمہ اسے پکار رہی تھی۔ اسے اپنی آنکھ کھل جانے کا سبب معلوم ہوا تو
ملازمہ پر ہی الٹ پڑی۔

”کیا تکلیف ہے؟“

”وہ بی بی! میں تو۔۔۔“

”گھٹلا سٹس۔“ ملازمہ نے غائب ہونے میں زیادہ دیر نہیں کی۔

ارنلج سائیڈ ٹیبل سے گلاس اٹھا کر غضاغت پانی چڑھا گئی۔ پھر اٹھ کر گلاس ڈور کھولا۔ مہما کو اسلام آباد
گئے آج دو سرائون تھا اور تب سے اب تک وہ اسی کمرے میں بند تھی۔ اور اس ڈیڑھ دو دن میں وہ اتنا سوچ
چکی تھی کہ مزید کچھ بھی سوچنے کی قابل نہ رہی تھی۔

لیکن ایک چیز کی وہ قائل ہو گئی تھی۔
 ان کی محبت اور فراخ دلی کی۔
 ورنہ کون اک اجنبی لڑکی کو یوں اپنے درمیان جگہ دے کر محبتوں سے نوازتا ہے۔ اسے خوش بخت میں
 ماں کی ممتا محسوس ہوئی تھی۔
 یعنی کی دوستی، بابا کی شفقت، نور کی شوخیاں۔
 ”میں نے کہا تھا متوسط طبقے کے لوگ محبت کرنا جانتے ہیں۔“
 نجانے کیوں اب وہ دکھ کی کیفیت محسوس نہ ہو رہی تھی۔
 شاید اس نے حقیقت کو قبول کر لیا تھا۔
 شاید حقیقت قبول کرنا ہی اس کی مجبوری تھی۔
 لیکن اب اس کے دل میں ان لوگوں کی محبت اور قدر کچھ اور بڑھ گئی تھی۔
 اب اس کی سمجھ میں آیا تھا، ارمغان اس سے اتنا دور کیوں بھاگتا تھا۔
 اسے ارمغان کی بے اعتنائی، رکھائی اور پھر سنجیدگی یاد آنے لگی۔
 اسے لگا۔ وہ اب یہ سوال حل کر سکتی ہے۔ وہ ہر روز پھول خرید کر وہیں کیوں چھوڑ آتا تھا۔
 اس کے وہاں آنے پر خاموشیاں کیوں ارمغان کے ہونٹوں پر ڈیرہ ڈال گئی تھیں۔ شادی کے نام سے
 کیوں بھاگنے لگا تھا۔
 اس کے چہرے کے وہ تاثرات، اس کی آنکھوں کی کیفیت اس پر اپنے بھید کھولنے لگی۔
 کیا اس کے ساتھ ایسا ہونا چاہیے تھا؟
 اک ہلکے سے دکھ کا سایہ اس کے دل کو گھیرنے لگا۔



آسمان پر تیزی سے اکٹھی ہوتی کالی بدلیوں نے شام کو کچھ اور گہرا کر دیا تھا۔ وہی آم والا، وہی دوڑتے
 بھاگتے بچے۔ بیشک کا کھلا دروازہ اس میں سے ابھرتے اداس کہتے۔

ساون بھاووں ساٹھ ہی دن ہیں
 پھر وہ رت کی بات کہاں

وہ گلی میں مڑ گئی۔ وہ نیم کا درخت اور نیچے رکھی لوہے کی کرسی کبھی وہ آتی تو ارمغان یہاں بیٹھ کر کتاب
 پڑھا کرتا تھا۔ لیکن پہلے دن کی طرح آج بھی یہ کرسی خالی تھی۔ وہ کھلے دروازے سے اندر چلی آئی۔ بیشک
 کا دروازہ بند تھا۔ برآمدے اور صحن کی لائٹ جل رہی تھی۔ برآمدے میں ٹی وی چل رہا تھا اور پاس ہی
 کرسی پر آنکھیں موندے ارمغان غزل سن رہا تھا۔

عجب رت مہکی ہے اب کے برس
چاند روشن ستارے مدھم ہیں

وہ آہستگی سے چلتی ہوئی برآمدے میں آگئی۔ اور اس کے سامنے والی کرسی پر بیٹھ گئی۔
اک دیا سا جلا تھا بتے پانیوں میں۔
تب سے اب تک بھنور مدھم ہیں۔
”ارمغان!“ اس نے آہستگی سے پکارا۔
اس نے چونک کر آنکھیں کھولیں۔
”تم۔“

”ہم نے تیرے وصل کے سب خواب بن لیے۔“ ارمغان نے ریموٹ کنٹرول اٹھا کر ٹی وی آف کر دیا۔

”بہت دنوں کے بعد آئیں ارجن۔“ اس کا لجم مدھم مگر ہر قسم کے تاثر سے عاری تھا۔
”چار دن ہی تو ہوئے ہیں۔“
”ہاں۔۔۔“ وہ قصداً ”مسکرایا۔“
”سب لوگ کہاں ہیں؟“

”بابا مسجد میں گئے ہیں بھینی اور نور پکن میں ہوں گی۔“

”ارمغان! تم لوگوں نے مجھے بتایا کیوں نہیں؟“ اس نے گویا ارمغان کی بات ہی نہ سنی، بس سوال کیا تھا۔

ارمغان نے سر اٹھا کر اسے دیکھا۔ پھر آہستگی سے گویا ہوا۔
”بابا کہتے تھے اگر میں اس دن انکار کر دیتا کہ وہ ماسٹر صلاح الدین نہیں تو یہ لڑکی خودکشی کر لیتی۔“
”ہاں، یہ ان کا مجھ پر احسان ہے۔“

”احسان۔۔۔ وہ تمہیں اب بھی اپنی بیٹی سمجھتے ہیں۔“
”اور تم۔۔۔؟“ ارجن نے براہ راست اس کی آنکھوں میں جھانکا، وہ کچھ لمحے ٹھک کر اسے دیکھتا رہا۔
اسے لگا اس کی پوسٹ کی ہوئی شام آج ارجن کو ملی ہے۔ اسے افسوس سا ہوا۔
کاش آج بھی ایسا نہ ہوتا۔

اس نے اس لڑکی کو واقعی چاہا تھا۔ مگر بابا نے اس سے کہا تھا۔
”تمہارا اس لڑکی سے کوئی رشتہ نہیں۔ مگر تمہاری اس کی سمت اٹھنے والی نگاہ وہی ہونی چاہیے جو بھینی اور نور کی طرف اٹھتی ہے۔“
ضبط کی کن کڑی منزلوں سے گزرا تھا وہ۔

پل چلنے اور مرنے کی کرب آمیز کیفیت ماں جیسی بہن سے پوشیدہ نہ رہ سکی۔ خوش بخت نے اس سے پوچھا۔

”ارمغان! وہ لڑکی جس کے لیے تم پھول خرید کرتے تھے ارتج ہے نا۔“
اس کا دل چاہا، وہ ان کی گود میں سر رکھ کر اپنا سارا دکھ کہہ دے مگر مرد تھانا، خاموشی سے انہیں دیکھ کر رہ گیا۔

پھر دکھ اور کرب کی اس کیفیت پر غصہ غالب آنے لگا۔
وہ اس کے سامنے آتی تو اس کا دل چاہتا اسے جھنجھوڑ جھنجھوڑ کر دل کی ہر کیفیت اس پر آشکار کر دے۔ مگر خوش بخت نے کہا۔

”وہ پہلے ہی رشتوں سے بدگمان ہے ارمغان! اور جو رشتہ وہ تم سے باندھ بیٹھی ہے اس کے بعد اگر تم نے اس سے کچھ کہا تو وہ بالکل ہی بے اعتبار ہو جائے گی۔ ٹوٹ جائے گی۔“

وہ شاید خوش بخت کی بات کبھی نہ مانتا۔ اگر ارتج کے لبوں پر تیمور کا نام نہ سن لیتا۔ تب اسے احساس ہوا کہ وہ تو پانی پر گھر بنانے کی کوشش کر رہا تھا۔ نادان چاند چھونے کی تمنا کر رہا تھا۔

”ارمغان! نبھانے وہ کہاں گم ہو گیا تھا۔ ارتج نے پکارا تو چونک گیا، پھر طویل سانس لے کر پوچھنے لگا۔
”تیمور کیسا ہے؟“

”تیمور۔“ ارتج کی آنکھوں میں تحیر اُٹھ آئی۔ ”تم اسے کیسے جانتے ہو؟“ وہ مبہم سا مسکرایا۔
”میں نے اس کا نام تمہارے لبوں سے سنا تھا۔ اور مجھے لگتا ہے ارتج! تم اس سے اور وہ تم سے بے حد محبت کرتا ہے۔ محبتوں میں بدگمانی نہیں ہونی چاہیے۔ محبت کی ہے تو اعتبار بھی کرنا سیکھو۔ اگر وہ خفا ہے تو منالو کہ محبت ہمیشہ اسی مان کے ساتھ روکتی ہے کہ اسے منالیا جائے گا۔“

”ارمغان تم۔“ وہ اس سے آگے کچھ بھی نہ کہہ پائی۔ ارمغان نے خاموش ہو کر کئی وی آن کر دیا۔
”بابا نے کہا تھا۔ وہ ہمارے پاس امانت ہے۔ میں نے اس کی ماں سے وعدہ کیا ہے کہ اس کی امانت ویسے ہی واپس لوٹا دوں گا۔“ اور وہ امانت دار باپ کا دیانت دار بیٹا تھا۔

ارتج کھڑی ہو گئی۔

یعنی کچن میں تھی، کسی کارڈ کے ٹکڑے ٹکڑے کر کے جلاتی ہوئی۔ ارتج نے جھپٹ کر اس کے ہاتھ سے باقی کارڈ چھین لیے۔

”یہ کیا کر رہی ہو یعنی۔؟“ یعنی خاموش کھڑی رہی۔

”آؤر کے سارے کارڈ کیوں جلا رہی ہو۔“

”کیونکہ میں نے۔“ وہ ایک لمحے کو خاموش ہوئی، پھر سنبھل کر بولی۔

”میں نے وانیال سے شادی کا فیصلہ کر لیا ہے۔“

”واٹ؟ آریو میڈ۔“ ارتج چیخ اٹھی۔ ”تم اس سے محبت کرتی تھیں یعنی۔“

”خالی بیٹ تو محبت بھی اچھی نہیں لگتی ارتج۔“

”نان سنسن۔۔۔ یہ سب تمہیں پہلے بھی معلوم تھا یعنی۔“ وہ بگڑ کر بولی۔

”مجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ میرے لیے وانیال کا پُرپوزل آجائے گا۔“ یعنی نے اطمینان سے کہا اور اس کے ہاتھ سے کارڈز لے لیے۔

”یعنی تم۔“ وہ شدید سی کھڑی رہ گئی۔

”ارتج! میں نے بہت سوچ سمجھ کر فیصلہ کیا ہے، میں اپنی آدھی زندگی انتظار میں نہیں گزار سکتی۔ اس کے بعد بھی کیا گارنٹی ہے کہ وہ مجھے ایک اچھی زندگی دے پائے گا۔ وانیال کے پاس پہلے سے سب کچھ موجود ہے۔ مجھے معمولی معمولی چیزوں کے لیے ترسنا تو نہیں پڑے گا۔ محبت و محبت سب فضول باتیں ہیں۔“ وہ کس قدر سفاکی سے کہہ رہی تھی۔

ارتج ہل بھی نہ سکی۔ اسے لگا سا منے کھڑی لڑکی یعنی نہیں رباب ہے۔ وہ خاموش کھڑی اپنے سامنے کسی کے جلتے خواب دیکھتی رہی۔

”طارق بھائی نے بھی آپنی سے محبت کی تھی اور آپنی نے انہیں دیوتا سمجھ کر پوجا تھا، کیا صلہ ملا ان کی محبت کا۔“

”آپنی کہاں ہیں؟“ اس نے پست آواز میں پوچھا۔

”چلی گئیں۔“

”کہاں؟“

”اپنے شوہر کے گھر، طارق بھائی نے انہیں الگ گھر لے دیا ہے۔ مجبوری تھی، اپنے بیٹے کی خاطر جانا تو تھا ہی۔“ وہ سپاٹ سے لمحے میں کہہ رہی تھی۔ ”نان ٹوٹ جائیں تو کیا محبت، کیا نفرت، بس سمجھو رہ جاتا ہے اور انہوں نے بھی اولاد کی خاطر سمجھو کر لیا ہے۔“

وہ اس گھر سے نکلی تو قدم لڑکھڑا رہے تھے۔ یہ چند لمحے اس کی سوچ کو نئی سمت لے گئے۔

”نانک۔۔۔ میں تمہیں چھوڑ آؤں۔“ بادل برسی پڑے تھے۔ ار مغان اس کے قریب آکر کہہ رہا تھا۔

”نہیں۔۔۔ میں گاڑی میں آئی تھی۔“

وہ اسے گاڑی تک چھوڑنے آیا تھا اور اس برستی بارش میں وہ نجانے کہاں کہاں بھٹکی تھی۔ اور کہاں

جا کر اس کے پاؤں بریک پر ٹھہرے تھے۔

ہال۔۔۔ وہ تائبندہ اور ظہیر تھے۔

اور ان کی گود میں دو سال کا بچہ۔

ابھی چند ہفتے قبل وہ ان سے ملی تھی تو تائبندہ نے کہا تھا۔

”دیکھیں ہم دونوں میں سے کس کی محبت جیتی ہے۔“
خوش و خرم ہنستے مسکراتے وہ دونوں اک مکمل فیملی۔

گاڑی زن کر کے پاس سے گزر گئی تھی۔

اور آج اس کی سمجھ میں تیور کی بات آئی تھی۔ اس نے کہا تھا۔

”محبت کسی طبقے کی میراث نہیں ارتج عثمان! محبت کرنے کے لیے ایک خالص سچا اور کھرا دل چاہیے
ہوتا ہے جو کسی کے پاس بھی ہو سکتا ہے۔“

”ہر کسی کا کیئر کرنے کا اپنا انداز ہوتا ہے۔ محبت کرنے اور اس کے اظہار کے اپنے طریقے اگر کوئی اپنی
مصروفیات کی بنا پر یہ سب نہیں کر سکتا تو تم اس پر محبت نہ کرنے کا الزام نہیں دھر سکتیں۔“

اسے می یاد آگئیں۔ اپنی سگی اولاد سے اس کی خاطر جھگڑتی ہوئی۔

اس نے گاڑی اشارٹ کی اسے لگاؤہ گھنے جنگل میں اپنے لیے رستہ بنا رہی ہے۔

”محبت ہمیشہ اس مان کے ساتھ روٹھتی ہے کہ اسے منایا جائے گا۔“

تیور کو خفا اسی نے کیا ہے۔

گاڑی اس کے نئے گھر کے سامنے جا رہی۔

گھٹ کھلا تھا۔

وہ بھاگتی ہوئی اندر چلی آئی۔

بارش نے پل بھر میں اسے پورے کا پورا بھگو ڈالا تھا۔

اپنی آنکھوں سے پانی صاف کرتے ہوئے اس نے بمشکل نگاہ اٹھائی تو ساکت رہ گئی، جہاں تھی وہیں
ٹھنک گئی۔

فرانسیسی طرز کا خوبصورت دریچہ اس کے سامنے تھا۔ اس سے لپٹی سبز نیل فراخ دلی سے اپنے سفید
پھول اس پر برسانے لگی۔

اور بارش کی جلت رنگ میں اٹھتی وانلن کی دھن۔

وہی دھن۔۔۔ جو کئی برسوں سے اسے اپنی طرف بلا رہی تھی۔

اس دھن میں اک عجیب سا اسرار تھا۔

اک نامعلوم سادہ۔

اک ہلکی سی جھپٹ۔

اک تڑپ اک پکار۔

”کون ہے؟“ اس کا دل بار بار پکار رہا تھا۔

تب ہی وانلن کے سر خاموش ہو گئے۔

وہ کچھ لمحے غنطہ رہی۔ پھر بے چین ہو گئی۔
ماربل کی سفید سیڑھیاں اس کے سامنے تھیں۔
ایک پل کو گرنے کا خوف دامن گھیر ہوا۔

دوسرے پل اسے لگا، اگر وہ یہ سیڑھیاں عبور کر گئی تو سب ٹھیک ہو جائے گا۔ بے چینی خدا سے بڑھی تو وہ دیوانہ وار ان کی طرف بھاگی۔

”ارتجکے۔“ کسی نے اچانک اسے پکارا۔ اس نے تیزی سے پلٹنا چاہا کہ پاؤں رپٹ گیا۔ اس کے منہ سے چیخ نکل گئی۔ مگر وہ مضبوط بازوؤں نے اسے سمولت سے سنبھال لیا۔ وہ تڑپ کر پلٹی، پھر ساکت رہ گئی۔

”سنبھل کر، چوٹ تو نہیں آئی۔“ وہ نرمی سے پوچھ رہا تھا۔
”تم نے گرنے ہی کہاں دیا۔“ وہ بے اختیار بولی۔

”مجھے معلوم تھا، تم آؤ گی۔“ اس کے لمبے میں اپنی محبت کا یقین بولتا تھا۔
”تیور میں!“

”ہش۔“ تیور نے کچھ کہنے ہی نہ دیا۔ پھر سہارا دے کر کھڑا کرتے ہوئے بولا۔
”آؤ اور چلیں۔“

”تیور! وہ دھن۔“

”تمہارے لیے کمپوز کی ہے۔“

بارش ہوا کی تال پر دیوانہ وار رقص کر رہی تھی۔

سبز نیل، سفید پھول برسا رہی تھی۔

تیور کا ہاتھ تھام کر سیڑھیاں چڑھتے ہوئے وہ مسکرا دی۔ وہ تیور کو یہ نہ بتا سکی کہ اس نے یہ دھن آج تخلیق نہیں کی۔

